حدیث کے اصلاحی مضامین

افادات

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم
صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

ناشر

ادارۃ الصدیق ڈابھیل گجرات
شعبۂ فیض محمود سورت

www.attablig.com

فہرست صدق

نمبر	عنوانات	صفحات

فہرست مراقبہ ۱

فہرست مراقبہ ۲

فہرست مراقبہ ۳

فہرست مراقبہ ۴

فہرست تقویٰ ۱

فہرست تقویٰ ۲

فہرست یقین وتوکل ۱

فہرست یقین وتوکل ۲

فہرست یقین وتوکل ۳

فہرست یقین وتوکل ۴

فہرست الاستقامة

فہرست المبادرۃ الیٰ الخیرات ۲

فہرست المبادرۃ الیٰ الخیرات ۳

فہرست المبادرة الیٰ الخیرات ۴

فہرست المجاھدة ۱

فہرست المجاهدة ۲

فہرست المجاهدة ۳

فہرست المجاہدۃ ۴

افتتاحیہ

حامداً ومصلیاً ومسلماً:-

ہمارے قارئین بخوبی جانتے ہیں کہ آج سے تقریباً ۱۱رسال قبل حضرتِ اقدس جامع الشریعت والطریقت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے کچھ ہی دنوں بعد حضرت کے سلسلے کو رواں دواں، زندہ تابندہ اور درخشندہ رکھنے کی غرض سے حضرت کے متوسلین کی درخواست والتماس پر ہمارے حضرت الاستاذ مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری ﴿عافاهُ اللّٰه وحفظهٗ ووفقنا للاستفاضة منه﴾ نے عنایت فرما کر حضرتِ اقدس صدیقِ عہد، سید قاری صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ سے استصواب اور آپ کے ایماء سے سورت میں ہفتہ واری درسِ حدیث کے لئے آمادگی ظاہر فرمائی۔﴿جزاه اللّٰه خيراً وبارك فيه﴾

ہر شب یکشنبہ کو مسجد ابرار میں اور بعد میں مسجد انوار میں بوقت مغرب تشریف لا کر بعد نماز مغرب ذکر جہری کی محفل جاری فرمائی اور بعد نماز عشاء درس ریاض الصالحین ۔عربی زبان کے مضمونِ احادیث کو انتہائی سادہ اور عام فہم زبان میں سامعین کے سامنے پیش فرما کر طالبین کے لئے راہِ عمل آسان فرماتے ہیں۔

مادیت سے آلود اس دور پرفتن میں حضرت اقدس دامت برکاتہم کی یہ قربانی ہم نالائق خدام کے لئے قابل قدر ہے، اپنی راحت اور آرام اوراوقاتِ عزیز کی یہ قربانی ہم سے اپنی قیمت مانگتی ہے؛اور وہ ہے عمل ۔ہمیں احتساب کرنا چاہیے کہ گیارہ سالہ اس دور میں ہم نے اپنے اندر کیا اچھی تبدیلیاں کیں، ہم نے اپنی کیا اصلاح کی۔ اگر ہمیں اپنے اندر کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور مزید ترقی کرنی چاہیے، اپنے حالات سے اپنے شیخ ومرشد کو باضابطہ تحریری

طور پر مطلع کرنا چاہیے۔اور اگر ہمیں اپنے اندر کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا، جیسے تھے ویسے ہی ہیں، تو پھر یہ فکر کا موضوع ہے، ہمیں دن بہ دن بلکہ لمحہ بہ لمحہ اپنی باطنی حالت میں اصلاح وترقی حاصل کرنی چاہیے، اوراس کیلئے اپنے مرشدِ مکرم سے مؤدبانہ استفادہ کرکے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے، اس بات کا ہمیں ہروقت خیال رکھنا چاہیے کہ ہماری یہ نقل وحرکت محض رسم اور خانہ پری بن کر نہ رہ جائے۔حالاتِ باطنہ بھی حالاتِ ظاہرہ کی طرح موقع بہ موقع بگڑتے جارہے ہیں، ایسے میں اگر مسلمان کو کسی مرشدِ کامل کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو اس کے بھکنے اور بگڑنے کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔صحبتِ صالحین ہی آج کے پُرفتن دور کے زہر کا تریاق ہے۔ ﴿وفقنا اللّٰہ﴾

حضرت اقدس دامت برکاتہم نے ریاض الصالحین از امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب فرمایا، کیونکہ صاحبِ کتاب نے اس کتاب کی ترتیب کے وقت بطورِ خاص یہ بات مدنظر رکھی تھی کہ اسے علیٰ ترتیب اصلاح باطن مرتب کیا جائے، کہ پڑھنے والا پڑھتا جائے، عمل کرتا جائے، اوردن بہ دن اپنی حالت درست کرتا جائے۔یہ کتاب درحقیقت سالک وطالب کے لئے ایک پورا مرتب عملی پروگرام ہے۔

اللہ رب العزت کی توفیق سے یہ درس آج بھی جاری وساری ہے اوران دروس کو اولاً **"حدیث کے اسباق"** اور بعد میں **"حدیث کے اصلاحی مضامین"** کے نام سے شائع کیا جارہا ہے، اور سالکین کی طرف سے توقع سے بڑھ کر اس کی قدردانی ہورہی ہے۔اولاً اقساط واجزاء کی شکل میں دس قسطیں منظر عام پر آچکی ہیں اوراب مختلف اقساط کو مکمل جلد کی شکل میں شائع کرنا مناسب سمجھا گیا۔الحمدللہ ایک عرصہ ہوا کہ جلد اول شائقین کے ہاتھوں تک پہنچی، اب **"جلد دوم"** غیر معمولی تاخیر کی معذرت خواہی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے دعا ہے کہ حق تعالیٰ اسے سابق سے زیادہ مقبولیت عطا فرمائے اور زندگیوں میں خوشگوار انقلاب پیدا ہونے کا ذریعہ بنائے۔حدیث اورسنت کے نور سے پورا معاشرہ معطر ومنور ہوجائے۔﴿آمین﴾

اس جلد میں کل آٹھ موضوعات (Chapters) ہیں:-

﴿۱﴾ صدق ﴿۲﴾ مراقبہ ﴿۳﴾ تقویٰ ﴿۴﴾ یقین وتوکل ﴿۵﴾ استقامت ﴿۶﴾ خدا کی مخلوق میں غور وفکر ﴿۷﴾ نیکی کی طرف لپکنا ﴿۸﴾ مجاہدہ۔

﴿۱﴾ **صدق یعنی سچائی:-** ہمارے معاشرہ میں صرف زبان سے خلاف واقعہ و حقیقت بات نہ بولنے کو سچائی سمجھا جاتا ہے لیکن ہمیں یہ مضمون پڑھنے سے اس لفظ (صدق) کی جامعیت، گہرائی وگیرائی کا اندازہ ہوگا۔ اولیاء کے مختلف مراتب میں سب سے اعلیٰ مقام ''صدیقیت'' ہے۔ یہ مقام ہر انسان حاصل کرسکتا ہے۔ کتاب پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ کیسے۔ صرف نیت میں صدق کی کیا برکات ہیں اور اس کی کیا اہمیت ہے۔ دورِ جاہلیت میں بھی کذب (جھوٹ) کو کتنا گندا سمجھا جاتا تھا۔ تجارت میں برکت لانے والی چیز کیا ہے، اور برکت کو ختم کردینے والی چیز کیا ہے؛ یہ متعلقہ احادیث، ان کے ترجمہ اور تشریحات پڑھنے سے معلوم ہوگا۔

﴿۲﴾ **مراقبہ:-** اس مضمون کے تحت اس کا لغوی واصطلاحی معنیٰ سمجھایا گیا ہے۔ مشہور حدیث جبرئیل مع ترجمہ وتشریح اسی عنوان کے تحت ہے۔ بقول حضرت شیخ الحدیث صاحب نور اللہ مرقدہٗ: تصوف کی ابتداء ''أنما الأعمال بالنیات'' اور اس کی انتہاء ''أن تعبد اللہ کأنک تراہ'' ہے، ہمیں اپنے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں استحضارِ نیت و حسنِ نیت کا جو سلوک کی ابتداء ہے کتنا اہتمام کررہے ہیں؟ اور پھر انتہاء تک پہنچنے میں کہاں کامیابی حاصل ہوسکتی ہے اگر پہلا زینہ ہی اب تک نہیں چڑھ پائے۔

اسی عنوان کے تحت حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت بھی ہے جس میں حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں چند مختصر مگر جامع الفاظ میں ایسی قیمتی نصیحتیں ارشاد فرمائی ہیں جو لوحِ دل پر آبِ زر سے نقش کرنے کے قابل ہیں۔

اسی کے تحت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بنی اسرائیل کے تین آدمیوں کا دلچسپ مگر عبرتناک قصہ بھی ہے، سلیم الطبع انسان اسے پڑھ کر محسوس کرے گا کہ میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہے، اس میں میرا بھی کہیں امتحان تو نہیں ہو رہا ہے، اور اس امتحان میں مَیں کامیاب ہوں یا ناکام۔ کہیں میری حالت اس گنجے اور کوڑھی شخص سے مختلف تو نہیں جن کا قصہ حدیث میں ذکر ہے

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت بھی اسی میں ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ درحقیقت چالاک اور غبی کون ہیں۔ نیز ذخیرۂ احادیث کی جامع ترین روایات میں جس کا شمار ہوتا ہے وہ روایت بھی مع ترجمہ وتشریح اسی عنوان میں ہے۔ لایعنی کسے کہا جاتا ہے اور اس بارے میں اسلاف کا کیا طرزِ عمل رہا ہے؛ وہ بھی پڑھنے ملے گا۔

اور اخیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت بھی ہے جس کے تحت بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت ہے، اور کن وجوہات کی بناء پر سرزنش کی شریعت نے اجازت دی ہے؛ اس کی تفصیل ہے۔ اور ناشزہ کی اصلاح کی قرآنی ترتیب کیا ہے؟ حضرت دامت برکاتہم نے ان تمام پہلوؤں کے متعلق قابلِ مطالعہ تفصیلات ارشاد فرمائی ہیں۔ اس کے علاوہ علمی فوائد الگ ہیں۔

﴿۳﴾ تقویٰ:- اس عنوان کے تحت حضرتِ اقدس دامت برکاتہم نے حسبِ عادتِ شریفہ اس عربی لفظ کی جامع مانع اور آسان لغوی واصطلاحی تشریح فرما کر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی پیش کردہ آیات وروایاتِ حدیث کی عام فہم توضیحات بیان فرمائی ہیں۔

اس عنوان کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوگا کہ تقویٰ کے کتنے درجات ہیں اور وہ کتنا ضروری ہے۔ اس کے فوائد وفضائل کیا ہیں اور تقویٰ اختیار کرنے سے کیسی برکتیں حاصل ہوتی ہیں موجودہ دور کا اہم مسئلہ روزی کا ہے؛ وہ بھی تقویٰ کی برکت سے کیسے حل ہوتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوگا کہ عزت وشرافت اور ذلت ورذالت کا پیمانہ؛ مال ودولت، مرتبہ ومنصب نہیں، نہ شہریت وبدویت

ہے، بلکہ صرف اورصرف تقویٰ ہے جو ہرکس وناکس اختیار کرسکتا ہے۔اوراس کو حاصل کرنے کا آسان طریقہ بھی معلوم ہوگا۔تقویٰ ایسی صفت ہے کہ حضوراکرم ﷺ نے اپنی دعاؤں میں اس کا خاص اہتمام فرمایاہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں خاص طور پرتقویٰ عن الدنیااوراخص الخصوص طور پر تقویٰ عن النساء(جو موجودہ دور میں سارے فساد کی جڑ ہے) کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک زریں رہنمااصول بابتِ یمین بیان کیا گیاہے۔اور اس باب کی آخری روایت میں دخولِ جنت کے موجب چنداعمال جونہایت آسان اورمختصر ہیں؛ محورِ بحث رہے ہیں۔

﴿۴﴾ **یقین وتوکل:** –بظاہر یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن درحقیقت بوجہ لازم ملزوم ہونے کے انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا بہت مشکل ہے،یہی وجہ ہے کہ دونوں کو ساتھ بیان کیاہے،اوراس کے ذیل میں متعلقہ آیات وروایات جمع فرمائی ہیں۔یقین کے درجات مع امثلہ واضح کئے گئے ہیں۔دنیادارالاسباب ہےلیکن اسباب کادرجہ کیاہے،اوراس کے احکام کیا ہیں؟ تدبیر کی حیثیت کیاہے اوراس کوہم نے کیادرجہ دے رکھا ہے؟ توکل کی حقیقت کیاہے؟اس کے تعلق سے پیداشدہ غلط فہمیوں کاازالہ؛ یہ تمام اصلاح طلب امورسامانِ لذتِ خاطر ہیں۔اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ بزرگوں کے تجربات کی روشنی میں توکل حاصل کرنے کا بہت ہی سہل اور آسان نسخہ ہمارے ہاتھوں میں دے دیاہے۔بس ضرورت ہے کہ ہم اس کا مطالعہ کرکےاپنی زندگی کو اس صفت سے متصف کرلیں۔

امام السالکین واسوۃ الطالبین حضرت نبی اکرم ﷺ کے یقین وتوکل کی وہ جھلکیاں یہاں پڑھنےکوملیں گی جوایمان کوتازہ اورروح کوشاداں کردیں۔غزوۂ خندق اورغزوۂ حمراء الاسد کے موقعہ

پر آپ کے جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم نے کس اعلیٰ درجہ کے یقین وتوکل کا مظاہرہ فرمایا اور خود حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دو ذاتی واقعات جو آپ ﷺ کی قلبی کیفیت کے غماز ہیں؛ تفصیلی تشریحات کے ساتھ موجود ہیں۔

گھر سے نکلتے وقت اور رات کو سوتے وقت توکل وتفویض کی کیا کیفیت ہونی چاہیے، وہ ان اوقات کی ماثور دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے۔ دعاؤں کا اہتمام کتنا مفید ہے، اور ہماری طرف سے اس میں کتنی کوتاہی ہے؛ وہ اس مضمون سے معلوم ہوگا۔ توکل کے فوائد وفضائل مزید برآں۔

ہمارے معاشرہ میں ایک عام ابتلاء یہ ہے کہ کمانے والوں کو علمی مشاغل میں منہمک افرادِ خاندان کے مقابلہ میں ترجیح واہمیت دی جاتی ہے، اور علمی ودینی امور میں وقت لگانے والوں کو ثانوی درجہ دیا جاتا ہے۔ اس میں ہماری کیا غلطی ہے؟ صحیح کیا اور کیوں ہے؟ ایک صریح حدیثِ پاک کی روشنی میں حضرت دامت برکاتہم نے اس گتھی کو بڑے خوبصورت انداز میں سلجھایا ہے۔ پڑھئے اور محظوظ ہوجئے۔

اس باب میں کل پانچ آیاتِ مبارکہ اور گیارہ احادیثِ طیبہ مع ترجمہ وتشریح ہیں۔

﴿۵﴾ استقامت: - سالک جب بتدریج منازلِ قرب طے کرتا ہے تو شیطان اسے ترقی سے روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے، تب ضرورت ہوتی ہے کہ سالک علمی و عملی مشاغل ومعمولات پر ثابت قدم رہے، ڈٹ کر نفس وشیطان کا مقابلہ کرے، ان دونوں کو خود پر غالب نہ ہونے دے۔ استقامت کا تعلق عقائد، اقوال اور افعال تمام سے ہے، دینی ودنیوی امور میں اس سے مفر نہیں۔ اور اس صفت کے حاصل ہونے سے کیا فائدے ہیں اور اس سے محروم کتنے خسارہ میں ہے۔ ہم لوگوں کو عبادات اور معمولات سے فائدہ کیوں نہیں پہنچتا؟ دورِ حاضر کا سب سے بڑا پروبلم (Problem) اور المیہ کیا ہے؟ استقامت کیسے حاصل ہو؟ غلو کیسے پیدا ہوتا ہے؟ یہ

تمام پہلواس عنوان کے تحت آیات وروایات کی روشنی میں اجاگر کیے گئے ہیں۔حضورِ پاک ﷺ کو واسطہ بنا کرامت کواستقامت کاحکم صاف الفاظ میں بصیغۂ امر دیا گیاہے۔

﴿۶﴾ خدا کی مخلوق میں غور و فکر:-اس میں عبادت کا پہلو کیا ہے؟ قرآنِ کریم میں کہاں کہاں اس کی طرف توجہ دہانی کی گئی ہے اور تفکّر فی عظیم مخلوقات اللہ کا طریقہ اورفائدہ کیاہے؟ صاحبِ کتاب نے بطورِ نمونہ چارآیتیں درج کی ہیں۔حضرت کے ترجمہ وتفسیر کے ساتھ زینتِ کتاب ہے۔

﴿۷﴾ نیکی کی طرف لپکنا:-کبھی کبھی انسان تھوڑی سی سستی کی نحوست سے بڑی بڑی نیکیوں سے محروم رہ جاتا ہے،ضروری نہیں کہ انسان بدتوفیقی اور بےتوفیقی کی وجہ سے ہی خیر سے محروم رہے،انسان کے مزاج کی سستی بھی اسے محروم کرتی ہے،اس معاملہ میں انسان کا مزاج مسابق (Competitive) ہونا چاہیے۔آج کا دورتو (Competition) اور مسابقت کا ہے،ہرشعبہ سے وابستہ افراد اس کے قائل ہیں اورخودبھی اس میں لگے ہوئے ہیں،فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری یہ دوڑ اور مسابقت دنیوی امور میں ہے،اورصحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دوڑ اور مسابقت اخروی امور میں تھی۔ہمیں کس طرح اپنے زاویۂ نگاہ کو بدلنا ہے؛ وہ اس مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلے گا۔ بطورِعبرت وتمثیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات کا ذکر ہے۔

کون سا صدقہ ایسا ہے جس میں ثواب زیادہ ملتا ہے؟ وصیت کے سلسلہ میں شریعت کے کیا قواعد اور (LAWS) ہیں؟ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے لئے ہماری جو ترتیب ہے وہ کس حدتک درست ہے؟ اوراسلاف کی ترتیب کیا تھی؟ یہ سب چیزیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے تحت دل نشین پیرایہ میں زیبِ قرطاس ہے۔

دنیا کے حالات دن بہ دن پرفتن ہونے والے ہیں، اس لئے آج کے وقت کو غنیمت سمجھو اور جو اعمالِ خیر انجام دینے کا موقعہ ہاتھ آجائے؛ اس کو ضائع مت کرو۔ اس موضوع پر چشم کشا کلام حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایات کے تحت ہے۔

غزوۂ احد میں حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کے کیا نمایاں کارنامے تھے؟ غزوۂ خیبر اور حضرت حیدر رضی اللہ عنہ کے حالاتِ اطاعت، جنگ کی بنیاد کیا ہے؟ یہ سب باتیں اور بہت کچھ علمی جواہر پارے آپ اس عنوان کے تحت پائیں گے۔

﴿۸﴾ مجاہدہ:- کسی مقصدِ عظیم کی اہمیت کو علیٰ وجہ البصیرۃ سمجھتے ہوئے اس کے حاصل کرنے کے لئے اپنی تمام تر قوت و انرجی (Energy) کو استعمال کر ڈالنا؛ مجاہدہ کہلاتا ہے۔ سالک کے سفر کی ابتداء ہی مجاہدہ سے ہوتی ہے: ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تا دم آخر دمے فارغ مباش

مجاہدہ کی شکلیں صورتیں تبدل زمان ومکان کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہیں، ہمارے اسلاف کو مجاہدہ کی جو اشکال پیش آئیں، ہم ان کی تاب بھی نہیں لاسکتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں مجاہدہ سے چھٹی مل گئی۔ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا ضروری ہوتا ہے۔ کیا کھونا ہوگا؟ اس کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے شیخ سے ربط کرتا رہے، انہیں حالاتِ ظاہرہ و باطنہ سے آگاہ کرتا رہے۔ ذہنی طور پر ان کی کامل اتباع و اطاعت کے لئے خود کو تیار رکھے، اپنی اصلاح کے لئے ہر تلخی کو شیرینی سمجھے، بس لگا رہے: ع ''پیشِ مردے کاملے پامال شو'' کا منظر پیش کرے اور مجاہدہ پر وہ سب کچھ حاصل ہوگا جس کا آیات وروایاتِ مذکورہ در باب میں وعدہ کیا گیا ہے۔

نفس کیا ہے؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ اس کی کیا خاصیت ہے؟ اور اس کو کیسے قابو میں کیا جاسکتا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جوابات حضرت دامت برکاتہم نے عجیب انداز میں حل فرمائے ہیں۔

خلف کا سلف پر تنقید کا آج کل جو مزاج بنتا جا رہا ہے، اس کی اصلاح بھی اس مضمون میں کی گئی ہے

حضرت نے ایک بار سنایا کہ ایک صاحب بیعت ہونے کے لئے سوچ رہے تھے۔

نفس نے پوچھا: بیعت کسے کہتے ہیں؟ ارشاد: خود کو شیخ کے ہاتھ بیچ دینا۔

نفس: تجھے کیا ملے گا؟ ارشاد: خدا

نفس: کیا یہ پکا ہے کہ خدا مل ہی جائے گا؟ ارشاد: کم ازکم اتنا تو پکا ہے کہ کل قیامت میں یہ کہنے کا منہ تو رہ جائے گا کہ آپ کو لینے نکلا تھا۔ نجات کے لئے تو اتنا بھی کافی ہے۔

دو محرومِ انصاف نعمتیں صحت اور فراغت والے مضمون کو پورا انصاف اس کتاب میں دیا گیا ہے منصف مزاج آدمی پڑھ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ باوجود مرحوم و مغفور ہونے کے کیسا مجاہدہ فرماتے تھے، اس کی جھلک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں قارئین کو دیکھنے ملے گی۔ حضورِ اکرم ﷺ کے خادمِ خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ کے عمِ مکرم حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کی اللہ کے راستہ میں قربانی دینے کی تمنا و خواہش اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے صداقت کے سرٹیفکٹ کا واقعہ اسی مضمون کے تحت بالتفصیل موجود ہے۔

اور اخیر میں ایک قابل غور و فکر حدیثِ قدسی ذکر فرمائی ہے جس میں اللہ رب العزت کی عظمت، کبریائی، بڑائی اور جلالتِ شان کے مضامین ہیں؛ جن کے دل میں اتارنے سے ان شاء اللہ زندگی کے بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عنوان کے تحت زوردار آیات و روایات کے حسن انتخاب کا نمونہ پیش فرما کر عمل پر آمادہ کرنے والا مواد فراہم کیا ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مختصر اینکہ اس زمانہ کا سلوک نسبتاً بہت آسان ہے، لہٰذا انسان کو تسلیم و تفویض، اعتقاد، اطلاع، اتباع اور انقیاد اپنا کر اللہ کا نام لے کر سفر شروع کر دینا چاہیے۔ بقول امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ:

دنیا کی تھوڑی سی راحت وآرام کی قربانی ومجاہدہ کے عوض اللہ تعالیٰ کے یہاں جو مراتب و مقامات ملنے والے ہیں؛ اگر انسان ان کا تصور کرتا رہے تو پھر مجاہدہ بھی آسان ہو جاتا ہے۔

اخیراً مکرم قارئین اور کتاب کے درمیان حائل بنے رہنے کی معذرت خواہی اور اس گذارش کے ساتھ راقم الحروف قلم کو یہیں روک لگاتا ہے کہ ''شعبہ فیض محمود'' آپ کے ہر نوع کے تعاون کا بصمیم قلب خیر مقدم کرے گا۔ دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ اس کاوش کو شرف قبولیت عطا فرمائے، استقامت کے ساتھ مزید کی توفیق ارزانی فرمائے، اس سلسلہ کے بعافیت جلد از جلد تکمیل تک پہنچنے کی شکلیں غیب سے پیدا فرمائے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم کے سایۂ عاطفت کو دراز تر فرما کر فیوض کو عام وتام فرمائے۔ ﴿آمین﴾

ابوزاہر

۱۹/رجب المرجب ۱۴۲۹ھ

۲۳/جولائی ۲۰۰۸ء

صدق

﴿سچائی﴾
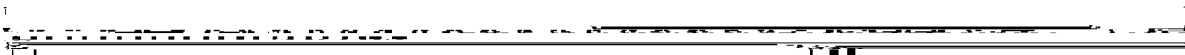
اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں سب سے اونچا وصف تو ہے نبوت ۔ نبوت اور رسالت وہ مقام ہے کہ جس میں آدمی کے کسب اور ریاضت کو دخل نہیں

نمبر دو پر جو مقام ہے وہ صدیقیت کا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ اس میں آدمی کے کسب اور ارادے کو دخل ہے، آدمی محنت مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ سے اس مقام کو حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے اور قیامت تک کے لئے کھلا رہے گا اسی صدق کو جب ترقی ہوتی ہے تو آدمی صدیقیت کے مقام پر پہنچتا ہے

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

سچائی یقیناً آدمی کی رہنمائی کرتی ہے نکوکاری کی طرف ۔ یعنی آدمی سچ کا اہتمام کرتا ہے، اپنے بولنے میں بھی، اپنے کردار میں بھی اور اپنے کام میں بھی؛ تو سچ والی یہ صفت اس کو نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور نیکی اس کو جنت کی طرف لے جاتی ہے، اور آدمی اپنے کردار میں، گفتار میں، اپنے عزم وارادہ میں سچائی کا اہتمام کرتا ہے؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ ''صدیق'' لکھا جاتا ہے

سچائی ہی ایک ایسی صفت ہے کہ اس کو آدمی اگر اختیار کرلے تو اس کے نتیجہ میں باقی تمام صفات آسانی کے ساتھ اس کو حاصل ہو سکتی ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً

امابعد. فاعوذباللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم.

یَاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْااتَّقُوْاللّٰہَ وَکُوْنُوْامَعَ الصّٰدِقِیْنَ. (التوبۃ. ۱۱۹)

وقال تعالیٰ: وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقَاتِ. (الأحزاب. ۳۵)

وقال تعالیٰ: فَلَوْصَدَقُوْااللّٰہَ لَکَانَ خَیْرًالَّھُمْ. (محمد. ۲۱)

صدق کی قسمیں

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا ہے باب الصدق۔ ''صدق'' سچائی کو کہتے ہیں۔ علماء نے سچائی کی تقسیم کی ہے اوراس کی کچھ انواع بیان کی ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ آدمی بات میں سچا ہو جیسا کہ عام طور پر ہم جب اس لفظِ صدق اور سچائی کو استعمال کرتے ہیں اس وقت اسی معنٰی کو مراد لیا کرتے ہیں کہ وہ اپنی بات میں سچا ہے یعنی جو چیز واقعہ کے مطابق ہو اسی کو وہ اپنی زبان سے ادا کرے، واقعہ کے خلاف اگر کوئی آدمی اپنی زبان سے کوئی بات ادا کرے اور خبر دے تو اس کو جھوٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص آیا ہے اس کے متعلق اگر آپ یہ اطلاع دیں کہ فلاں آدمی آ گیا تو چونکہ آپ نے جو خبر دی ہے وہ واقعہ کے مطابق ہے اس لئے یوں کہیں گے کہ آپ نے سچی بات کہی، اور اگر وہ آیا ہے اس کے باوجود

کوئی آدمی یوں کہے کہ نہیں آیا، یہ واقعہ کے خلاف خبر دی جا رہی ہے تو اس کو جھوٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ یہ غلط اور جھوٹ بات ہے، لہٰذا ایک تو بات کے اندر سچائی ہوتی ہے۔

عزم وارادہ میں سچائی

دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی اپنے عزم وارادہ میں سچائی سے کام لے، مثلاً ایک آدمی نے تجارت شروع کی، تجارت شروع کرتے وقت اس نے اپنے دل میں یہ ارادہ وعزم کیا کہ اگر میری اس تجارت میں اتنا منافع ہوا تو میں مال کی اتنی مقدار اللہ کے راستے میں خرچ کروں گا یا مال کی اتنی مقدار حاصل ہونے پر مسجد تعمیر کر دوں گا، مدرسہ میں اتنے پیسے دوں گا یا غریبوں کی امداد کے اندر اتنی رقم خرچ کروں گا، مطلب یہ ہے کہ عام طور پر آدمی جب کوئی تجارتی کام کرتا ہے یا اسی طریقہ سے کوئی اور معاملہ کرتا ہے تو اپنے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس سلسلہ میں ایک معاملہ کرتا ہے، ارادہ اور عزم کرتا ہے لہٰذا جس وقت وہ ارادہ کر رہا ہے تو اتنی پختگی کے ساتھ یہ طے کرے کہ واقعۃً میری جو نیت ہے اگر اس کے مطابق ہوگیا تو مَیں اللہ کے راستہ میں اتنی رقم خرچ کروں گا تو یوں کہیں گے کہ یہ اپنے عزم وارادہ میں سچا اور پکا ہے، پھر جب اس کی نیت کے مطابق نفع ہوگیا تو اب اپنے اس ارادے کو پورا کرنے میں سچا ہونا چاہیے، ورنہ پھر وہ جھوٹا قرار دیا جائے گا۔

منت کون سی صحیح ہے، کون سی نہیں؟

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جب اپنے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس قسم کا معاملہ کرتا ہے اور نیت کرتا ہے تو اس کی دو شکلیں ہوتی ہیں، ایک شکل تو یہ ہے کہ زبان سے بولے؛ یہ منت اور نذر کہلاتی ہے، اس کو تو پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی ایسے کام کے متعلق

کسی نے منت اور نذر مانی ہے جس کی جنس کا کوئی کام اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پہلے سے واجب ہوا کرتا ہے مثلاً کسی نے منت مانی کہ میرا بیٹا بیمار ہے، اگر اچھا ہو گیا تو مَیں اتنی رکعات نماز پڑھوں گا تو گویا ایک ایسی چیز کی اس نے نذر اور منت مانی ہے جس کی جنس کا یہ فعل یعنی نماز اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پہلے سے فرض ہے ایسی چیز کی اگر منت مانتا ہے تو وہ منت درست ہوتی ہے۔لیکن اگر کوئی آدمی کسی ایسے کام کی منت مانے جس کی جنس کا کوئی کام اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فرض یا واجب نہیں ہے تو وہ منت درست نہیں ہے مثلاً کسی آدمی نے منت مانی کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو مَیں دھوپ میں اتنی دیر تک کھڑا رہوں گا، تو یہ منت اور نذر نہیں۔ہاں! اگر نماز کی منت مانی، روزے کی مانی، اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی مانی، حج کی مانی تو یہ سب نذریں درست ہوجاتی ہیں۔اسی لئے کوئی آدمی اگر کسی گناہ کے کام کی نذر مان لے؛ تو یہ درست نہیں۔لہٰذا اگر غلطی سے گناہ کی منت مان لی ہو تو اس کو پورا نہ کرے اور قسم توڑنے کا کفارہ دے دے، اس لئے کہ نذر عبادت میں ہوا کرتی ہے

اگر زبان سے نہیں بولا، صرف دل سے ارادہ کیا تو؟

خیر یہ تو نذر کی بات تھی اس میں تو آدمی اپنی زبان سے بولتا ہے۔ایک شکل اور ہے کہ زبان سے نہیں بولا بلکہ صرف دل میں اس کی نیت کر لی، دل میں ارادہ کر لیا تو یہ نذر کے طور پر واجب اور ضروری نہیں ہوتا، یعنی اگر زبان سے بولا ہوتا تو نذر اور منت کہلاتی، لیکن صرف دل میں ارادہ کیا ہے تو منت نہیں ہے۔

بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ میرے دل میں یہ نیت تھی کہ میری تجارت میں نفع ہوگا تو دو پرسنٹ (2%) اللہ کے راستے میں خرچ کروں گا تو کیا یہ منت ہو جائے گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ منت نہیں کہلائے گی۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ ایک عزم اس نے کیا تھا تو اپنے عزم میں اس کو پختہ ہونا چاہیے اور اس کے مطابق تجارت کے اندر منافع ہوا، تو اپنے اس عزم کو پورا کرنے کے معاملے میں بھی اس کو سچا ہونا چاہیے۔ تو عزم میں سچا ہو اور وفا بھی ہو، یعنی اپنے اس عزم وارادہ کو پورا کرنے میں بھی سچا ہونا چاہیے۔

بہت سے لوگ تو جب عزم کرتے ہیں تب ہی سے ڈانواں ڈول (ડાવાંડોલ) ہوتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ یا بہت سے لوگ جب عزم کرتے ہیں تب تو پختہ ہوتے ہیں لیکن جب اس کے مطابق منافع ہو گیا تو پھر دل میں کہتے ہیں کہ اوہ ہو! یہ دو پرسنٹ تو دو لاکھ کے قریب پہنچتا ہے، اب ڈانواں ڈول (ડાવાંડોલ) ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ یہ دو لاکھ کیسے نکلیں گے؛ تو اپنے اس ارادہ کو پورا کرنے میں بھی پختہ ہونا چاہیے۔ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ بہت سے لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ سے اپنے دل میں یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں کچھ دیں گے، مالِ تجارت میں برکت ہوگی، ہمارے پاس مال آئے گا تو ہم اللہ کے راستے میں خرچ کریں گے، صدقہ کریں گے اور اپنے عمل کے اعتبار سے اپنے آپ کو نیکوکار ثابت کریں گے ﴿فَلَمَّا اٰتٰهُمْ مِنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ دیتا ہے تو پھر بخل سے کام لیتے ہیں یعنی انھوں نے اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو عہد وارادہ کیا تھا؛ وہ پورا نہیں کرتے۔ یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے۔

آدمی کو جس طرح اپنے قول میں سچا ہونا چاہیے، اسی طرح اپنے عزم وارادہ کو پورا کرنے میں بھی سچا ہونا چاہیے۔ اسی طریقہ سے اپنے افعال میں اپنے کردار میں بھی آدمی کو سچا ہونا چاہیے۔ جیسے ہم بولتے ہیں کہ یہ آدمی اپنے کردار کا بڑا سچا اور پکا ہے۔

بہرحال! یہ سچائی وہ صفت ہے کہ جس طرح وہ قول اور باتوں کے اوپر بولی جاتی ہے؛ اسی طرح فعل اور کاموں کے اوپر بھی بولی جاتی ہے۔ جس طرح وہ گفتار کے اوپر بولی جاتی ہے؛ کردار کے اوپر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور یہ بہت اونچا وصف ہے۔

﴿ نبوت وہبی ہے اور صدیقیت کسبی ہے ﴾

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں سب سے اونچا وصف تو ہے نبوت۔ نبوت اور رسالت تو وہ مقام ہے کہ جس میں آدمی کے کسب اور ریاضت کو دخل نہیں یعنی آدمی اپنا کوئی عمل اور محنت کر کے نبوت کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا، کوئی آدمی کتنی ہی محنت کرے کتنے ہی مجاہدے کرے وہ نبی نہیں بن سکتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس کو چاہیں عطا فرمادیں۔ یہ وہبی چیز ہے، کسبی نہیں۔ یعنی آدمی کی کمائی، عمل اور محنت کو اس میں دخل نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ یہ سب سے اونچا مقام ہے جو ایک انسان کو حاصل ہوسکتا ہے۔

نمبر دو پر جو مقام ہے وہ صدیقیت کا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ اس میں آدمی کے کسب اور ارادے کو دخل ہے، آدمی محنت مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ سے اس مقام کو حاصل کرسکتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہو تو یہ کوئی ایسا مقام نہیں ہے کہ جس کو آدمی حاصل نہ کرسکے۔ اس کا دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے اور قیامت تک کیلئے کھلا رہے گا۔ لہٰذا جو دوسرے نمبر کا مقام ہے جس کو ایک انسان حاصل کرسکتا ہے وہ یہی صدق کا ہے اور اسی صدق کو جب ترقی ہوتی ہے تو صدیقیت کے مقام پر آدمی پہنچتا ہے، اسی لئے اس کا بڑا اونچا مرتبہ ہے۔

﴿ صدق کے متعلق قرآنِ کریم کی آیتیں ﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک آیت پیش کی: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا

اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُونُوا مَعَ الصَّادِقِینَ﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو یعنی جو اپنی بات کے بھی سچے، کام کے بھی سچے، ارادے کے بھی سچے ہوں، جن کی ہر چیز میں سچائی جھلکتی ہو، ایسوں کے ساتھ رہو؛ تو ان شاء اللہ تمہارے اندر بھی یہ وصف آ جائے گا۔

دوسری آیت پیش کی: ﴿وَالصَّادِقِینَ وَالصَّادِقَاتِ﴾ یہ سورۂ احزاب کی آیت ہے ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِینَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِینَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں بعض اہلِ ایمان عورتوں کی طرف سے یہ شکوہ وشکایت کی گئی کہ قرآنِ پاک میں مردوں ہی کا تذکرہ ہوتا ہے عورتوں کا تو تذکرہ ہوتا ہی نہیں، اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورتوں کی دلجوئی کیلئے یہ آیت نازل فرمائی جس میں ان اوصاف کو ذکر کیا گیا جو اللہ تعالیٰ کے یہاں آدمی کیلئے قرب ونزدیکی کا باعث ہوتے ہیں، اس میں اسلام وایمان کے ساتھ ہی صدق کا بھی تذکرہ ہے کہ سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں یا جو اپنے کام میں بھی سچے، ارادے وعزم کو پورا کرنے میں بھی سچے ہوں، ایسے مردوں اور ایسی عورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

تیسری آیت ہے: ﴿فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰہَ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ﴾ شروع میں جو مَیں نے کہا تھا کہ عزم اور ارادے کی سچائی بھی مطلوب ہے اسی کو ثابت کرتے ہیں۔ یہ آیت سورۂ محمد کی ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ بعض لوگوں نے تمنا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر جہاد کا حکم نازل ہوا، تو ہم اس حکم پر پورے طریقے سے عمل کریں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک عہد اور عزم کیا۔ لیکن جب جہاد کا حکم نازل ہوا تو پیچھے ہٹ شروع کر دی اور کمزور ثابت ہونے لگے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچا

عہد کرتے اور جو عزم کیا تھا اس کے مطابق عمل کرتے؛ تو یہ ان کے لئے بڑی اچھائی اور خوبی کی بات ہوتی۔

کون صدیقیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا؟

بہت سی مرتبہ آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے دل میں کچھ عہد کرتا ہے جیسا کہ ابھی مَیں نے مثال کے طور پر بتلایا تھا کہ تجارت میں اگر اتنا نفع ہوگا تو اتنی رقم خرچ کریں گے یا بہت سی مرتبہ آدمی بیمار ہوتا ہے تب دل میں یوں ارادہ کرتا ہے کہ بہت سے دوستوں نے کہا تھا کہ چلہ میں نکلو اب جب بیمار ہوئے اور دیکھا کہ حالت بہت خراب ہے تو دل میں ارادہ کرلیا کہ جب مَیں تندرست ہو جاؤں گا تو چلہ ضرور دوں گا، اور جب تندرست ہوئے تو نہیں گئے۔ یا اسی طرح اور کوئی کارِ خیر کے متعلق ہوتا ہے۔ تو جتنے بھی اس طرح کے ارادے آدمی اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بھی مطالبہ ہوگا۔ اگرچہ ظاہری طور پر اس کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا، یہ کوئی واجب نہیں ہے، لیکن ایک آدمی جب خالص دل سے ارادہ کرے تو اس کو پورا کرنا چاہیے، اس عزم میں سچا ہونا چاہیے ورنہ یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے اور ایسا آدمی کبھی صدیقیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔

مقام صدیقیت کیسے حاصل ہو؟

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اِنَّ الصِّدْقَ یَهْدِیُ اِلیٰ الْبِرِّ، وَاِنَّ الْبِرَّ یَهْدِیُ اِلیٰ الْجَنَّةِ، وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَصْدُقَ حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَاللهِ صِدِّیْقًا.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سچائی یقیناً آدمی کی رہنمائی کرتی ہے نکوکاری کی طرف۔ یعنی آدمی سچ کا اہتمام کرتا ہے، اپنے بولنے میں

بھی، اپنے کردار میں بھی، اور اپنے کام میں بھی؛ تو یہ سچ والی یہ صفت اس کو نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور نیکی اس کو جنت کی طرف لے جاتی ہے، اور آدمی اپنے کردار میں، گفتار میں، اپنے عزم وارادے میں سچائی کا اہتمام کرتا ہے؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صدیق لکھا جاتا ہے۔ یعنی صدیق کے مقام پر پہنچتا ہے۔

سچائی کے معاملہ میں برتی جانے والی غفلت

آج کل ہمارے معاشرے میں سچائی کے معاملہ میں بہت زیادہ غفلت برتی جاتی ہے، حالانکہ سچائی کا خوب خوب اہتمام ہونا چاہیے۔ آدمی کو جھوٹ سے بہت دور رہنا چاہیے، جھوٹ کا شائبہ تک بھی نہیں ہونا چاہیے۔

ایک مرتبہ ایک عورت نے اپنے بچے کو بلانے کے لئے کہا: آ! مَیں تجھے کچھ دیتی ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے اس عورت سے سوال کیا: کیا واقعی تمہارا کچھ دینے کا ارادہ تھا؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں! میرے پاس ایک کھجور کا دانہ ہے، مَیں نے دل میں یہ نیت کی تھی کہ وہ آئے گا تو مَیں اس کو دوں گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا (ابوداود،۴/ ۲۹۸، الحدیث۴۹۹۱) بہت سی مرتبہ ہم ایسی باتیں کرتے ہیں۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سچائی کے معاملہ میں احتیاط

حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے صاحبزادے مولانا آفتاب عالم صاحب مدظلہ نے ایک مرتبہ سنایا کہ حضرت کے پاس کسی ملنے والے کا خط آیا جس میں انھوں نے اپنی ماں کے انتقال کی خبر لکھی تھی۔ حضرت نے جواب لکھوایا کہ آپ کا خط ملا، آپ کی والدہ کے انتقال پر بہت دکھ ہوا۔ مولانا آفتاب عالم صاحب فرماتے ہیں کہ

پھر حضرت نے کہا: ذرا ٹھیر جاؤ، تھوڑی دیر آنکھیں بند کیں، اور اس کے بعد کہا: ٹھیک ہے۔ مَیں نے پوچھا: کیا بات تھی؟ فرمایا: مَیں نے لکھوایا تھا کہ آپ کی والدہ کے انتقال سے بہت دکھ ہوا۔ تو ایک تو ہے دکھ ہونا، اور ایک ہے بہت دکھ ہونا۔ مَیں نے یہ سوچا کہ کہیں یہ جھوٹ تو نہیں لکھوا رہا ہوں۔ مَیں نے اپنے دل کا جائزہ لیا کہ واقعۃً کیا ان کی والدہ کے انتقال پر میرے دل میں دکھ کی جو کیفیت پیدا ہوئی وہ اتنی ہے کہ جس کو مَیں یوں تعبیر کر سکتا ہوں کہ بہت دکھ ہوا؟ جب مَیں نے سوچا تو معلوم ہوا کہ صحیح ہے اس لئے اب کہا کہ ٹھیک ہے، اس کو باقی رہنے دو اور آگے چلو۔

دیکھئے! یہ حضرات کتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ ذرہ برابر بھی کسی چیز میں جھوٹ کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ اور آج کل معاملات کے اندر، کردار میں، گفتار میں سچائی کا ذرا بھی اہتمام نہیں رہا ہے۔ آدمی اپنی زبان سے کوئی بات نکال دیتا ہے، اور اس کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ میری زبان سے ایسی جھوٹی چیز نکل رہی ہے۔ حالانکہ اگر وہ جھوٹ بولا ہے؛ تو کبھی بھی صدیقیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔

﴿جنت تک پہنچنے کا آسان گُر﴾

اور ایک آدمی اگر جنت کا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو کتنا آسان ہے۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اس کا ایک گُر اور ایسا پوئنٹ (point) بتلا دیا کہ بہت آسانی سے وہ نکوکاری اور جنت کے راستے تک پہنچ سکتا ہے۔ صرف ایک چیز کو لازم پکڑ لے؛ اور وہ ہے ''سچائی''۔ اگر کوئی آدمی صرف سچائی کو لازم پکڑ لے تو ان شاء اللہ وہ اس کے نتیجہ میں نیکوکاری تک اور اس کے بعد جنت تک پہنچ جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اونچے مقام سے نوازیں گے۔

گویا ایک ہی چیز کا اہتمام آدمی کو ساری خیر دلوا دے گا۔ رسّی کا ایک سرا تھا جو نبی کریم ﷺ نے پکڑوا دیا کہ آپ اس کو اختیار کرلیں گے تو آگے کے تمام راستے حل ہو جائیں گے۔

﴿اعمالِ صالحہ پر مداومت حاصل کرنے کی سہل تدبیر﴾

ایک اور آیت پیش کی ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور درست بات کہو، اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو درست کردیں گے اور تمہارے گناہوں کو معاف کردیں گے۔

حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: دیکھو! آدمی بہت کوشش کرتا ہے کہ اعمال میں صلاح آجائے یعنی اعمال صالحہ پر مجھے مداومت اور پابندی حاصل ہوجائے، میرے گناہ معاف ہوجائیں؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا بہت آسان راستہ بتلا دیا ﴿قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا﴾ درست بات کہو۔ گویا یہ "سچائی" دیکھنے میں تو بہت معمولی چیز ہے لیکن اگر کوئی آدمی اس کو اختیار کرلے گا، تو اس کے نتیجہ میں وہ آخر تک پہنچ جائے گا۔

﴿ہر گناہ سے بچنے کی تدبیر﴾

اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک آدمی کے اندر کئی برائیاں تھیں، وہ جھوٹ بھی بولتا تھا، چوری بھی کرتا تھا، زنا بھی کرتا تھا۔ اس نے آکر نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! مَیں ایک ہی برائی چھوڑ سکتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا! جھوٹ مت بولنا۔ اس کے بعد جب اس کا چوری کرنے کا ارادہ ہوا تو اس نے سوچا کہ مَیں نے تو وعدہ کیا ہے کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جب چوری کروں گا اور بعد میں مجھ سے پوچھا جائے گا کہ تو نے چوری کی ہے؟ اور مَیں کہوں گا کہ ہاں! کی ہے، تو میرا ہاتھ کٹے گا۔ لہٰذا چوری سے باز آگیا۔ اسی

طریقہ سے جب زنا کا ارادہ کیا تو یہی خیال آیا کہ میں جب اس کا اقرار کروں گا تو شریعت میں اس کی جو سزا ہے وہ جاری کی جائے گی۔ اس سے بھی بچ گیا۔

بہرحال! یہ سچائی ہی ایک ایسی صفت ہے کہ اس کو آدمی اگر اختیار کرلے تو اس کے نتیجہ میں باقی تمام صفات آسانی کے ساتھ اس کو حاصل ہوسکتی ہیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ الصِّدْقَ یَھْدِیْ اِلٰی الْبِرِّ﴾ سچائی آدمی کو نیکی کی طرف لے جاتی ہے ﴿وَاِنَّ الْبِرَّیَھْدِیْ اِلٰی الْجَنَّةِ﴾ اور نیکی آدمی کو جنت تک پہنچاتی ہے ﴿وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَصْدُقَ حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَاللّٰہِ صِدِّیْقًا﴾ اور آدمی ہمیشہ سچائی کے اوپر قائم رہتا ہے، اپنی بات میں، اپنے کام میں اور ہر چیز میں؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صدیق لکھا جاتا ہے۔

﴿وَاِنَّ الْکِذْبَ یَھْدِیْ اِلٰی الْفُجُوْرِ﴾ اور جھوٹ آدمی کو برائی، بدی اور بدکاری کی طرف لے جاتا ہے ﴿وَاِنَّ الْفُجُوْرَیَھْدِیْ اِلٰی النَّارِ﴾ اور بدکاری آدمی کو جہنم تک پہنچادیتی ہے۔ اس لئے کہ آدمی اگر ایک جھوٹ بولتا ہے تو اس جھوٹ کو نبھانے کے لئے دوسرا جھوٹ بول دیتا ہے اور اس کو نبھانے کے لئے تیسرا جھوٹ بولے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ چیز بڑھتے بڑھتے آدمی کو جہنم تک لے جائے گی۔ ﴿وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَکْذِبَ حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَاللّٰہِ کَذَّابًا﴾ اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کذّاب یعنی بڑا جھوٹا لکھا جاتا ہے۔

آج کل اس بارے میں جو غفلت برتی جاتی ہے، اگر ہم اسی ایک صفت کا اہتمام کرلیں؛ تو نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے نتیجہ میں کہا جاسکتا ہے کہ ان شاء اللہ ہمارے لئے راستہ آسان ہوجائے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿مذبذب امور کے لئے ایک رہنما اصول﴾

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد محفوظ اور یاد رکھا ہے: ﴿دَعْ مَایُرِیْبُکَ اِلیٰ مَالَایُرِیْبُکَ﴾ (الترمذی۴/ ۶۶۸، الحدیث ۲۵۱۸) جو چیز شک والی ہے اس کو چھوڑ کر ایسی چیز اختیار کرو جس میں شک نہ ہو۔ اس لئے کہ سچائی اطمینان اور سکونِ قلب کا نام ہے، اور جھوٹ شک اور تردد کا نام ہے۔

آدمی اگر صفتِ ایمان سے متصف ہے تو حلال وحرام کے معاملہ میں کبھی تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ﴿اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ﴾ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے ﴿وَبَیْنَھُمَا اُمُوْرٌ مُّشْتَبِھَاتٌ﴾ اور اس کے بیچ میں بعض چیزیں ایسی ہیں جس میں آدمی کو کچھ شبہ اور تردد رہتا ہے۔ اب جو ایسی بیچ بیچ کی چیزیں ہیں اس کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ یعنی آدمی کیا انداز اختیار کرے۔ اس کو کرے یا چھوڑے؟ تو نبی کریم ﷺ نے اس کے متعلق ایک رہنما اصول ہم کو بتلا دیا کہ جہاں کہیں تردد ہو؛ اس کو چھوڑ کر ایسی شکل اختیار کیجئے جس میں کوئی تردد نہ ہو، بس! یہ ہے سچائی اختیار کرنے کا آسان طریقہ۔

اسی لئے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿فَاِنَّ الصِّدْقَ طَمَانِیْنَۃٌ﴾ ''سچائی'' اطمینانِ قلب کا نام ہے۔ اس لئے کہ آدمی جب کوئی غلط حرکت کرتا ہے تو چاہے ساری دنیا کے سامنے وہ اپنی اس غلط چیز کی تاویلیں کرتا رہے اور لوگوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا رہے لیکن اس کا دل اس کو ہمیشہ ملامت کرتا رہتا ہے۔ دل کو کبھی اطمینان نہیں ہوتا، اور اپنے دل کی اسی ملامت سے بچنے کیلئے لوگوں کے سامنے مختلف تاویلیں کرتا ہے، لیکن دل میں تو بے چینی رہتی ہی ہے۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ سچائی دل کی طمانینت اور سکون کا نام ہے کہ آدمی

کو اپنے جس معاملہ کے اندر دل میں اطمینان اور سکون حاصل ہو جائے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ سچائی پر قائم ہے ﴿وَالْكِذْبَ رِيْبَةٌ﴾ اور جھوٹ تردد کا نام ہے۔

﴿ابوسفیان؛ ہرقل کے دربار میں﴾

نبی کریم ﷺ نے قیصرِ روم ہرقل کے نام دعوتِ اسلام دیتے ہوئے خط لکھا تھا، جب وہ خط اس کے پاس پہنچا تو اس خط کو کھول کر پڑھنے سے پہلے اس نے اس بات کا اہتمام کیا کہ جس شخصیت کی طرف سے یہ خط بھیجا گیا ہے وہ کون ہیں؟ ان کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ اس زمانہ میں قیصرِ روم شام آیا ہوا تھا اور اِدھر حجاز و مکہ مکرمہ سے اہلِ عرب کے قافلے تجارت کی غرض سے شام جایا کرتے تھے۔ اس نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ یہاں عربوں کا کوئی قافلہ آیا ہوا ہے؟ جواب دیا کہ ہاں آیا ہوا ہے۔ اس نے کہا: ان کو بلواؤ۔ ابوسفیان جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے ایک تجارتی قافلہ لے کر شام گئے تھے اور اس زمانہ میں مسلمانوں کے مقابل قریش کا جو گروہ تھا اس کے سردار یہی ابوسفیان تھے۔ ہرقل نے ان کو بلوایا اور پوچھا کہ تم لوگ وہیں کے رہنے والے ہو جن کی طرف سے یہ خط آیا ہے؟ جواب دیا کہ ہاں۔ پوچھا کہ تم ان کے حالات سے واقف ہو؟ جواب دیا: ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ تم میں ان کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان بولے: مَیں۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کے پردادا حضرت ہاشم ہیں اور ہاشم کے والد عبد مناف پر جا کر ابوسفیان کا نسب بھی مل جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ ہاشم کی اولاد میں سے ہیں اور ابوسفیان عبد شمس کی اولاد میں سے ہیں۔ بہرحال! اس وقت قافلہ والوں میں نبی کریم ﷺ کے سب سے زیادہ قریبی یہی تھے، ان کو آگے بٹھایا اور دوسرے ساتھیوں کو پیچھے بٹھایا اور کہا: مَیں ان سے کچھ سوالات

کروں گا، اگر یہ ان سوالات کا درست جواب دیں؛ تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر غلط جواب دیں؛ تو تم بتا دینا۔

﴿نبوی تعلیمات کا خلاصہ﴾

چنانچہ نبی کریم ﷺ کے حالات کی تحقیق کے سلسلہ میں اس وقت اس نے جو مختلف سوالات کئے تھے، ان میں ایک سوال یہ بھی تھا ﴿فَمَاذَا يَأْمُرُكُمْ﴾ یہ نبی تم کو کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟ تم کو کیا سکھلاتے ہیں؟ ابوسفیان فرماتے ہیں: مَیں نے جواب میں کہا: ﴿أُعْبُدُوا اللهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئاً﴾ یہ نبی ہمیں جن چیزوں کی تعلیم اور تاکید کرتے ہیں اور جن چیزوں کا حکم کرتے ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ایک اکیلے اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ ﴿وَاتْرُكُوا مَا يَقُولُ آبَائُكُمْ﴾ دوسرے یہ کہ تمہارے باپ دادا زمانۂ جاہلیت کے اندر جن عقائد کے قائل تھے ان سب چیزوں کو چھوڑ دو ﴿وَيَأْمُرُنَا بِالصَّلوٰةِ وَالصِّدْقِ﴾ اور یہ نبی ہم کو نماز کا اور سچائی کا حکم دیتے ہیں۔

بس! یہاں تو یہ حصہ اسی لئے لائے کہ نبی کریم ﷺ کی بنیادی تعلیمات کا خلاصہ ابوسفیان ہرقل قیصرِ روم کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اس میں خاص طور سے اس وصف ''سچائی'' کو بیان کیا۔

﴿وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ﴾ اور پاکدامنی یعنی اپنے آپ کو برائیوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچانے کا اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں کہ رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کا سلوک کرو۔

تو یہ ''سچائی'' وہ وصف تھا جو نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے اندر بنیادی اہمیت کا حامل

تھا؛اسی لئے ابوسفیان نے اس کا تذکرہ کیا۔

﴿غیر اختیاری مراتب بھی صدق کی بدولت حاصل ہو سکتے ہیں﴾

عن سھل بن حنیف رضی اللہ عنہ وھو بدری ان النبی ﷺ قال: مَنْ سَأَلَ اللہَ تَعَالیٰ الشَّھَادَۃَ بِصِدْقٍ؛ بَلَّغَہُ اللہُ مَنَازِلَ الشُّھَدَآءِ وَاِن مَّاتَ عَلیٰ فِرَاشِہٖ.

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ جو بدری ہیں فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ تبارک وتعالیٰ سے شہادت کا سوال کرے یعنی اللہ کے راستہ میں شہید ہونے کی تمنا کرے ﴿بِصِدْقٍ﴾ سچائی کے ساتھ۔

بس! یہاں اسی لئے لائے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ سچائی کا ایک تعلق عزم و ارادہ سے بھی ہے۔ بہت سی مرتبہ ایک چیز کی تمنا ہوتی ہے لیکن دل ڈانواں ڈول (ડાવાંડોળ) ہوتا ہے، تو وہ سچی تمنا نہیں ہوئی۔ ایک آدمی شہادت کی تمنا کرے اور سچے دل سے کرے یعنی ایسی دلی تمنا کہ اگر اس کو اس وقت شہادت مل جائے تو اس پر بہت خوش ہو۔ بعض مرتبہ لوگ اپنی زبان سے تو اظہار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ مقام نصیب فرمائے، لیکن کبھی کوئی موقعہ آجائے جس میں احتمال پیدا ہو کہ شہادت ملنے والی ہے؛ تو پھر پاؤں پیچھے ہٹاتے ہیں، یہ سچی تمنا کی علامت نہیں ہے۔ اسی لئے خاص طور پر فرمایا کہ جو آدمی شہادت کی تمنا سچے دل سے کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو شہیدوں کے مقام پر پہنچا دیتے ہیں؛ چاہے وہ اپنے بستر پر مرا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے جو مقامات و مراتب غیر اختیاری طور پر آدمی کو حاصل ہوتے ہیں، ان کی بھی کوئی آدمی اگر سچے دل سے تمنا کرتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو وہ مقام اور مرتبہ دیا جاتا ہے۔ اور شہادت حاصل ہونے میں بھی آدمی کے

اختیار کو دخل نہیں ہے، یہ ایک غیر اختیاری مرتبہ ہے۔

﴿حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کا ایک سفر﴾

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ کے نبیوں میں سے ایک نبی نے جہاد کی روانگی کا ارادہ فرمایا تو اپنے ساتھ وہ جس جماعت اور لشکر کو لے جا رہے تھے، اس کو انھوں نے تاکید کی کہ دیکھو! ہمارے ساتھ ایک تو وہ آدمی نہیں آ سکتا، جس نے ابھی نئ شادی کی ہے؛ اور وہ اپنی بیوی کو رخصت کر کے لانا چاہتا ہے۔ ایسا آدمی ہمارے ساتھ جہاد میں نہ آوے۔ اس لئے کہ جب وہ آئے گا؛ تو اس کا جی ادھر اٹکا ہوا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جب کوئی عمل شروع کرے تو اس عمل کو بھی سچائی کے ساتھ شروع کرنا چاہیے۔ یعنی اس طرح شروع کرے کہ اس کا جی اس عمل کے علاوہ اور اس عمل کے تقاضے کے خلاف کسی دوسری چیز میں ذرہ برابر بھی، چند پرسنٹ بھی اٹکا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔ گویا صد فیصد وہ اسی کام میں لگا ہوا ہو؛ تب اس کام کا حق ادا ہوا سمجھا جائے گا۔ اسی لئے اللہ کے اس نبی نے ایسے آدمی کو اپنے ساتھ جہاد کے لئے آنے سے منع کر دیا کہ ابھی اس کا نکاح ہوا ہے اور بیوی رخصت ہو کر نہیں آئی، اس لئے اگر وہ آدمی جہاد کے لئے آ بھی جائے گا؛ تب بھی اس کا بدن تو ساتھ ہوگا لیکن اس کا جی ادھر لگا ہوا ہوگا۔ تو اپنے عمل کے اندر جس قسم کی سچائی ہونی چاہیے؛ وہ نہیں پائی جائے گی۔

﴿وَلَا أَحَدٌ بَنَىٰ بُيُوتًا لَمْ يَرْفَعْ سُقُوفَهَا﴾ دوسرا وہ آدمی جس نے مکان تعمیر کیا اور ابھی اس کی چھت نہیں ڈالی، ایسا آدمی بھی ہمارے ساتھ نہ آئے۔ اس لئے کہ اس کے مکان کی تعمیر کا سلسلہ چل رہا ہے، اب اگر وہ جائے گا تو اس کا جی یہاں اٹکا ہوا ہوگا۔ لہٰذا اس عمل

کے لئے جس قسم کی سچائی اور پختگی چاہیے؛ وہ نہیں پائی جائے گی۔

یہاں بھی وہی بات ہے کہ آدمی جو بھی عمل اللہ تعالیٰ کے لئے کرے، وہ اس انداز سے کرنا چاہیے کہ اپنے آپ کو پورے طور پر اس عمل میں مشغول کردے۔ اس کا جی کسی دوسری چیز میں ذرہ برابر بھی اٹکا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔

﴿وَلاَ أَحَدٌ اِشْتَرىٰ غَنَماً أَوْ خَلِفَاتٍ وَهُوَ يَنْتَظِرُ أَوْلاَدَهَا﴾ تیسرا وہ آدمی جس نے کچھ بکریاں یا گابھن اونٹنیاں خریدی ہیں اور ابھی اونٹنیوں کے بچے پیدا نہیں ہوئے، بچے پیدا ہونے کا انتظار ہے، ایسے آدمی کو بھی انھوں نے منع کردیا کہ ہمارے ساتھ نہ آئے۔

یہاں اس قصہ کو لاکر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ ایسے آدمی جب بھی اس عملِ جہاد میں شریک ہوں گے، تو اس عمل میں شرکت کے لئے جس قسم کا پکا سچا ارادہ ہونا چاہیے؛ اس میں وہ پورے اترے ہوئے نہیں ہوں گے۔ ان کے جی میں کچھ دوسری طرف توجہ ہوگی۔

﴿خیانت کی نحوست﴾

اس کے بعد وہ نبی جہاد کے واسطے جس بستی پر جانا تھا اس پر چڑھائی کرنے کیلئے تشریف لے گئے۔ اس بستی کے قریب ایسے وقت پہنچے کہ عصر کا وقت تھا، اور سورج غروب ہونے میں زیادہ دیر باقی نہیں تھی، اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم یہ تھا کہ آج دن پورا ہو؛ اس سے پہلے پہلے اس بستی کو فتح کرلو۔ لہٰذا انھوں نے سورج کو خطاب کرتے ہوئے یوں کہا: ﴿اِنَّکَ مَأْمُوْرَةٌ وَأَنَا مَأْمُوْرٌ﴾ اے سورج! تجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم ہے یعنی تجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ بتلائے ہوئے حساب کے مطابق اپنا چکر پورا کرے۔ اور مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک حکم دیا ہے کہ تیرے غروب ہونے سے پہلے پہلے

اس بستی کو فتح کرلوں۔اب چونکہ وقت تھوڑا رہ گیا تھا اور اندیشہ یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سورج اس بستی کے فتح ہونے سے پہلے غروب ہو جائے، اس لئے انھوں نے دعا کی: اے اللہ! اس سورج کو روک لے اور جب تک کہ بستی فتح نہ ہو جائے تب تک سورج غروب نہ ہونے پائے ﴿فَحُبِسَتْ حَتّٰی فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیْہِ﴾ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمالی اور ان کے لئے سورج کو روک لیا؛ یہاں تک کہ وہ بستی فتح ہوئی۔اس کے بعد سورج غروب ہوا۔یہ حضرت یوشع بن نون کا قصہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین بنے تھے۔

﴿فَجَمَعَ الْغَنَائِمَ،فَجاءَ تْ–یَعْنِی النَّارَ–لِتَأْکُلَھَافَلَمْ تَطْعَمْھَا﴾ بستی کے فتح ہونے کے بعد انھوں نے مالِ غنیمت جمع کیا۔اور اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ جو مالِ غنیمت ہوتا تھا اس کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بلکہ ہوتا یہ تھا کہ جتنا بھی مالِ غنیمت ہو؛ وہ سب ایک جگہ رکھ دیا جائے۔اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آگ آتی تھی، اور اس کو جلا دیتی تھی۔آگ کا آکر اس مالِ غنیمت کو جلا دینا؛ یہ اس بات کی علامت اور نشانی سمجھی جاتی تھی کہ ان کا جہاد اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے۔

چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا کہ وہ سارا مالِ غنیمت جمع کیا جو لوگوں کے پاس سے لیا گیا تھا، اب آگ آئی لیکن آگ نے اس کو نہیں جلایا۔گویا یہ اس بات کی نشانی تھی کہ ابھی کچھ کمی رہ گئی ہے، اور اس کمی کو پورا کرنے اور ختم کرنے کی ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ عمل قبول نہیں ہوا۔

لہٰذا انھوں نے کہا کہ معلوم کرو کسی نے مالِ غنیمت میں خیانت کی ہے، کسی نے کوئی چیز چھپا رکھی ہے اور سارا مالِ غنیمت لاکر جمع نہیں کیا ہے، اس لئے یہ آگ آرہی ہے لیکن

مالِ غنیمت کو جلا نہیں رہی ہے۔اس لئے معلوم ہونا چاہیے کہ کس نے یہ حرکت کی ہے؟ چونکہ ان کی قوم کی مختلف جماعتیں اور قبیلے تھے اس لئے انھوں نے کہا کہ ہر قبیلے کا سردار آکر میرے ہاتھ سے ہاتھ ملائے۔ چنانچہ ہر قبیلے کا سردار آکران کے ہاتھ سے ہاتھ ملانے لگا۔ جس قبیلے کے آدمیوں نے خیانت سے کام لیا تھا اس قبیلے کے سردار نے جب ہاتھ ملایا تو اس کا ہاتھ اس نبی کے ہاتھ سے چپک گیا۔انھوں نے کہا: تمہارے قبیلے میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: تمہارے قبیلے کا ہر آدمی آکر مجھ سے ہاتھ ملائے۔ چنانچہ اب اس قبیلے کے ہر ہر آدمی نے ہاتھ ملانا شروع کیا تو دو یا تین آدمیوں کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چپک گیا۔انہوں نے کہا: بس! اصل گڑبڑ والے یہ ہیں۔ یہ دو یا تین آدمی پکڑے گئے۔ ان کو کہا کہ تم نے جو چیز چھپائی ہے وہ لاؤ۔ چنانچہ گائے کی سری کے برابر سونے کا ٹکڑا انھوں نے چھپا رکھا تھا، وہ لے آئے؛ اور مالِ غنیمت میں رکھا۔ وہ رکھنا تھا کہ آگ آئی اور اس کو جلا دیا۔ یہ اس بات کا اعلان وعلامت تھی کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا عمل قبول ہو گیا۔

امتِ محمدیہ کی ایک خصوصیت

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم سے پہلے جتنی امتیں تھیں ان میں سے کسی کے واسطے بھی اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کو حلال قرار نہیں دیا تھا۔ بلکہ وہی شکل ہوتی تھی کہ جہاد پورا ہونے کے بعد غنیمت کا سب مال ایک ڈھیر کی شکل میں جمع کیا جاتا تھا، آگ آتی تھی، اوراس کو جلا دیا کرتی تھی، لوگوں کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ پر یہ فضل فرمایا کہ اب امتِ محمدیہ کے لئے مالِ غنیمت کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ گویا نبی کریم ﷺ کو جن خصوصیات سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے نوازا تھا ان

خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی ﴿أُحِلَّتْ لَنَا الْغَنَائِم ﴾ (الترمذی ۴/۱۲۳،الحدیث ۱۵۵۳) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لئے مالِ غنیمت کو حلال قرار دیا گیا۔

﴿لین دین میں سچائی؛ برکت لانے والی ہے﴾

عن أبی خالد حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: اَلْبَيِّعَانِ بِالْخَيَارِ مَالَمْ يَتفرَّقَا

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب دو شخص آپس میں خرید وفروخت کا معاملہ کرتے ہیں تو جب تک انھوں نے اپنے معاملہ کو مکمل نہیں کیا۔یعنی ایک نے کہا کہ مَیں نے یہ چیز آپ کو بیچی۔ جب تک دوسرے نے جواب نہیں دیا تب تک اس کہنے والے کو بھی اپنی بات میں اختیار رہتا ہے۔ جواب دینے والے کو تو اختیار رہتا ہی ہے۔مثلاً مَیں نے آپ کو کہا کہ یہ کتاب مَیں نے آپ کو پانچ روپے میں بیچی۔اب آپ کو تو اختیار ہے ہی کہ آپ چاہیں تو یوں کہیں کہ مَیں نے خریدی اور چاہیں تو یوں کہیں کہ مجھے تو نہیں لینی۔لیکن جب تک آپ نے جواب نہیں دیا آپ کے جواب دینے سے پہلے پہلے مجھے بھی اختیار ہے۔یعنی آپ نے ابھی منظوری نہیں دی،اس سے پہلے مَیں کہہ دوں کہ اب مجھے نہیں بیچنی،تو مَیں یہ کہہ سکتا ہوں لیکن میرے قولِ اول کے بعد اگر آپ نے منظوری دے دی؛ تو اب مَیں اپنی بات کو واپس نہیں لے سکتا۔

﴿فَاِنْ صَدَقَا﴾ اب اگر یہ خرید وفروخت کرنے والے دونوں سچائی سے کام لیتے ہیں ﴿وَبَيَّنَا﴾ اور اپنے اس خرید وفروخت میں کوئی عیب کی چیز ہے تو اس کو صاف صاف بتلادیتے ہیں،تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿بُورِکَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا﴾ ان کے اس سودے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے برکت ڈال دی جاتی ہے۔گویا آدمی جب سودے کے

اندر سچائی سے کام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں برکت ہوتی ہے۔

﴿وَاِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرْكَةُ بَيْعِهِمَا﴾ اور اگر انھوں نے عیب کو چھپایا اور جھوٹ سے کام لیا؛ تو ان کے سودے کی برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اٹھالی جاتی ہے، یعنی اس میں کوئی خیر نہیں رہتی۔

﴿راز کی بات﴾

دراصل تجارت میں نفع تجارت کی کثرت سے ہوتا ہے۔ یعنی جتنی آپ کی تجارت بڑھے گی، اس میں جتنا فروغ ہوگا، جتنی ترقی ہوگی اتنا زیادہ منافعہ ہوگا۔ اور جب آپ اپنی تجارت کے اندر سچائی سے کام لیں گے، لوگوں کے ساتھ معاملہ ہمیشہ سچائی کا کریں گے اور کبھی ان کے ساتھ دھوکہ بازی نہیں کریں گے، تو آپ کی یہ سچائی اور دھوکہ بازی نہ کرنے کی وجہ سے لوگوں میں آپ کی ساکھ قائم ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ کثرت سے آپ کے ساتھ معاملہ کریں گے، آپ ہی کی دوکان پر آ کر خریدیں گے، آپ ہی سے معاملہ کریں گے کہ اس کے یہاں تو کبھی کوئی دھوکہ بازی نہیں ہوتی، جو بات ہوتی ہے وہ ٹھیک ٹھاک ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی تجارت کو خوب فروغ ملے گا، اور تجارت کا مقصد "برکت اور منافعہ" ہے؛ وہ حاصل ہوگا۔

اور اگر آدمی جھوٹ سے کام لیتا ہے اور تجارت میں دھوکہ بازی کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وقتی طور پر اس دھوکہ بازی اور جھوٹ کی وجہ سے کچھ دو چار پیسے زیادہ مل تو جائیں گے، لیکن یہ حال چھپنے والا نہیں ہے۔ بعد میں جا کر لوگوں کے سامنے جب یہ بات آئے گی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ کبھی اس کے ساتھ سودے بازی نہیں کریں گے، اس کی دوکان پر نہیں آئیں

گے، اوراس کے ساتھ تجارت نہیں کریں گے۔نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی تجارت ٹوٹ جائے گی، اورتجارت کا جومقصد ہے؛ وہ حاصل نہیں ہوگا۔اوروہ آدمی گھاٹے اورنقصان میں رہے گا۔

﴿خلاصۂ کلام﴾

گویا جوآدمی سچائی کواپنائے گا، چاہے سچائی کواپنانے کے نتیجہ میں بظاہر کتنا ہی نقصان نظر کیوں نہ آتا ہو؛ لیکن یہ نقصان ظاہری ہے۔یہی نقصان اس کو آگے پروان چڑھائے گا۔لوگوں کو جب معلوم ہوگا کہ اس نے اپنی بات کونبھانے کے واسطے اتنے لاکھوں کا نقصان برداشت کیا؛ تو یہی چیز اچانک اس کی تجارت کے لئے فروغ اورترقی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔اوراس کے بالمقابل اگروہ جھوٹ بول کر کچھ کرلے گا، تو وقتی فائدہ ضرور نظر آئے گا لیکن یہی چیز اس کے لئے ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جوتاجر اپنے سودے اورتجارت کے اندر سچائی کولازم پکڑے گا؛ تواس کے لئے وہ خیروبرکت کا سبب ہے۔

﴿ہم نے بھی کسی کے ساتھ لین دین کیا ہے﴾

یہاں پر علماء لکھتے ہیں کہ دیکھو! ہم جتنے بھی اہلِ ایمان ہیں، ہم نے بھی ایک تجارت کی ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَریٰ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَأَمْوَالَھُمْ بِأَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ﴾ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے ان کے جان ومال کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔گویا ہم نے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک تجارت کی ہے، اب ہمیں بھی اپنی اس تجارت کے اندر سچائی سے کام لینا چاہیے کہ اپنی جان و مال کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستہ میں لگانے میں کوتاہی اورکمی نہیں کرنا چاہیے۔گویا اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کے لئے آدمی اپنے آپ کو وقف کردے

تو پھراس تجارت میں- جواللہ تعالیٰ کے ساتھ کی ہے- خیر و برکت ہوگی۔اوراگرایسانہیں کرتا؛ تو پھرظاہر ہے کہ وہ آدمی گھاٹے میں رہے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ عمل کی توفیق عطافرمائے

مراقبہ
مجلس ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿مراقبہ ۱﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً

امابعد. فاعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

وقال تعالیٰ: اَلَّذِیْ یَرَاکَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَکَ فِی السَّاجِدِیْنَ. (الشعراء. ۲۱۹،۲۲۰)

وقال تعالیٰ: وَھُوَمَعَکُمْ اَیْنَمَاکُنْتُمْ. (الحدید. ۴)

وقال تعالیٰ: اِنَّ اللّٰہَ لاَ یَخْفیٰ عَلَیْہِ شَیْئٌ فِی الْأَرْضِ وَلاَ فِی السَّمَآءِ. (آل عمران. ۶)

وقال تعالیٰ: اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ. (الفجر. ۱۴)

وقال تعالیٰ: یَعْلَمُ خَآئِنَۃَ الْأَعْیُنِ وَمَاتُخْفِی الصُّدُوْر. (غافر. ۱۹)

﴿مراقبہ کا معنٰی﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے مراقبہ کا باب قائم کیا ہے ﴿راقب یراقب مراقبۃً﴾ کا معنٰی ہے نگرانی کرنا، کسی کا خیال رکھنا، کسی کی نقل وحرکت کو دیکھتے رہنا اوراس کی حفاظت کرنا، اس کو نوٹ کرنا۔ اگرایک معشوق کے دوعاشق ہوں تو ان کو بھی اردو زبان میں ''رقیب'' کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہرایک دوسرے کی نگرانی کرتا ہے، ٹوہ میں لگا رہتا ہے کہ وہ کہاں جارہا ہے؟ کیا کررہا ہے؟ شاعر کہتا ہے:- ؎

کیسے گلے رقیب کے، کیا طعن اقرباء ❁ تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے بھی لفظِ رقیب صفت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی تمام نقل وحرکت کو، ان کے ہر قول وفعل کو دیکھ رہے ہیں اور اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے اقوال افعال، حرکات وسکنات کی نگرانی کیلئے کچھ فرشتے مقرر کئے گئے ہیں؛ ان کے لئے بھی قرآنِ پاک میں لفظِ رقیب استعمال کیا گیا ہے: ﴿مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡهِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ﴾ بندہ جو بھی بات کرتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نگران مقرر کر دیا گیا ہے؛ جو ہر چیز کی نگرانی کرتا ہے۔ تو یہاں مراقبہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس بات کا تصور کرے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ میرے ہر قول وفعل کو، میری ہر نقل و حرکت کو اور میری ہر چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ گویا میں اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں اور اس کی نگاہوں کے سامنے ہوں۔ ہر وقت ہر لمحہ چوبیس گھنٹے آدمی اپنے آپ کو ایسا محسوس کرے اور یہ استحضار ہو۔ اسی استحضار کو "مراقبہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن وحدیث میں یہ لفظ عام طور پر اسی معنٰی میں استعمال ہوتا ہے۔

﴿رقیب کے تین اوصاف﴾

علماء نے لکھا ہے کہ مراقبہ کما حقہٗ اور حقیقی معنٰی میں اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب اس نگرانی کرنے والے میں تین اوصاف ہوں۔

(۱) ایک تو اس کو نگرانی اور حفاظت کا استحقاق حاصل ہو یعنی وہ اس کی نگرانی کا حق رکھتا ہو۔

(۲) دوسرا اس نگرانی کرنے والے کا علم ایسا کامل، محیط اور گھیرے ہوئے ہو کہ جس کی وہ نگرانی کر رہا ہے اس کی کوئی حرکت، اس کا کوئی قول، اس کا کوئی فعل اس نگرانی کرنے والے کی نگاہ

اورعلم سے چھپ نہ سکے؛ چاہے وہ کتنے ہی پردوں میں اور کتنے ہی چھپ چھپا کر کوئی حرکت کرنا چاہے۔

(۳) تیسرا یہ کہ جس کی وہ نگرانی کررہا ہے اس پر کامل طور پر اختیار اور قدرت حاصل ہو۔

اب اس نگرانی کی صورت میں دو ہی باتیں سامنے آسکتی ہیں، جس کی نگرانی کی جارہی ہے اس کی طرف سے یا تو کسی اچھے فعل کا صدور ہورہا ہے اور نیکی وجود میں آرہی ہے، یا اس سے کسی برے فعل کا صدور ہورہا ہے اور گناہ کا کام وجود میں آتا ہے۔ تو اس نگرانی کرنے والے کو اتنی قدرت اور ایسا اختیار حاصل ہے کہ وہ اس نیکی کرنے والے کو اس کی نیکی کا اچھا بدلہ، اور گناہ کرنے والے کو اس گناہ کی سزا دینے کی قدرت رکھتا ہو؛ تب ہی یہ نگرانی پورے طور پر ہوسکتی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں یہ تینوں اوصاف بکمالہ موجود ہیں جو مراقبہ کے لئے ایک لازمی چیز سمجھے جاتے ہیں کہ جب تک یہ اوصاف نہ ہوں مراقبہ کامل نہیں ہو پاتا۔ انسان کیا؛ بلکہ ساری کائنات کا پیدا کرنے والا خالق اور مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، اس لئے بندے پر اس کو ہر طرح کا استحقاق حاصل ہے۔

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم بھی محیط ہے، ہر وہ چیز جو دنیا میں وجود میں آرہی ہے، چاہے اندھیرے میں کسی درخت کا کوئی پتہ ٹوٹ کر گرتا ہے؛ تو وہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس کا علم بھی بڑا محیط اور تام ہے۔

اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت اور اختیار پر مؤمن کا ایمان ویقین ہے کہ اس کو ہر طرح کی قدرت واختیار حاصل ہے۔ یہ تینوں اوصاف مراقبہ کے مکمل ہونے

کے لئے لازمی سمجھے جاتے ہیں؛ جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں پورے طور پر موجود ہیں لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو نگرانی اور مراقبہ ہوگا؛ وہ کامل طور پر ہوگا۔

﴿مراقبہ کے تعلق سے آیاتِ قرآنی﴾

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ ان آیات کو پیش کرتے ہیں جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہونے والی نگرانی کا پتہ چلتا ہے، اگر چہ ایسی آیتیں تو کئی ہیں لیکن انھوں نے چند آیتوں کو بطورِ نمونہ پیش کیا ہے: ﴿اَلَّذِیْ یَرَاکَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَکَ فِی السَّاجِدِیْنَ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جب آپ نماز کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو دیکھتا ہے، اور نمازیوں کے درمیان آپ کی جو نقل وحرکت ہوتی ہے، آپ جو رکوع وسجود کرتے ہیں؛ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم آپ کی ہر نقل وحرکت کو محیط ہے۔

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ تم جہاں کہیں بھی ہو؛ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے ساتھ ہے، وہ ہر جگہ حاضر وناظر اور موجود ہے۔ وہ تمہاری ہر چیز کو دیکھ رہا ہے اور تمہاری ہر نقل و حرکت سے واقف ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ لاَ یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْئٌ فِی الْأَرْضِ وَلاَ فِی السَّمَآءِ﴾ زمین اور آسمان میں کوئی چیز بھی اللہ تبارک وتعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ یعنی مراقبہ کے مکمل ہونے کے لئے جس علمِ تام کی ضرورت تھی؛ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں پایا جاتا ہے۔

﴿اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہاری گھات میں لگا ہوا ہے۔ ''رصد'' گھات لگانے کو کہتے ہیں یعنی کسی کی ایسی نگرانی کرنا کہ اس کے بعد اس کے برے فعل پر یا

اس کی طرف سے جو زیادتی اور کوتاہی ہو رہی ہے؛ اس پر سزا بھی دے۔ اسی کو تعبیر کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ گھات میں لگے ہوئے ہیں یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کو تمہاری ہر نقل وحرکت پر بدلہ دینے اور سزا دینے کی پوری قدرت اور اختیار حاصل ہے۔

﴿ نگاہِ انسانی؛ خدائی نگرانی میں ﴾

﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَاتُخْفِي الصُّدُوْر﴾ آدمی کی آنکھیں جن چیزوں میں خیانت کرتی ہیں یعنی ایسی چیز جس کے دیکھنے کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے منع کیا ہے، مگر آدمی اس کو دیکھتا ہے؛ اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے بھی واقف ہے۔ آدمی کی یہ ایک ایسی حرکت ہے کہ عام طور پر اس سے دوسرے لوگ واقف نہیں ہو سکتے، بڑے سے بڑے مجمع میں بیٹھ کر بھی آدمی یہ کام بہت چوری سے کر سکتا ہے، کسی پاس بیٹھنے والے کو بھی پتہ نہ چلے؛ لیکن اللہ تعالیٰ انسان کی نگاہ کو بھی اپنی نگرانی میں رکھے ہوئے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آدمی اپنے دل میں جو خیالات سوچتا ہے اس سے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ واقف ہیں۔

﴿ حدیثِ جبرئیل ﴾

اس سلسلے میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی وہ روایت پیش کی جو پہلے بھی گذر چکی ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں آپ کی مجلسِ مبارک میں حاضر تھے کہ ایک آدمی آیا، جس کے کپڑے بہت زیادہ سفید تھے، اور اس کے بال بہت زیادہ سیاہ تھے، اور اس کے اوپر سفر کے بھی کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے، اور ہم میں سے کوئی پہچانتا بھی نہیں تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے حالات بڑے متضاد تھے۔ اس لئے کہ اس کے کپڑے بڑے سفید اور اس کے اوپر سفر کا کوئی اثر بھی نہیں، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ

کوئی مقامی آدمی ہے، حالانکہ مقامی ہوتا تو لوگ اس کو پہچانتے، لیکن ہم میں سے کوئی پہچانتا بھی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آکر اتنا قریب ہوکر بیٹھا کہ اس نے اپنے گھٹنوں کو نبی کریم ﷺ کے گھٹنہ مُبارک کے ساتھ ملا دیا اور اپنے ہاتھ نبی کریم ﷺ کی رانوں کے اوپر رکھ دیئے۔

﴿اسلام کیا ہے؟﴾

پھر اس نے سوال کیا: ﴿یَامُحَمّدُ! أَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ؟﴾ اے محمد! مجھے اسلام کے متعلق بتلایئے؟ اس لئے کہ دین کے دو اجزاء ہیں، عقائد اور اعمال۔ عقائد کا تعلق دل سے ہے؛ اس کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اعمال کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہے؛ جس کو اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ لفظِ اسلام پورے دین کے لئے بھی بولا جاتا ہے لیکن اس روایت میں انھوں نے جو سوال کیا تھا وہ اعضاء و جوارح کے اعمال کے متعلق ہی کیا تھا، اس لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ توحید و رسالت کا اقرار کرنا؛ یہ زبان کا عمل ہے۔ اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ کو ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو؛ اگر وہاں تک پہنچنے کی تمہارے اندر طاقت ہو۔ یعنی زاد و راحلہ، سواری و توشہ اور ساتھ ہی ساتھ خرچہ بھی موجود ہے؛ تو حج کرنا بھی ضروری قرار دیا گیا۔ یہ پانچ بنیادی چیزیں اعمال کے متعلق ذکر کی گئیں۔ اس آدمی نے کہا: ﴿صَدَقْتَ﴾ آپ نے ٹھیک جواب دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ﴿فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ﴾ ہمیں اُس آدمی کی اِس روش اور انداز پر بڑا تعجب ہوا کہ

سوال بھی کرتا ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے۔ اس لئے کہ سوال کرنا تو اس بات کی علامت سمجھا جاتا ہے کہ آدمی جانتا نہیں ہے۔ اور تصدیق کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ واقف ہے، اسی لئے تو تصدیق کر رہا ہے۔

﴿ ایمان کیا ہے؟ ﴾

﴿قَالَ فَأَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ﴾ اس کے بعد اس آنے والے نے نبی کریم ﷺ سے دوسرا سوال ایمان کے متعلق کیا کہ آپ ایمان کی حقیقت بتلایئے۔ گویا جو چیزیں عقائد کے متعلق ہیں؛ وہ پوچھیں ﴿قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ﴾ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک تو اللہ کے اوپر ایمان ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق جو چیزیں ہیں ان پر تمہارا ایمان ہو، اور اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر جو اس نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے واسطے اپنے نبیوں پر اتاری ہیں، اور اس کے رسولوں پر، اور قیامت کے دن پر، اور تقدیر پر ایمان ہونا چاہیے؛ چاہے وہ بھلی ہو یا بری۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں بندے کو پیش آتی ہیں، چاہے وہ اچھائی اور نعمت کی شکل میں ہوں، یا برائی اور مصیبت کی شکل میں ہوں؛ اس پر ایمان ہونا چاہیے۔ یہ ایمان کی حقیقت بتلائی ﴿قَالَ صَدَقْتَ﴾ اس نے پھر یہی کہا کہ آپ نے ٹھیک جواب دیا۔

﴿ احسان کیا ہے؟ ﴾

﴿قَالَ فَأَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ﴾ اس آدمی نے تیسرا سوال نبی کریم ﷺ سے احسان کے متعلق کیا کہ احسان کس کو کہتے ہیں؟ ﴿قَالَ اَنْ تَعْبُدَاللّٰہَ کَأَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ﴾ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ بات تمہارے اندر پیدا کرنا مشکل ہو، اور ابھی یہ چیز تمہیں حاصل نہیں،

تو کم سے کم درجہ جو ہر ایک مؤمن کو حاصل ہے اور ہر مؤمن کا ایمان ویقین ہے کہ اللہ تعالیٰ تو مجھے دیکھ ہی رہے ہیں۔اسی کو مراقبہ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ بندہ ہروقت یہ سمجھے کہ مَیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگرانی میں ہوں۔جو آدمی اس تصور کو ہمیشہ قائم رکھے گا؛کبھی بھی وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔

﴿قیامت کب آئے گی؟﴾

پھر اس آدمی نے سوال کیا:﴿فَأَخْبِرْنِیْ عَنِ السَّاعَةِ﴾ قیامت کے متعلق مجھے بتلائیے کہ کب آنے والی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:﴿مَاالْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ﴾ جس سے سوال کیا جارہا ہے (یعنی مَیں) سوال کرنے والے (یعنی آپ) سے زیادہ نہیں جانتا۔مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہیں معلوم نہیں کہ قیامت کب آئے گی،اسی طرح مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔

پھر اس نے کہا: قیامت کی کچھ نشانیاں ہوں تو اس کے متعلق اطلاع دیجئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:﴿اَنْ تَلِدَالْأَمَةُ رَبَّتَهَاوَاَنْ تَرىٰ الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَآءَ الشَّآءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْيَانِ﴾ ایک تو یہ ہے کہ تم یہ دیکھو کہ باندی اپنی آقانی کو جنم دے رہی ہے یعنی ماں نے جس کو جنم دیا ہے، آگے جا کر وہی بچی اس ماں پر حکومت چلاوے اور اس پر مالک بن کر بیٹھ جاوے اور تم دیکھو ایسے لوگوں کو جو برہنہ ہیں کہ جسم پر لباس نہیں اور پیروں میں جوتے نہیں ہیں اور ایسے فقیر جو بکریوں کے چرانے والے ہیں وہ عمارتوں کے بنانے میں آپس میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں۔یعنی ایسے لوگ جو معاشرے میں نچلے درجے کے سمجھے جاتے ہیں ان کے پاس دولت کی ریل پیل ایسی ہوجائے کہ اس دولت کے نتیجہ میں وہ عمارتوں کی تعمیر میں آپس میں ایک دوسرے سے ریس کرنے لگیں۔

اسی لئے بعض روایتوں میں آتا ہے کہ جو نچلے درجے کے لوگ ہیں وہ اوپر پہنچ جائیں گے اور جو شرفا اور اونچے خاندان کے لوگ تھے وہ نیچے بن جائیں گے، اور ان پر گھٹیا درجے والوں کی حکومت ہوگی۔

﴿سوال علم کا دروازہ﴾

﴿ثُمَّ انْطَلَقَ﴾ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ وہ آدمی یہ سوال کر کے چلا گیا ﴿فَلَبِثْتُ مَلِيًّا﴾ کچھ زمانہ بعد نبی کریم ﷺ نے مجھ سے پوچھا: ﴿أَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ؟﴾ تمہیں معلوم ہے یہ سوال کرنے والے کون تھے؟ میں نے عرض کیا: ﴿أَللهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ﴾ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے جو تمہارے پاس آئے تھے تا کہ تم کو دین کے متعلق کچھ تعلیم دیں۔ سوالات کے ذریعہ انھوں نے دین کا خلاصہ امت کے سامنے پیش کر دیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو انسانی شکل میں بھیجا تھا۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ عام طور پر اسلامی احکام اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں انسان کی ہدایت کے لئے بھیجی گئی تھیں؛ وہ سب مکمل ہوگئی تھیں، اب گویا دین کا خلاصہ چند الفاظ میں لوگوں کو بتلانا مقصود تھا، تو اس قسم کا سوال پیش کرنے کیلئے اور نبی کریم ﷺ کی زبان سے دین کی بنیادی چیزیں لوگوں کو معلوم ہو جائیں؛ اس لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔ گویا سوال بھی کبھی آدمی کیلئے علم کے دروازے کھولتا ہے، اسی لئے سوال کو آدھا علم قرار دیا گیا ہے۔

﴿دوسری روایت﴾

عن أبی ذر جندب بن جنادة وأبی عبدالرحمن معاذبن جبل رضی اللہ عنہ عن رسول الله ﷺ قال: اِتَّقِ اللهَ حَيْثُمَا كُنْتَ، وَاتَّبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ.

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہاں کہیں بھی تم رہو؛ اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ گویا اللہ تعالیٰ کا ڈر اور اس کے سامنے جواب دہی کا استحضار تمہارے اندر رہنا چاہیے، یہ احساس ہر وقت رہے کہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کو جواب دینا ہے؛ تب ہی تو ڈر رہے گا۔

اور برائی کے بعد نیکی کرو، وہ نیکی اس برائی کو مٹادے گی۔ ویسے تو ایک بندہ ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب بالکل نہ کرے لیکن چونکہ آدمی کی سرشت اور طبیعت میں ایسا مادہ رکھا گیا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی صادر ہو ہی جاتی ہے یا برائی وجود میں آ ہی جاتی ہے، تو اگرچہ اس کا ارادہ تو نہیں تھا، نادانستہ طور پر، بشریت کے تقاضے کی بناء پر یا نفس کے تقاضے سے مغلوب ہو کر اگر کسی برائی کا صدور ہو گیا، کوئی گناہ کا کام ہو گیا تو نبی کریم ﷺ اس کی تلافی کی تدبیر بتلاتے ہیں کہ آدمی اس کے بعد کوئی نیکی کا کام کرلے، تا کہ وہ نیکی اس برائی کو مٹادے۔ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں۔ لہٰذا اگر کسی سے کوئی گناہ کا صدور ہو جائے تو اس گناہ سے توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیے کہ نیکی کا کوئی کام کرلے، تا کہ اس کی تلافی ہو جائے۔ جیسے کبھی ہوتا ہے کہ کسی چھوٹے بچے کو ہم نے کوئی تکلیف پہنچادی، اس کی پٹائی کردی، تو جہاں اس کی تسلی کرتے ہیں، وہیں ساتھ ہی ساتھ چاکلیٹ بھی دے دیتے ہیں؛ تا کہ اس کی تلافی ہو جائے۔ اسی طرح آدمی کو عمل کرنا چاہیے۔

﴿ گناہ پر پینلٹی ﴾

احادیث میں بہت سے مواقع پر ایسا بتلایا گیا ہے۔ مثلاً زمانۂ جاہلیت میں جوے کا

رواج عام تھا،اس لئے عادی ہونے کی وجہ سے جہاں کچھ فراغت اور فرصت ملی، وہ ایک دوسرے کو دعوت دیتے تھے کہ آؤ! ذرا ایک دو داؤ کھیل لیں۔پھر جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جوے کی حرمت آئی اور منع کیا گیا تو اس پرانی عادت کی وجہ سے آدمی کی زبان سے یہ جملہ نکل جاتا تھا۔نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی کسی کو یہ کہہ دے کہ آؤ! ذرا ہم جوا کھیل لیں،تو اس کی تلافی یہ ہے کہ وہ صدقہ کرے۔یعنی جب جیب میں ذرا پیسے ہوتے ہیں؛تب ہی دل میں یہ امنگ اٹھتی ہے کہ جوا کھیلا جائے۔اس لئے جیب میں پیسے ہونے کی وجہ سے تمہارے دل میں یہ خیال آیا،اگرچہ بھول سے تمہاری زبان سے یہ نکل گیا لیکن اس کی تلافی یہ ہے کہ وہ پیسے جس کے متعلق تم نے یہ سوچا تھا اور جس کے ہونے کی وجہ سے تمہارے دل میں یہ تقاضہ پیدا ہوا تھا کہ جوا کھیلا جائے؛ان پیسوں کو ہی اللہ کے راستے میں صدقہ کردو

آدمی کے واسطے یہ ایک بہت عمدہ طریقہ ہے کہ جہاں کبھی کسی گناہ کا ارتکاب ہو گیا ہو،تو اس گناہ سے توبہ کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ کسی نیکی کا بھی اہتمام کرلے۔ویسے توبہ خود بھی ایک نیکی ہی ہے اور وہ بھی گناہ کو مٹانے کا کام کرتی ہے لیکن اس کے بعد مزید الگ سے نیکی کرلی جائے؛تو اور زیادہ اچھا ہے۔

پھر نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آیئے یعنی لوگوں کے ساتھ تمہارا معاملہ،تمہارا سلوک اور برتاؤ بھلائی کا ہونا چاہیے۔کسی کے ساتھ بداخلاقی سے پیش نہ آیئے۔

﴿پیغمبرِ عالم ﷺ،ایک نونہال،اور بنیادی عقائد﴾

عن ابن عباس قال: کنتُ خَلفَ النّبیِّ ﷺ یوماً،فقَالَ: یاغُلامُ!اِنّیِ اُعلِّمُکَ کَلِمَاتٍ،اِحفَظِ اللہَ یَحفَظُکَ،اِحفَظِ اللہَ تَجِدہُ تُجاھَکَ،وَاِذاسَأَلتَ فَاسئَلِ اللہَ،

وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ.وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّۃَ لَواجْتَمَعَتْ عَلیٰ اَن یَّنفَعُوْکَ بِشَیْئٍ لَمْ یَنْفَعُوْکَ اِلَّابِشَیْئٍ قَدْ کَتَبَھَااللّٰہُ لَکَ،وَاِنِ اجْتَمَعُوْاعَلٰی اَن یَّضُرُّوْکَ بِشَیْئٍ لَمْ یَضُرُّوْکَ اِلَّا بِشَیْئٍ قَدْ کَتَبَھَااللّٰہُ عَلَیْکَ.رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجُفَّتِ الصُّحُفُ.

وفی روایۃ غیر الترمذی:اِحْفَظِ اللّٰہَ تَجِدْہُ اَمَامَکَ،تَعَرَّفْ اِلیٰ اللّٰہِ فِی الرَّخَاءِ یَعْرِفُکَ فِی الشِّدَّۃِ،وَاعْلَمْ اَنَّمَااَخْطَأَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُصِیْبَکَ،وَمَاأَصَابَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُخْطِئَکَ.وَاعْلَمْ اِنَّ النَّصْرَمَعَ الصَّبْرِ،وَاِنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْکَرَبِ،فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِیُسْرًااِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا (وہ چھوٹے بچے تھے، زیادہ عمر نہیں تھی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے بچے! مَیں تمہیں چند باتیں سکھلاتا ہوں۔

دیکھئے! یہ باتیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو سکھلائی جارہی ہیں جو اس وقت بچپن ہی کے دور سے گزر رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس قسم کی چیزوں کا بچوں کو عادی بنانا چاہیے، اور لوگوں کو چاہیے کہ بچوں کو ایسی نصیحتیں کرتے رہیں؛ تاکہ ان کی ذہن سازی ہو شروع ہی سے وہ نیکی کے عادی بنیں اور اچھے اخلاق کی طرف ان کی توجہ ہو۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جن چیزوں کی تاکید فرمائی ان میں سے یہ بھی ہے ﴿اِحْفَظِ اللّٰہَ یَحْفَظْکَ﴾ تم اللہ تبارک وتعالیٰ کا خیال رکھو یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرتے رہو، اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارا خیال رکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری کوئی بھی ضرورت ہوگی تو باری تعالیٰ پوری فرمائیں گے۔ ویسے تو آدمی کی ضرورتیں اللہ تبارک وتعالیٰ ہی پوری کرتے ہیں لیکن اگر آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کے حقوق کا اہتمام کرے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بھی اس کے ساتھ خصوصی معاملہ کیا جاتا ہے۔

﴿اِحْـفَـظِ اللہَ تَـجِدْہُ تُجَاھَکَ﴾ اللہ تعالیٰ کے حقوق کا لحاظ کرو اور اس کی نگرانی کا خیال رکھو؛ تم اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ یعنی یہ تصور قائم رہنا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، اس تصور کے قائم رہنے کی وجہ سے کبھی کسی گناہ پر جرأت نہیں ہوگی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی حکم کو توڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔

﴿وَاِذَا سَــأَلْـتَ فَـاسْـئَلِ اللہَ﴾ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو، کوئی سوال کرنا ہو؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے سوال کرو، وہی دینے والے ہیں۔ لوگ بھی جو دیتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ اسی میں سے دیتے ہیں، وہ ان کی اپنی ملک نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دل میں جذبہ ڈالا اور ان کو ذریعہ بنایا۔ تو حقیقت یہی ہے کہ آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی سے سوال کرنا چاہیے۔ اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں: تم سوال کرو تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے سوال کرو۔

دیکھو! یہ بنیادی چیزیں ہیں اور نبی کریم ﷺ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو تعلیم کے طور پر ارشاد فرمارہے ہیں جو اس وقت بچے تھے۔ معلوم ہوا کہ بچپن ہی سے بچوں کے دلوں میں یہ چیز ڈالنی چاہیے، ان کو اس بات کا عادی بنانا چاہیے، اور ان کو اس چیز کی طرف متوجہ کرنا چاہیے

﴿وَاِذَا اسْتَعَـنْـتَ فَـاسْتَعِنْ بِاللہِ﴾ اور اگر کسی مصیبت میں اور ضرورت کے موقعہ پر مدد چاہنی ہو؛ تو کسی اور سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے چاہو۔

﴿وَاعْـلَـمْ اَنَّ الْاُمَّۃَ لَوِاجْتَمَعَتْ عَلٰی اَنْ یَّنْفَعُوْکَ بِشَیْئٍ لَمْ یَنْفَعُوْکَ اِلَّا بِشَیْئٍ قَـدْ کَتَبَـھَا اللہُ لَکَ﴾ اور اس بات کا یقین رکھو کہ سارے لوگ اگر اس بات پر متفق ہو جائیں کہ تم کو کسی چیز کے ذریعہ سے فائدہ پہنچائیں، تو وہ اتنا ہی فائدہ پہنچا سکیں گے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے، اس سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔

﴿وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْکَ بِشَیْئٍ لَمْ یَضُرُّوْکَ اِلَّا بِشَیْئٍ قَدْ کَتَبَھَا اللّٰہُ عَلَیْکَ﴾ اور اگر وہ اس بات پر متفق ہو جائیں کہ تم کو کوئی نقصان پہنچائیں تو وہ تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اتنا ہی جتنا اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر فرمایا ہے۔ اس لئے تمہاری نگاہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے، چاہے تمہیں مخلوق کی طرف سے نفع پہنچے یا نقصان پہنچے۔ اگر نقصان پہنچے تو بندے سے بدلہ لینے کے خیالات تمہارے دل میں پیدا نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ یوں سوچے کہ اس کے دل میں جو نقصان پہنچانے کا جذبہ پیدا ہوا وہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کے پیدا کرنے کی وجہ سے ہوا۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ چیز آئی ہے، لہٰذا اس موقعہ پر استغفار کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے

﴿ایک دور اندیشانہ بات﴾

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

گر گزندت رسد ز خلق مرنج ❋ کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

از خدا داں خلافِ دشمن و دوست ❋ کہ دلِ ہر دو درتصرّفِ اوست

گرچہ تیر از کماں ہمی گذرد ❋ از کماں دار بیند اہلِ خرد

(گلستاں سعدی، باب ۱، صفحہ ۵۲)

اگر تم کو کسی کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس کی وجہ سے تمہیں رنجیدہ و پریشان ہونے کی اور دکھ میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ مخلوق کا معاملہ تو ایسا ہے کہ اس کی طرف سے نہ تو تم کو راحت پہنچ سکتی ہے نہ دکھ پہنچ سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے، دوست یا دشمن کی طرف سے جو کچھ بھی ہو، اس کو اللہ تعالیٰ

کی طرف سے سمجھو اس لئے کہ ہر ایک کا دل اسی کے قبضے میں ہے، اس کے دل میں تم کو نقصان پہنچانے کا جذبہ پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اور اس کے دل میں تمہیں راحت پہنچانے کا جذبہ پیدا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ لہٰذا تمہاری نگاہ اس پر نہیں ہونی چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہونی چاہیے۔

اسی لئے تیسرے شعر میں عجیب وغریب مثال دی کہ دیکھو! جب کمان میں سے تیر نکلتا ہے تو آنکھیں تو یہ دیکھ رہی ہیں کہ تیر کمان میں سے نکل کر ہم تک آیا، لیکن جو سمجھ دار لوگ ہیں وہ کمان کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں سمجھتے، بلکہ جو آدمی اس کمان کو استعمال کر رہا ہے، جس کے ہاتھ میں وہ کمان ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ اصل تو تیر چلانے والا وہ ہے۔ کمان تو ایک ذریعہ اور ایک آلہ ہے۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو ایک بنیادی چیز بتلا دی کہ اگر ساری مخلوق اس بات پر جمع اور متفق ہو جائے کہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچائے تو وہ اس سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتے جتنا اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر فرما رکھا ہے۔ اور اگر ساری مخلوق اس بات پر متفق ہو جائے کہ تمہیں کچھ نقصان پہنچائے تو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر فرما رکھا ہے۔ گویا مؤمن کی نگاہ تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہونی چاہیے۔ اسی لئے عام طور پر اگر کسی کی طرف سے کوئی راحت پہنچتی ہے تو بہت سے ظاہر بیں لوگ اسی کو مقصود بنانا شروع کر دیتے ہیں۔

ویسے شریعت کی تعلیم اپنی جگہ پر یہ بھی ہے کہ جو ذریعہ اور واسطہ بنا ہے اس کا بھی شکریہ ادا کیجئے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: جس نے لوگوں کا شکر ادا نہیں کیا اس نے اللہ تعالیٰ

کا بھی شکرادانہیں کیا، لہٰذا اس کا شکریہ ضرور ادا ہونا چاہیے۔لیکن آدمی یہ سمجھے کہ یہ چیز اس نے نہیں دی بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات اس کے دل میں ڈالی۔

اسی طرح اگر کسی کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچی تو اس تکلیف کو دور کرنے کی تدبیر ضرور کرنی چاہیے۔لیکن یہ نہ سمجھے کہ یہی کافی ہے، بلکہ سمجھے کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی ہے۔یہ چیز اگر آدمی یقین کے ساتھ سمجھنے لگے تو اس صورت میں بہت ساری مشکلات بھی حل ہوجاتی ہیں، اور بہت ساری پریشانیوں سے نجات بھی مل جاتی ہے۔

بعض لوگ ہمیشہ اسی اُدھیڑ بُن میں رہتے ہیں کہ فلاں نے مجھے گالی دی، فلاں نے مجھے یہ کیا اور فلاں نے یہ کیا۔آج اِس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، کل اُس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔اپنے سارے اوقات اسی میں لگارہے ہیں اور اپنے آپ کو اسی میں برباد کررہے ہیں۔حالانکہ ان لوگوں کا بجز اس کے اور کوئی عمل دخل نہیں کہ ایک ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔آدمی کو ایسے موقعہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، استغفار اور توبہ کا اہتمام کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ سے اس مصیبت کے دور ہونے کے لئے دعا ودرخواست کرنی چاہیے۔اور لوگوں سے تعرض کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ہاں! جو مناسب اور درست تدبیریں ہوں اور جن کی شریعت نے اجازت دی ہو؛ ان کو اختیار کرنا چاہیے۔

﴿ کوئی نئی چیز ہونے والی نہیں ہے ﴾

﴿رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجُفَّتِ الصُّحُفُ﴾ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: قلم اٹھالئے گئے اور صحیفے خشک ہوگئے۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو فیصلہ ہونا تھا وہ ہوچکا ہے، کوئی نئی چیز ہونے والی نہیں ہے، جو راحت یا جو تکلیف پہنچنے والی ہے وہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے طے ہو چکی ہے، اب اس میں کوئی کمی بیشی ہونے والی نہیں ہے۔اس لئے آدمی کو ہمیشہ اپنی نگاہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر رکھنی چاہیے۔

اسی کو ترمذی شریف کے علاوہ دوسری روایت میں یوں فرمایا گیا ہے: ﴿وَاعْلَمْ اَنَّمَا أَخْطَأَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُصِیْبَکَ وَمَاأَصَابَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُخْطِئَکَ﴾ جو چیز تم کو نہیں پہنچی یعنی کوئی مصیبت آرہی تھی لیکن دور ہوگئی؛ تو یہ پہنچنے والی بھی نہیں تھی۔اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں یہ طے تھا کہ یہ پہنچنے والی نہیں ہے، اسی لئے آپ اس سے محفوظ رہے۔اور جو مصیبت تم کو پہنچی؛ اس سے تم بچنے والے بھی نہیں تھے۔

اسی لئے بہت سے لوگ بڑے افسوس سے یوں کہتے ہیں کہ مَیں یوں کر لیتا تو یہ ہو جاتا۔اور فلانی تدبیر کرتا تو ایسا ہو جاتا۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی کی نگاہ تقدیر پر نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی تدبیر بھی اختیار نہ کرے۔جب تک کہ تقدیر کا فیصلہ ہمارے سامنے نہیں آیا ہے؛ تب تک تو ہمیں ضرور تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔کسی بیماری کے دفعیہ کے لئے، کسی راحت اور نعمت کو حاصل کرنے کے لئے تدبیریں ضرور اختیار کی جائیں، لیکن جب تقدیر کا فیصلہ سامنے آچکا اور جو چیز ہونے والی تھی وہ ہوگئی، اس کے بعد اب اس وسوسہ میں رہنا، اور اپنے آپ کو اس پریشانی مبتلا کرنا کہ مَیں یوں کرتا تو یوں ہو جاتا؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔اس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔

﴿وہی ہوتا ہے؛ جو منظورِ خدا ہوتا ہے﴾

ایک مرتبہ کوئی پیالہ ٹوٹ گیا، اس پر کسی نے کوئی بات کہی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اب چھوڑو بھی۔اگر کوئی اور بات مقدر ہوتی؛ تو وہی ہوتی۔یعنی اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ بات طے ہوتی کہ پیالے کو نہیں ٹوٹنا ہے تو کیوں ٹوٹتا؟ لیکن جب ٹوٹا تو معلوم ہوا کہ

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہی بات مقدر تھی۔لہٰذا جو ہوگیا اس کے متعلق آدمی کو اپنے دل میں یہ نہیں لانا چاہیے کہ مَیں یوں کرتا تو یوں ہوجاتا۔ایسا ہونے والا تھا ہی نہیں۔وہی ہوتا ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں مقدر ہوتا ہے۔

ہاں! مستقبل میں آنے والی چیز کے بارے میں ضرور تدبیر اختیار کی جائے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے۔اس لئے تدبیروں کا حکم بھی دیا ہے اور اس کی اجازت بھی دی ہے، اس سے انکار نہیں ہے۔لیکن جو چیزیں ہوچکیں، پھر ان میں آدمی کو زیادہ مشغول ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خلاصہ ہے۔ان چیزوں کو اگر آدمی محفوظ رکھے گا اور ان کا اہتمام کرے گا؛ تو بہت ساری مصیبتوں سے اپنے آپ کو نجات دلا سکتا ہے۔

﴿تدبیروں کو بہت زیادہ اہمیت نہ دے﴾

بہت سے لوگ ماضی کی چیزوں میں الجھے ہوئے رہتے ہیں اور مستقبل کی تدبیروں سے غافل ہوجاتے ہیں۔یعنی مستقبل میں کچھ کرسکتے تھے اس سے بھی اپنے آپ کو محروم کردیتے ہیں۔ کہتے تو ہیں کہ یوں کرتا تو یوں ہوجاتا۔ارے بھائی! جو ہونا تھا؛ وہ ہوگیا، اُس کا وقت تو باقی نہیں رہا۔اب آنے والے وقت میں جو کچھ کرسکتے ہو، اِس افسوس میں مبتلا ہوکر اُس سے بھی اپنے آپ کو محروم کررہے ہو۔بات تو وہی ہے، چونکہ اس سے بھی ان کو محروم ہی رہنا اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں مقدر ہے، اس لئے وہ اسی اُدھیڑ بُن میں لگا رہتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی ایسی چیزوں میں اپنے آپ کو مشغول نہ کرے۔ یہ ایمان کا تقاضہ ہے۔شریعت نے تقدیر پر ایمان کو جو ضروری قرار دیا ہے اس کی بنیاد ہی یہ ہے کہ آدمی تدبیروں کو زیادہ اہمیت نہ دے۔ یہ نہ سمجھے کہ جو کچھ بھی ہے؛ وہ تدبیریں ہی ہیں۔ بلکہ جو کچھ

بھی ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فیصلہ ہے۔اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اصل ہے۔تدبیر تو ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ نے یہ نصیحت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو فرمائی اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ جس وقت نبی کریم ﷺ نے یہ ارشادات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو فرمائے؛ اس وقت وہ بچے تھے۔آٹھ دس سال کی عمر تھی۔اس سے معلوم ہوا کہ ہمیں بھی اپنی اولاد کی تربیت کا اہتمام کرنا چاہیے۔یہ نہ سوچیں کہ چھوٹے بچے کو ابھی ہم یہ چیزیں کیا سمجھائیں؟ ان کو کیا بتائیں؟ یہ تو بڑی اونچی اونچی باتیں ہیں۔ایسا نہیں ہے۔بچپن کے اندر جو ایمان اور یقین بچے کے دل میں جم جاتا ہے اور جو چیز پیدا ہو جاتی ہے، بڑے ہونے کے بعد وہ کام آتی ہے۔اس لئے عقائد سے تعلق رکھنے والی چیزیں بچپن ہی سے ان کے ذہن میں بٹھانی چاہئیں۔بار بار اس کا تذکرہ ان کے سامنے آنا چاہیے، تاکہ بچے ان چیزوں سے واقف ہوں، اور اس طرح کا ان کا یقین بنے۔

﴿وَاعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ، وَاَنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ﴾ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: دیکھو! اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مدد اور نصرت صبر کے ساتھ آتی ہے۔اور جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے راحت بھی لگی ہوئی ہے، پھر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ ہر تکلیف کے ساتھ راحت ہے۔بلکہ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایک تکلیف کے ساتھ دو راحتیں اور ایک مصیبت کے ساتھ دو نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔

﴿ دیکھتے ہی دیکھتے زبردست انقلاب ﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قال: اِنَّكُمْ لَتَعْمَلُوْنَ أَعْمَالًا، هِيَ أَدَقُّ فِيْ أَعْيُنِكُمْ مِنَ الشَّعْرِ، كُنَّا نَعُدُّهَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنَ الْمُوْبِقَاتِ (البخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تم لوگ بعض اعمال ایسے کرتے ہو جو تمہاری نگاہوں میں تو بال سے بھی زیادہ کم حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی تم ان سے بچنے کا کوئی اہتمام نہیں کرتے۔ حالانکہ ہم نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ان کو ہلاکت میں ڈالنے والا سمجھا کرتے تھے۔

یہ روایت لا کر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ خاص طور پر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی صحبتِ بابرکت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہر ایک کے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیفیت پیدا کی تھی کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہر وقت اپنے سامنے حاضر سمجھتے تھے، اور چھوٹی چھوٹی نافرمانی کے کاموں سے بھی اپنے آپ کو ایسا بچانے کی کوشش کرتے تھے؛ گویا یہ ہمارے دین کو ہلاک کرنے والی ہیں۔

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ گناہ کی حیثیت تو ایسی ہے جیسے چنگاری۔ کہ اس میں چھوٹی بڑی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ آگ لگانے کا کام جیسا بڑی چنگاری کیا کرتی ہے؛ چھوٹی چنگاری بھی کرتی ہے۔ اور بڑی چنگاری سے جو ہلاکت آسکتی ہے؛ چھوٹی چنگاری سے بھی وہ آسکتی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج بتلانا چاہتے ہیں کہ ان حضرات کے دلوں میں باری تعالیٰ کا استحضار اور نگرانی کا خیال ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے گناہ کی بھی جرأت نہیں کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دور گذرنے کے بعد یہ تبدیلی

آ گئی، یعنی اسی قریب کے زمانہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین کا زمانہ آیا، حالانکہ وہ بھی "خیر القرون" کے بعد "ثم الذین یلونھم" کے اندر شمار ہوتا ہے؛ لیکن پھر بھی اتنی بڑی تبدیلی آ گئی۔ تو اب ہمارے اس دور کے بارے میں کیا امید کی جا سکتی ہے؟

بہر حال! حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب میں باری تعالیٰ کی نگرانی کی جو کیفیت تھی؛ اس کا پتہ چلتا ہے۔

اس باب کا خلاصہ

اس باب کا خلاصہ یہی ہے کہ آدمی ہر وقت اس بات کا استحضار رکھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، مَیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگرانی میں ہوں۔ اس کی وجہ سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اور گناہوں میں مبتلا ہونے سے بچائے گا۔ اور جو کام اللہ تبارک وتعالیٰ نے کرنے کے لئے کہے ہیں، ان کے کرنے کا اہتمام نصیب ہوگا۔

اللّٰہ تبارک و تعالیٰ ہمیں یہ کیفیت نصیب فرمائے

حضرت مولانا ابراہیم صاحب دامت برکاتہم حضرت اقدس مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے خادمِ خاص اور حضرت کے خصوصی فیض یافتہ؛ آج ہمارے درمیان میں موجود ہیں، آپ کی عنایت ہے کہ یہاں تشریف لائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آج آپ کے آنے کی وجہ سے حضرت اقدس مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خصوصی برکات سے بھی ہمیں مالا مال فرمائے۔ اب دعا حضرت مولانا ہی فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے فیوض سے بھی ہم کو زیادہ سے زیادہ مستفیض فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

مراقبہ
مجلس ﴿۲﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ مراقبہ ۲ ﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد.

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَغَارُوَغَیْرَۃُاللّٰہِ تَعَالٰی أَن یَّأْتِیَ الْمَرْءُ مَاحَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ.

باب کاعنوان قائم کیا ہے باب المراقبہ۔جس کا حاصل یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جوتعلیمات دی ہیں اورامت کی جوتربیت فرمائی ہے اس کے اندر یہ چیز مدنظر رکھی گئی ہے کہ ہرمؤمن کے دل ودماغ میں یہ تصوروخیال جم جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، میرے ہرحرکت وسکون پراورمیرے ہرکام پراللہ تعالیٰ کی نظر ہے ﴿اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ اللہ تعالیٰ ٹوہ میں لگے ہوئے ہیں ﴿أَلَمْ یَعْلَمْ بِأَنَّ اللّٰہَ یَرٰی﴾ کیاان کومعلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے ہرمؤمن کے لئے یہ صفت مطلوب ہے کہ آدمی اس بات کی کوشش اورمحنت کرے اور ہروقت اس تصورکواپنے دل میں تازہ کرتارہے یہاں تک کہ یہ خیال وتصوراس کے دل میں جم جائے جب یہ تصوردل ودماغ میں جم جائے گاتو پھرنتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی تنہائی میں ہویالوگوں کے سامنے ہو،خلوت میں ہو یاجلوت میں ہو،کسی بھی حالت میں ہو؛اپنے آپ کواللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچانے کااہتمام کرے گا۔اسی مناسبت سے یہ روایت پیش فرمارہے ہیں۔

﴿غیرت کا مطلب﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ غیرت رکھتے ہیں۔ غیرت کا مطلب اصل میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی طبیعت میں ان حالات میں خفگی اور ناراضگی کی کیفیت پیدا ہو جہاں وہ یہ دیکھے کہ جس چیز میں اس کی خصوصیت ہے اس میں دوسرا شرکت کر رہا ہے۔ جیسے کوئی دیکھے کہ اس کی بیوی کو کوئی آدمی غلط نگاہ سے دیکھ رہا ہے، تو وہ سوچتا ہے کہ میری بیوی کے معاملہ میں یہ شرکت کرنا چاہتا ہے۔ بس! اس تصور سے اس کے دل میں طبعی طور پر ایک ہیجان اور ناراضگی وغصہ کی کیفیت غیر اختیاری طریقہ سے پیدا ہوتی ہے؛ اسی کو غیرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی لئے شوہر کبھی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اس کی بیوی کی طرف کوئی غیر شخص دیکھے، اس سے بات کرے، اس کی بیوی کسی کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ رکھے جو عورت کو شوہر کے ساتھ رکھنا چاہیے۔ اگر اس کی بیوی کی طرف سے ایسا معاملہ پیش آئے، اس وقت شوہر کی طبیعت میں ہیجان اور خفگی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے؛ اسی کو غیرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عورتوں میں بھی یہ مادہ ہوتا ہے اور بہت زیادہ ہوتا ہے۔

﴿اللہ تعالیٰ کی غیرت کا مطلب﴾

خیر! یہ غیرت دراصل ایک تأثر اور انفعالی کیفیت ہے۔ انفعالی کیفیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر اس کے اثر میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات تأثر اور انفعال سے پاک ہے، اس لئے غیرت کا حقیقی معنٰی تو وہاں نہیں پایا جائے گا، البتہ غیرت کا جو اثر ہے کہ اس غیرت کے نتیجہ میں آدمی یہ چاہتا ہے کہ یہ حرکت جو وجود میں آئی

ہے؛ وہ ختم ہوجائے،اور یہ کام نہ ہونے پائے۔تو اس کا فائدہ جہاں مرتب ہوتا ہے،وہاں پر اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے لفظِ غیرت کا استعمال کرتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی غیرت یہ ہے کہ آدمی کوئی ایسا کام کرلے جو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔خاص طور پر بے حیائی کے کاموں کو اللہ تعالیٰ نے اسی صفت غیرت کی بناء پر حرام کیا ہے۔جیسے ایک آدمی یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی بیوی،اس کی بہن،اس کی بیٹی کے ساتھ کوئی آدمی ایسا کوئی معاملہ کرے،اس کی غیرت برداشت نہیں کرتی،ویسے ہی اللہ تعالیٰ کی غیرت بھی یہ گوارا نہیں کرتی کہ اس کے بندے یا بندی کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ کیا جائے جو شرعاً جائز نہیں ہے اور بے حیائی کا ہے۔اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب جوش میں آتا ہے۔لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ ایسے کاموں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرے۔گویا اس کو ہر وقت یہ تصور ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں،اگر مَیں بے حیائی کا کام کروں گا تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوں گے۔

﴿آزمائش کیوں؟﴾

وعن أبی هریرةؓ انَّهُ سَمِعَ النَّبِیَّ ﷺ یَقُوْلُ: ان ثلاثة من بنی اسرائیل ......الخ

حضرت ابوہریرہؓ کی یہ ایک لمبی روایت ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ بنو اسرائیل میں تین آدمی تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے آزمانے کا ارادہ کیا۔ویسے تو اللہ تعالیٰ دلوں کی حقیقت سے بخوبی واقف ہے،لیکن دل میں جو کچھ ہے وہ لوگوں کے سامنے بھی ظاہر ہوجائے۔اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ہے لیکن لوگ بھی دیکھیں اور محسوس کریں اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو ایسے حالات میں مبتلا کیا

جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں دل میں چھپی ہوئی وہ کیفیات اور جذبات لوگوں کے سامنے ظاہر ہوجاتے ہیں؛ اسی کو آزمائش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ امتحان کو بھی آزمائش اسی لئے کہتے ہیں کہ کچھ سوالات کے جوابات کے ضمن میں اندر کی پوشیدہ صلاحیت لوگوں کے سامنے ظاہر ہوجاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو مختلف حالات سے گذار کر بندوں کے اندر کی مختلف کیفیتوں کو ظاہر فرماتے ہیں۔ مثلاً مصیبت کے وقت صبر کرتا ہے یا بے صبری سے کام لیتا ہے؟ اللہ تعالیٰ دولت وثروت سے نوازتے ہیں تو اس کا حق ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری پر قائم رہتا ہے یا بہک جاتا ہے اور بے قابو ہوکر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوجاتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہے کہ اس کے اندر کا کیا حال ہے لیکن جب تک دولت نہیں آئے گی وہاں تک لوگوں کو پتہ نہیں چلے گا۔ لوگوں کے سامنے بھی یہ چیزیں ظاہر ہوجائیں؛ اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو جن مختلف حالات سے گذارا جاتا ہے انہیں حالات کو عربی زبان میں ﴿بَلَآء﴾ اور اردو میں آزمائش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر اس آزمائش کی بھی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، کبھی کوئی مصیبت کے ذریعہ آزمایا جاتا ہے، اور کبھی کوئی نعمت دے کر آزمایا جاتا ہے۔

﴿ کوڑھی، گنجے اور اندھے کا قصہ ﴾

تو یہاں بھی بنواسرائیل کے تین بندے تھے، ان میں سے ایک ابرص تھا یعنی اس کا پورا جسم سفید داغ والا تھا جس کو کوڑھی کہتے ہیں اور دوسرا اقرع یعنی گنجا تھا، اور تیسرا اندھا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمانے کا ارادہ کیا تو ہر ایک کے پاس ایک فرشتہ بھیجا، اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ فرشتہ پہلے کوڑھی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: تمہیں کیا چیز پسند ہے؟ جس کے پاس

جو چیز نہیں ہوتی اس کو وہی زیادہ پسند ہوتی ہے۔لہٰذا اس نے کہا: میرے جسم کی رنگت اچھی ہو میری کھال خوبصورت ہو اور یہ بیماری جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن اور نفرت کرتے ہیں اور مجھ سے دور بھاگتے ہیں؛ دور ہو جائے۔اس فرشتے نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو وہ گھن والی بیماری دور ہو گئی اور اس کی خواہش کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو اچھی رنگت دے دی گئی۔

اس کے بعد اس فرشتے نے اس سے پوچھا: کون سا مال تجھے زیادہ پسند ہے؟ اس نے کہا: اونٹ پسند ہیں۔بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے گائے کہا۔راوی کو شک ہے۔ لیکن راجح یہی ہے کہ اونٹ کہا تھا۔اس فرشتے نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حاملہ اونٹنی جو بچہ جننے کے لئے تیار تھی؛ دے دی اور اس کو دعا بھی دی: ﴿بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ فِیْھَا﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اس میں برکت دے۔

اس کے بعد وہی فرشتہ گنجے آدمی کے پاس گیا اور پوچھا: تمہیں کیا چیز پسند ہے؟ اس نے کہا: میرا جی چاہتا ہے کہ میرے سر پر اچھے بال آجائیں، اور یہ گنجا پن جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن کرتے ہیں؛ دور ہو جائے۔اس فرشتے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کی وہ بیماری دور ہو گئی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو خوبصورت بال دے دیئے گئے

اس کے بعد اس فرشتے نے اس سے پوچھا: کون سا مال تجھے پسند ہے؟ اس نے کہا: گائے پسند ہے۔تو ایک حاملہ اور گابھن گائے اس کو دے دی اور دعا بھی دی ﴿بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ فِیْھَا﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں برکت دے۔

اس کے بعد وہی فرشتہ اندھے کے پاس آیا اور پوچھا: تمہیں کونسی چیز پسند ہے؟ اس

نے کہا: اللہ تعالیٰ میری بینائی لوٹا دے، تاکہ مَیں لوگوں کو دیکھ سکوں۔ اس نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا، اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی لوٹا دی۔

اس کے بعد اس فرشتے نے اس سے پوچھا: کون سا مال تجھے پسند ہے؟ اس نے کہا: بکری پسند ہے۔ تو ایک گابھن بکری؛ جو بچہ جننے کی تیاری تھی اس کو دے دی، اور اس کو بھی دعا دی: ﴿بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ فِیْھَا﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں برکت دے۔

ان تینوں نے اپنے جانوروں کو بچہ جنوایا۔ جیسے عورت کو بھی جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس وقت وہاں دوسری عورت ہوتی ہے جو بچہ جنواتی ہے، جس کو ''دایہ'' کہا جاتا ہے، وہی بچہ کو لیتی ہے۔ اسی طرح جانور کو جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا مالک وہاں موجود ہوتا ہے جو اس بچہ کو لیتا ہے۔ اس کو عربی زبان میں ﴿اِنْتَاج﴾ کہتے ہیں۔ تو اونٹ والے نے اور گائے والے نے اپنے اپنے جانوروں کو بچہ جنوایا یعنی جب بچہ پیدا ہوا تو اس کو لیا۔ اور اس بکری والے نے بھی بچہ جنوایا۔ اس کے بعد ان کے اموال میں اتنی برکت ہوئی کہ پورا میدان بھر گیا۔ دو پہاڑوں کے بیچ کا جو ہموار حصہ ہوتا ہے اس کو عربی اور اردو میں ''وادی'' کہتے ہیں اور گجراتی میں اس کو ﴿ખીણ﴾ کہتے ہیں۔ دو پہاڑوں کے بیچ کا خالی حصہ بہت بڑا ہوتا ہے، وہ پورا حصہ اونٹوں سے بھر گیا۔ اور دوسرے کے لئے گایوں سے وادی بھر گئی۔ اور تیسرے کی بکریوں میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت دی کہ پورا میدان بکریوں سے بھر گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ نعمتیں آزمانے کے لئے دی تھیں تاکہ دیکھیں کہ وہ ان نعمتوں کا کیا حق ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا وہی فرشتہ سب سے پہلے اس کوڑھی کے پاس اسی کوڑھ والے بیمار کی سی شکل وصورت بنا کر آیا جو اس کی پہلے تھی۔ اور اس سے کہا کہ مَیں ایک غریب آدمی

ہوں، اور سفر میں سارے اسباب میرے ہاتھ سے ختم ہو چکے ہیں، اب اس سفر کو آگے جاری رکھنے کا اور ضرورتوں کو پورا کرنے کا کوئی سامان میرے پاس نہیں ہے، اس وقت میرا حال یہ ہے کہ میں اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ میرے اوپر نظر کرم فرمائے، اور پھر آپ کچھ توجہ کریں۔

علماء نے لکھا ہے کہ لوگوں کے سامنے مدد کا تذکرہ کرنا ہو؛ تو یہی تعبیر ادب کا تقاضہ ہے: ﴿لَا بَلَاغَ لِيَ الْيَوْمَ اِلَّا بِاللّٰهِ، ثُمَّ بِكَ﴾ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پھر آپ کی توجہ سے میرا کام بن سکتا ہے۔ یہاں بھی اس نے یہی کہا۔

اور پھر کہا کہ جس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اچھی رنگت عطا فرمائی، اچھی کھال اور چمڑی دی اور مال دیا، اس اللہ کے واسطے سے میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ایک اونٹ دو؛ تا کہ اس کے ذریعہ سے میں اپنا سفر پورا کر کے منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں۔

﴿فَقَالَ: اَلْحُقُوْقُ كَثِيْرَةٌ﴾ اس نے کہا کہ میرے اوپر تو بہت سارے حقوق ہیں ان کی ادائیگی کرنی ہے، میرے پاس اتنا سارا مال نہیں ہے کہ تجھے دے سکوں۔ ﴿فَقَالَ: كَأَنِّيْ أَعْرِفُكَ﴾ جب اس نے دینے سے انکار کیا تو اس فرشتے نے کہا: شاید میں تم کو پہچانتا ہوں، آپ مجھے یاد پڑتے ہیں۔ تم تو ابرص اور کوڑھی تھے، اور لوگ بھی تم سے گھن کرتے تھے، تمہارے پاس مال بھی نہیں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو اچھی کھال دی اور مال دیا۔ اس نے کہا: ارے نہیں! یہ مال تو باپ دادا کے زمانہ سے میرے پاس چلا آ رہا ہے۔ اس پر فرشتے نے کہا: اگر تو جھوٹا ہے تو پھر پہلے جیسا تھا ویسا ہی اللہ تعالیٰ تجھے بنا دے۔ چنانچہ وہ پھر سے کوڑھی ہو گیا

اس کے بعد وہ فرشتہ گنجے کے پاس اسی جیسی صورت اور حالت بنا کر گیا۔ وہاں

جا کر بھی یوں کہا کہ ایک غریب اور مسکین آدمی ہوں، سفر کے سارے وسائل میرے پاس سے ختم ہو چکے ہیں، منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کوئی راہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں اور اس کے بعد تمہاری نظر ہو؛ تو کچھ کام بن سکتا ہے۔ لہٰذا مَیں تم سے ایک گائے مانگتا ہوں تا کہ میری ضرورت پوری ہو۔ اس نے بھی جواب میں وہی باتیں کہیں جو پہلے والے نے کہی تھیں۔ فرشتے نے کہا: یہ مال تم کو اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا؟ اس نے کہا: نہیں! یہ تو میرے باپ دادا کے زمانہ سے چلا آ رہا ہے۔ اس پر فرشتے نے کہا: اگر تو جھوٹا ہے، تو پھر پہلے جیسا تھا؛ ویسا ہی اللہ تعالیٰ تجھے بنا دے۔ چنانچہ وہ پھر سے گنجا ہو گیا۔

اس کے بعد وہ فرشتہ اندھے کے پاس اسی جیسی اندھی شکل وصورت بنا کر آیا اور اس سے بھی یہی کہا کہ غریب آدمی ہوں، مسافر ہوں، اور اس سفر میں میرے سارے اسباب ختم ہو چکے ہیں اور آج اس وقت اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کے بعد تمہاری توجہ کے بغیر مَیں اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا ہوں۔ جس اللہ نے تمہاری بینائی لوٹائی اس کا واسطہ دے کر مَیں تم سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے ایک بکری دو، تا کہ مَیں اپنے سفر میں اس سے کام لوں اور میری ضرورت پوری ہو، اور مَیں آسانی سے منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں ﴿فَقَالَ: كُنْتُ أَعْمٰى، فَرَدَّاللّٰهُ اِلَـيَّ بَصَرِیْ. فَخُذْمَاشِئْتَ وَدَعْ مَاشِئْتَ﴾ اس نے کہا: مَیں بھی اندھا تھا، اللہ تعالیٰ نے میری بینائی لوٹائی۔ آج میرے مال میں سے جتنا چاہے لے جا، اور جتنا چاہے چھوڑ جا، میری طرف سے تجھے اختیار ہے، آج اللہ کے نام پر تو جو بھی لے جائے گا، اس میں مَیں تجھے مشقت میں نہیں ڈالوں گا یعنی منع نہیں کروں گا۔ اس پر اس فرشتے نے کہا: تم اپنا مال رہنے دو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم لوگوں کو آزمایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو گیا، تم امتحان میں کامیاب ہو گئے اور تمہارے دونوں ساتھی ناکام ہو گئے۔

دیکھو! اس اندھے آدمی نے اپنی پہلی والی حالت کو یاد رکھا یہی مراقبہ ہے۔ اس نے اس بات کا استحضار رکھا کہ مَیں پہلے کیسا تھا۔ مَیں تو محتاج تھا، خود مدد کا مستحق تھا، آج ایک ضرورتمند آدمی آیا ہے، لہٰذا مجھے اپنی اس حالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہاں اس روایت کو پیش کرنے کا مقصد یہی تھا۔

﴿ہوشیار اور نادان﴾

عن أبی یعلیٰ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہُ وَعَمِلَ لِمَابَعْدَالْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُمَنْ اَتْبَعَ نَفْسَہُ ھَوَاھَاوَتَمَنّٰی عَلَی اللہِ.

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہوشیار، دانا، عقل منداور سمجھ دار شخص وہ ہے جو اپنی ذات کا محاسبہ کرے ﴿وَعَمِلَ لِمَابَعْدَالْمَوْتِ﴾ اور موت کے بعد آنے والی زندگی کے لئے عمل کرتا ہے۔ ﴿دَانَ یَدِیْنُ﴾ قابو میں کرنا اور محاسبہ کرنا۔ ﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ روزِ جزاء کا مالک یا یومِ حساب کا مالک ہے حساب کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور بدلہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ یہاں بھی مراد یہی ہے کہ وہ اپنے نفس کا حساب لیتا ہے کہ آج کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ اپنے فریضہ کو کتنا ادا کیا اور کتنا غفلت سے کام لیا۔ گویا روزانہ وہ اپنی ذات کا خیال رکھتا ہے اور مراقبہ کرتا ہے۔

اور حقیقت میں ہوشیاری اسی کا نام ہے کہ آدمی آخرت کے لئے عمل کرے اور روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ اگر نیکی کی ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرے۔ اور اگر گناہ ہوا ہے تو توبہ کرے اور آئندہ اس سے بچنے کا عزم کرے اور عہد کی تجدید کرے۔

﴿وَالْعَاجِزُمَنْ اَتْبَعَ نَفْسَہُ ھَوَاھَا﴾ اور عاجز، درماندہ اور بیوقوف وہ ہے جو اپنے نفس

کواپنی خواہشات کے پیچھے چلاتا ہے،اوراللہ تعالیٰ سے امیدیں باندھتا ہے۔من چاہی کرتا ہے اورامید رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے۔گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفورٌ رَّحیم ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ غفورٌ رَّحیم ہیں لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی نفس کا دھوکہ ہے۔آدمی کا نفس اس طرح کہہ کرآدمی کو گناہ میں مبتلا کرتا ہے۔

اچھا!اگرآپ کا نفس آپ کو یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفورٌ رَّحیم ہیں،اورآپ سے گناہ کرواتا ہے،تو اگرکوئی کافراس طرح کہے کہ اللہ تعالیٰ غفورٌ رَّحیم ہیں،لہٰذا مجھے اپنے کفر سے توبہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو آپ فوراً قرآن پاک کی آیت پیش کریں گے:﴿اِنَّ اللّٰہَ لَایَغْفِرُأَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُمَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ﴾اللہ تعالیٰ شرک کوتو معاف نہیں کرتے،اس کے علاوہ گناہوں کوجس کو چاہیں گے معاف کردیں گے۔اس سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی مغفرت کے لئے اصول وضابطہ ہے اوراللہ تعالیٰ اسی ضابطہ کے مطابق معاملہ کریں گے۔بندوں کے اعمال کے معاملہ میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ضابطہ بتلادیا:﴿فَأَمَّامَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَھُوَفِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ.وَأَمَّامَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَأُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ ﴾ جس کے نامۂ اعمال کا ترازو نیکیوں سے بھاری ہوگیا؛وہ جنت میں جائے گا۔اللہ تعالیٰ نے اصول بتلادیا ہے کہ نیکیاں اور گناہ دونوں ہورہے ہیں اورجس کی نیکیاں زیادہ ہیں،اس کے ساتھ مغفرت کا معاملہ کریں گے اوراس کے گناہوں کومعاف کرکے جنت میں بھیجیں گے۔ اوراگرگناہ غالب ہوں گےتواس کوسزادیں گےیعنی جہنم میں بھیجیں گے۔یہ اصول ہے۔

قدرت نے دنیا کودارالاسباب بناکرتمام چیزوں کواس کے ساتھ جوڑا ہے۔مثال کے طورپرایک طالب علم ہے،امتحان کا زمانہ آیااس وقت تمام لوگ محنت کررہے ہیں اوروہ

کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کامیاب کردیں گے۔ محنت تو کی نہیں اور کامیابی کی امید رکھتا ہے، تو کامیاب کہاں ہوسکتا ہے۔

ایک کسان ہے جس نے نہ بیج ڈالا، نہ پانی پلایا، نہ کبھی ہل چلایا، اور نہ کچھ کیا، اور جب کٹائی کا وقت آیا اس وقت وہ بھی یوں سوچتا ہے کہ جس طرح دوسروں کے گھر میں غلہ آئے گا؛ اسی طرح میرے گھر میں بھی غلہ آئے گا۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟

دنیا کے معاملہ میں تو ہم یوں کہتے ہیں کہ اسباب اختیار کرنے چاہئیں، اسی طرح آخرت کے معاملہ بھی ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ فضل وکرم فرماتے ہیں۔ ویسے آخرت میں بھی ہمارے عمل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دیا جاتا ہے؛ وہ اس کا فضل وکرم ہی ہے۔

﴿فضل الٰہی انجن ہے اور عمل صالح سگنل﴾

اسی لئے حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَن يُّدْخِلَ أَحَدَكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ﴾ تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا۔ صحابہ نے پوچھا: ﴿وَلَا أَنْتَ يَارَسُوْلَ اللهِ؟﴾ یا رسول اللہ! آپ کو بھی نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿وَلَا أَنَا اِلَّا أَن يَّتَغَمَّدَنِيَ اللهُ بِرَحْمَتِهٖ﴾ میں بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔ جو بھی جنت میں جائے گا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی سے جائے گا، البتہ علامت کے طور پر عملِ صالح ہے۔ جیسے سبز سگنل دیکھ کر گاڑی چلتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سبز سگنل کی وجہ سے اس میں حرکت آئی، بلکہ وہ تو ایک علامت ہے، ورنہ گاڑی میں حرکت تو انجن کی وجہ سے آئی ہے۔ اسی طریقہ سے آدمی کو جو کچھ بھی ملے گا وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم ہی سے ملے گا، البتہ اس کے لئے عملِ صالح علامت اور نشانی قرار دی گئی ہے۔ اگر عملِ صالح ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل وکرم کیا جائے گا۔

﴿پوری زندگی کی پونجی کا حال﴾

ورنہ ظاہر ہے کہ آدمی دنیامیں اپنے عمل کی قیمت دیکھ لے کہ کیا ہے؟ حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو اس دنیا کا دس گنا ملے گا۔اب کوئی آدمی دنیامیں کتنی ہی محنت کرلے،اورروزانہ کروڑ ہا کروڑ روپے کماوے۔دنیاکے سب سے بڑے مالدارکی ایک دن کی جتنی کمائی ہے،اوروہ دنیامیں پچاس سال زندہ رہے؛تو کتنا کمالے گا۔اتنی سب کمائی کوجمع کرکے بھی وہ آدمی کیاپورے امریکہ کوخریدسکتاہے؟پوراہندوستان خریدسکتاہے؟پوراہندوستان تو کیا،اس کاایک صوبہ مہاراشٹربھی خریدسکتاہے؟پورامہاراشٹرتو کیا، بلکہ اس کاایک شہر بمبئ خریدسکتاہے؟پورا بمبئ تو کیا،اس کا ایک علاقہ نریمان پوئنٹ بھی نہیں خریدسکتاہے۔یہ تو ہم نے اس آدمی کا جائزہ لیاجس کی محنت کا معاوضہ ساری دنیاکےلوگوں میں سب سے زیادہ ہےاوراس کی پوری زندگی کی پونجی کا حال یہ ہے کہ اس سے بمبئ شہر کاایک علاقہ نہیں خریداجاسکتا۔حالانکہ دنیا کانقشہ اٹھاکردیکھئے کہ پوراہندوستان کتنا چھوٹانظرآتاہے،اوراس میں بمبئ کاتوصرف ایک نقطہ ہی نظرآئے گا۔پھربمبئ کے اس ایک علاقہ کاتو تذکرہ ہی کیاہوا۔ہمارے عمل کی دنیامیں یہ حقیقت ہے،تو آخرت میں دنیا کادس گنا جو ملے گاوہ کیاہے؟محض اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے اللہ تعالیٰ دیناچاہتے ہیں تواس کے لئے بہانہ بنایاہے۔

﴿ایک اورمثال﴾

حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں:یہ تواایسا ہی ہے کہ کوئی آدمی کسی سے یوں کہے کہ یہاں سے دس قدم چل کرجاؤ،ایک قدم پرایک ہزارروپے دوں گا،دس قدم پر

دس ہزار روپے ملیں گے۔ اب وہ یوں کہے کہ مجھ سے تو نہیں چلا جاتا، ایسے ہی دے دو۔ اب جو بھی سنے گا وہ تو یہی کہے گا کہ جو دس ہزار دئے جا رہے ہیں وہ دس قدم کا بدلہ نہیں ہے بلکہ صرف آزمائش کے لئے کہا گیا ہے۔ ورنہ دراصل وہ تو دینا ہی چاہتا ہے، اس کو دینے کے لئے صرف ایک بہانہ چاہیے۔ اور پھر یہ آدمی اس بہانہ کو بھی انجام دینے کے لئے تیار نہیں ہے؛ تو پھر ایسے آدمی کو کون دے گا۔

اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ جو کچھ دینا چاہتے ہیں وہ صرف اس کا فضل ہی ہے۔ ہمارے اعمال کی اس کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، وہ تو صرف ایک بہانہ کے طور پر ہیں۔ اب ہم اس بہانہ کو بھی انجام دینے کے لئے تیار نہ ہوں؛ تو پھر اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا﴾ عاجز، بے وقوف، اور اپنے عمل سے قاصر آدمی وہ ہے؛ جو اپنے آپ کو خواہشات کے پیچھے چلائے اور اللہ تعالیٰ سے بڑی بڑی امیدیں لگائے۔ کام تو کر رہا ہے اپنی خواہشات کے، من چاہی کرتا ہے، رب چاہی نہیں کر رہا ہے؛ اور امیدیں یہ لگاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے یہ دیں گے اور وہ دیں گے۔ یہ نفس کا صریح دھوکہ ہے۔

لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ ہر وقت اس بات کا استحضار اور مراقبہ رکھے کہ مجھے وہی کچھ کرنا ہے؛ جو اللہ تعالیٰ مجھ سے چاہتے ہیں۔ تب ہی اس کا کام بن سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے

مراقبہ
مجلس ﴿۳﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿مراقبہ ۳﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً،أمابعد.

عن أبی هريرةؓ قال قال رسول اللهﷺ: مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالاَ يَعْنِيْهِ.

﴿آپﷺ کا رعب﴾

حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت ترمذی شریف ابوداؤد شریف وغیرہ کتب میں موجود ہے۔ نبی کریمﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کو چھوڑ دے۔ یہ نبی کریمﷺ کے ان ارشادات میں سے ہے جن کو جوامع الکلم سے تعبیر کیا جاتا ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریمﷺ کو جن خصوصیات سے نوازا تھا ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ بخاری شریف میں ہے حضرت جابر بن عبداللہؓ نبی کریمﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں: ﴿أُعْطِيْتُ خَمْساًلَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌقَبْلِيْ،نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَشَهْرٍوَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداًوَّطَهُوْراًوَاُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِم وَأُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ﴾ (بخاری شریف،۳۲۳)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری مدد رعب اور ہیبت کے ذریعہ سے ایک مہینہ کی مسافت سے کی گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی کریمﷺ کو ایسا رعب اور ایسی ہیبت عطا فرمائی تھی کہ آپ کا رعب ایک مہینہ کی دوری سے دشمن کے اوپر اثر انداز ہوتا تھا۔

چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ بڑے بڑے تندرست اور توانا دشمن بھی جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو آپ کو دیکھ کر لرز جاتے تھے۔ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے کسریٰ شاہِ ایران کے نام دعوتِ اسلام کا خط بھیجا اور حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ اس خط کو لے کر گئے تھے،انہوں نے وہ خط کسریٰ کے ماتحت حاکم بحرین منذر بن ساوی کی خدمت میں پیش کیا اور اس نے وہ خط کسریٰ تک پہنچایا۔اس خط میں نبی کریم ﷺ نے اس کو اسلام کی دعوت پیش کی تھی،اور اس کو ﴿عَظِیْمُ فَارِس﴾ فارس کا بڑا آدمی کہہ کر مخاطب کیا تھا جب یہ خط پڑھا گیا تو اس کو اپنے کبروغرور کی وجہ سے بڑا برا معلوم ہوا،کسریٰ نے یوں سوچا کہ وہ میری رعیت ہونے کے باوجود مجھے اس طرح خطاب کرتے ہیں،چنانچہ اس نے یمن کے حاکم باذان کو حکم دیا کہ دو توانا اور پہلوان آدمی بھیج کر ان کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیجو۔ چنانچہ کسریٰ کے حکم سے باذان نے دو طاقتور اور پہلوان آدمیوں کو مدینہ منورہ نبی کریم ﷺ کو گرفتار کرنے کے لئے بھیجا۔روایتوں میں ہے کہ جب وہ دونوں شخص نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے اور ان کی نگاہ نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور پر پڑی تو وہ دونوں لرزنے لگے۔یہ آپ ﷺ کا رعب تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔تو ایک خصوصیت یہ تھی۔(طبقات الکبریٰ لابن سعد،۱/۲۶۰)

﴿پوری زمین مسجد بنادی گئی﴾

دوسری خصوصیت یہ تھی ﴿وَجُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِداً وَّطَهُوْراً﴾ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو جائے نماز اور پاکی کا ذریعہ بنایا ہے۔پچھلی امتوں میں یہ تھا کہ آدمی ہر جگہ نماز نہیں پڑھ سکتا تھا بلکہ جو مقامات اور جگہیں نماز پڑھنے کیلئے مخصوص کی جاتی تھیں وہیں آدمی نماز ادا کر سکتا تھا۔جیسے اسلام میں مسجدیں ہیں،اس زمانہ میں کنیسے اور عبادت گاہیں ہوا

کرتی تھیں، وہیں نماز پڑھی جاسکتی تھی، عام جگہوں پر نماز نہیں پڑھی جاسکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ خصوصیت عطا فرمائی اور آپ کی امت کے لئے یہ حکم دیا کہ جب نماز کا وقت آجائے تو پوری زمین میں جہاں بھی نماز پڑھنا چاہیں؛ پڑھ سکتے ہیں۔ اگرچہ نماز کے لئے باقاعدہ جگہیں بنائی جاتی ہیں جس کو مسجد سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی میں نماز کو ادا کرنا افضل ہے اور ثواب کی زیادتی کا سبب ہے، اور اسی کا حکم بھی ہے، لیکن اگر کسی جگہ مسجد نہیں ہے اور نماز کا وقت آگیا؛ تو آدمی کہیں بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔

اسی طرح پاکی حاصل کرنے کے لئے اصل تو پانی ہے، لیکن اگر پانی موجود نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے مٹی کو پانی کا قائم مقام قرار دیا ہے کہ مٹی کے ذریعہ سے تیمّم کرکے پاکی حاصل کرسکتا ہے۔ یہ بھی نبی کریم ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔

﴿مالِ غنیمت، شفاعت اور عام بعثت﴾

تیسری خصوصیت یہ ہے ﴿وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ﴾ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے مالِ غنیمت کو حلال قرار دیا۔ پچھلی امتوں میں دشمنوں کے ساتھ جہاد کا سلسلہ جاری تھا، لیکن جنگ کے موقعہ پر دشمن کا جو مال غنیمت کے طور پر ہاتھ آتا تھا، خود شرکاء کو بھی اس مال کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی، بلکہ اس کو پہاڑی پر رکھ دیا جاتا تھا، آسمان سے آگ آکر اس کو کھا جایا کرتی تھی۔ یہی اس جہاد کے قبول ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ خصوصیت عطا فرمائی کہ آپ کی برکت سے امت کے لئے مالِ غنیمت کو حلال قرار دیا۔

اور چوتھی خصوصیت ارشاد فرمائی ﴿وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ﴾ اللہ تعالیٰ نے مجھے

شفاعت عطا فرمائی۔ شفاعت کی مختلف اقسام ہیں۔ بعض دوسرے حضرات کو بھی شفاعت کی اجازت دی جائے گی، لیکن ایک مخصوص شفاعت ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ ہی کو عطا فرمائی ہے۔

اور پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے انبیاء اپنی قوم کی طرف خاص طور سے بھیجے جاتے تھے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔

﴿جوامع الکلم﴾

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں جن پانچ چیزوں کو بیان کیا گیا ہے اس میں جوامع الکلم کا تذکرہ نہیں ہے لیکن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چھ ایسی چیزیں عطا فرمائیں جو مجھ سے پہلے کسی اور کو نہیں دی گئی، ان میں شفاعت کے علاوہ چار چیزیں تو وہی ہیں اور ایک چیز یہ ہے ﴿أُوتِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ﴾ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جامع کلمات دئے گئے۔ اور ایک چیز ارشاد فرمائی ﴿وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ﴾ اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے نبوت کے سلسلے کو مکمل کیا اور ختم کیا۔ (مسلم شریف، ۸۱۲) ان کے علاوہ بھی نبی کریم ﷺ کی اور بہت ساری خصوصیات ہیں جن کو علماء نے احادیث کے حوالوں سے جمع کیا ہے، اور اس پر مستقل رسالے لکھے گئے ہیں۔

بہر حال! نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو خصوصیات عطا فرمائی تھیں ان میں سے ایک جوامع الکلم بھی ہے۔ جوامع الکلم یعنی الکلمۃ الجامعۃ۔ ایسی بات جو بہت جامع ہو کہ اس میں الفاظ کم ہوں اور معانی بہت سارے ہوں، مختصر لفظوں میں بہت ساری بات بتا دی جائے؛ اسے جوامع الکلم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بہت سے حضرات نے جوامع الکلم کے

نمونے بھی احادیث سے باقاعدہ جمع کر کے مستقل رسالے تصنیف کئے ہیں۔

آپ ﷺ کے جوامع الکلم میں سے ایک ارشاد یہ بھی ہے: ﴿مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ﴾ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی چیز کو چھوڑ دے۔ اس کو جامع اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث آدمی کی زندگی کے اندر ایک بہت ہی اہم رہنمائی کا کام کرتی ہے۔

﴿امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک درہم میں جنت خرید لی﴾

حدیث کی چھ مشہور بڑی کتابیں ہیں جن کو صحاح ستہ یعنی حدیث کی چھ صحیح کتابیں کہا جاتا ہے، ان میں بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف وغیرہ ہیں، اسی میں سنن ابوداؤد کا بھی شمار کیا جاتا ہے جس کے ترتیب دینے والے یہی امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی ہیں۔ حدیث کے بڑے ماہر تھے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ بڑے متقی تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حدیث کے اندر بڑا اونچا مقام عطا فرمایا تھا۔ ان کے متعلق امام شعبہ بن الحجاج کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امام ابوداؤد کے لئے حدیثِ پاک کو ایسا نرم کر دیا جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو نرم کیا تھا۔

ان کے حالات میں ایک عجیب واقعہ بھی لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بڑی کشتی میں سوار ہو کر جا رہے تھے، کنارہ پر کسی آدمی کو چھینک آئی تو اس نے الحمدللہ کہا۔ اب کوئی آدمی چھینک کر ﴿الحمدللہ﴾ کہے تو ہمیں حکم یہ ہے اس کے جواب میں ﴿یرحمک اللہ﴾ کہنا چاہیے۔ امام ابوداؤد کے کان میں اس کی آواز آئی اور جواب دینے کا وقت آیا تب تک ان کی کشتی آگے بڑھ چکی تھی، اگر جواب دیتے تب بھی اس تک آواز نہ پہنچتی۔ لہٰذا انہوں نے سوچا

کہ مَیں اس کو جواب دوں تو ہوسکتا ہے کہ وہ ﴿یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ﴾ کہے اور اس کی یہی دعا اللہ تعالیٰ میرے حق میں قبول کرلیں تو میرا کام بن جائے۔ بڑی کشتی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی بوقتِ ضرورت استعمال کرنے کے لئے ہوا کرتی ہیں۔ لہٰذا امام صاحب نے ایک درہم دے کر ایک چھوٹی کشتی کرایہ پر لی اور اس میں سوار ہوکر کنارے پر آئے اور اس آدمی کو جواب میں ﴿یَرْحَمُکَ اللّٰہُ﴾ کہا، اس کے جواب میں اس آدمی نے ﴿یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ﴾ کہا۔

دیکھئے! حدیث کے اتنے بڑے امام ہونے کے باوجود اس طرح دعا حاصل کرنے کے لئے وہ کتنے حریص تھے۔ روایتوں میں ہے کہ خواب میں کسی نے دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ امام ابوداؤد نے ایک درہم میں جنت خریدلی۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر عمل کی یہ برکت ہے۔

﴿چار جامع ترین روایات﴾

خیر! اُس زمانہ میں حضراتِ محدثین مختلف علاقوں میں جا کر وہاں حدیث کے جو بڑے بڑے ماہرین محدث ہوا کرتے تھے، ان کی خدمت میں حاضری دے کر حدیثوں کی روایتیں حاصل کیا کرتے تھے۔ تو امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کی پانچ لاکھ (۵,۰۰,۰۰۰) حدیثیں جمع کیں اور ان میں سے انتخاب کرکے اپنی اس کتاب ''سنن ابوداؤد'' کے اندر چار ہزار آٹھ سو (۴,۸۰۰) حدیثیں میں نے لکھی ہیں۔ اور پھر فرماتے ہیں کہ کسی عقلمند آدمی کے عمل کرنے کے لئے ان سب میں سے صرف چار روایتیں کافی ہیں:-

(۱) پہلی روایت ہے: ﴿أَنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ، وَأَنَّمَا لِاْمْرِئٍ مَّانَوٰی، فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ جس میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ

اعمال کا مدار نیتوں پر ہے، اور آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے نیت کی، لہٰذا جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہو؛ تو وہ حقیقت میں بھی اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے ہوگی، اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہو؛ تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لئے شمار ہوگی۔

(۲) دوسری روایت ہے: ﴿لا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِهٖ﴾ تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کیلئے بھی وہی چیز پسند نہ کرنے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

(۳) تیسری روایت یہی ہے: ﴿مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالا یَعْنِیْهِ﴾ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی چیزوں کو چھوڑ دے۔

(۴) چوتھی روایت ہے: ﴿اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَبَیْنَهُمَا أُمُوْرٌ مُّشْتَبِهَاتٌ، فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتِ؛ فَقَدِاسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهٖ﴾ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، اور ان دونوں کے بیچ میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو مشتبہ ہیں یعنی اس میں دونوں پہلو موجود ہیں، ایک طرف سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ حلال ہو اور دوسری طرف سے یوں لگتا ہے کہ ممکن ہے کہ حرام ہو۔ تو ایسی مشتبہ چیزوں سے جو اپنے آپ کو بچائے گا، وہ اپنے دین کی حفاظت کر لے گا۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے یہ چار ارشادات ایک عقل مند آدمی کی پوری زندگی کی رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔ گویا یہ جامع کلمات ہیں۔

(سیر اعلام النبلاء، ۱۳/۲۱۰)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی اگر دین کے اصول اور کلیات سے واقفیت حاصل کرلے، تو جزئی امور کے معلوم کرنے کے لئے اس کو کسی رہنما کی ضرورت نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کے یہ ارشادات ہی اس کے لئے رہنما اور مرشد کا کام دیں گے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں جہاں ان کا یہ مقولہ نقل کیا ہے، وہاں اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آدمی کی عبادات کی درستگی کے لئے نیت کی درستگی کافی ہے۔ گویا عبادات کے واسطے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ﴿أَنَّمَاالْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ﴾ کافی ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ﴿لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَايُحِبُّ لِنَفْسِهٖ﴾ معاشرت کی درستگی کے لئے کافی ہے۔ اپنے پڑوسی، رشتہ دار، گھر والے، دوست اور ملنے جلنے والوں کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرنا چاہیے، اس میں بنیادی رہنمائی کے لئے یہ ارشاد (کہ تم میں سے کوئی آدمی مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے) کافی ہے۔ اگر کوئی آدمی کچھ زیادہ نہ جانتا ہو، اور وہ اسی ایک ارشاد کو اپنی زندگی میں اتار لے، اور پھر کبھی کوئی معاملہ آئے تو یہ سوچ لے کہ اگر اس طرح کا معاملہ میرے ساتھ کیا جاتا تو کیا مَیں اس کو گوارا کرتا؟ اگر نہیں کرتا تو پھر مَیں اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں کروں۔ آدمی اگر اس اصول کو اپنالے، تو کبھی کسی کو اس کی ذات سے تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔

اورآدمی کی زندگی میں اس کے عمرِ عزیز کے اوقات کوصحیح طریقہ سے استعمال کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ﴿مِنْ حُسْنِ اِسْلامِ الْمَرْءِ تَرْکُهُ مَالا یَعْنِیهِ﴾ کافی ہے۔

اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں علماء کا اختلاف ہے، اور بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں دلائل دونوں قسم کے ہیں۔ ایسے امور میں نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد ﴿اَلْحَلالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَبَیْنَهُمَا أُمُوْرٌ مُّشْتَبِهَاتٌ، فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَات؛ فَقَدِاسْتَبْرَأَلِدِیْنِهٖ﴾ کافی ہے حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور درمیان میں مشتبہ چیزیں ہیں، ان سے بھی اپنے آپ کو اگر بچالے گا تو اس کے دین کی حفاظت ہو جائے گی۔

﴿لایعنی کیا ہے؟﴾

اب لایعنی کیا ہے؟ تو اقوال میں بھی لایعنی ہوتی ہے، اور عام طور پر زیادہ تر واسطہ بولنے میں ہی پڑتا ہے، اس لئے اسی کو لایعنی کہا جاتا ہے، لیکن افعال میں بھی لایعنی ہے اور ہمارے حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ اشیاء میں بھی لایعنی فرمایا کرتے تھے۔

آج کل ہمارے اس زمانہ میں اشیاء کے اندر میں لایعنی بہت کثرت سے دکھائی دیتی ہے، آپ کسی کے گھر میں جائیں گے تو دیکھیں گے کہ کہیں کسی کونے میں پوٹ (POT) پڑا ہوا ہے، آپ پوچھیں کہ بھائی! یہ کس کام کا ہے؟ کیا اس میں پانی بھرتے ہیں؟ تو کہا: نہیں تو کیا اس میں غلہ بھرا ہوا ہے؟ تو کہا: نہیں، بلکہ صرف شو (SHOW) اور نمائش کے لئے ہے پورے گھر میں چاروں طرف جہاں دیکھو، کوئی نہ کوئی چیز لٹکائی ہوئی ہے، یعنی اگر ان ساری چیزوں کو جمع کیا جائے تو ہزاروں کی مالیت ہو جائے گی، اور وہ سب کسی کام کی نہیں ہے۔

﴿امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان﴾

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ باتوں کے اندر لایعنی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر آپ وہ بات نہ کہیں اور خاموش رہیں تو اس پر آپ کو کوئی گناہ نہ ہو، اور حال و مستقبل کے اعتبار سے دین و دنیا کا کوئی نقصان و ضرر بھی نہ ہو؛ ایسی بات لایعنی کے قبیل سے ہے۔ اور جس بات کے بولنے میں گناہ ہے، وہ تو گناہ ہی ہے، اس کو تو چھوڑنا ہی ہے۔ لیکن جس بات میں دنیا و آخرت کا کوئی فائدہ نہ ہو، اور اس پر کوئی گناہ بھی نہ ہو؛ ایسی بات لایعنی ہے۔

چنانچہ مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ کہیں سفر پر گئے تھے، وہاں سے واپس آکر وہاں کے حالات بیان فرماتے ہیں کہ فلاں جگہ گیا، وہاں یہ جگہ دیکھی، اور وہ مکان دیکھا اب اگر یہ سب نہ بیان کرتے تو کیا فرق پڑتا؟ یہ بھی از قبیل لایعنی ہے۔ ان باتوں میں مشغول رہ کر آپ نے اپنی زندگی کے قیمتی اوقات کو ضائع اور برباد کیا، اور جن اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کر کے آپ جنت میں اپنے لئے درخت لگوا سکتے تھے، محل بنوا سکتے تھے، وہ قیمتی اوقات ضائع ہو گئے۔ اس لئے کہ بہت سے اذکار وہ ہیں جن کے متعلق حدیثِ پاک میں فضیلتیں آئی ہیں کہ اس کے پڑھنے سے جنت میں محل بن جاتا ہے اور درخت لگ جاتے ہیں سبحان اللہ کہنے سے ایک درخت لگتا ہے۔ الحمد للہ کہنے سے ایک درخت لگتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے معراج کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ سے کہا تھا کہ اپنی امت کو میرا سلام کہنا اور ان سے کہنا کہ جنت تو چٹیل میدان ہے، اس کے درخت سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر ہیں۔ یعنی آدمی جتنی مرتبہ ان کلمات کو کہے گا، اتنے درخت اس کے لئے لگ جائیں گے۔ اسی لئے ہمارے اسلاف اپنی زندگی کے ایک ایک

منٹ کو قیمتی سمجھا کرتے تھے، اور اس سے آخرت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اب آپ اپنے سفر کے جو حالات بیان کریں گے اس میں چاہے مبالغہ آرائی سے کام نہ لیں، کوئی بڑائی بیان نہ کریں، جو چیزیں دیکھی ہیں صرف انہیں کو بیان کریں، یعنی اس میں گناہ کی کوئی بات نہیں ہو رہی ہے؛ تب بھی اپنے وقت کو اس میں استعمال کر کے آپ نے اپنا نقصان تو کیا۔

ایک آدمی اپنا دامن موتیوں اور ہیرے جواہرات سے بھر سکتا ہے، اس کے بجائے وہ اس میں ڈھیلے بھرتا ہو؛ تو اس کو نقصان نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے؟ ایسے ہی آپ ان اوقات کو قرآنِ پاک کی تلاوت کر کے، اللہ کے ذکر اور اس کی یاد میں مشغول ہو کر، نیکی کی باتوں اور کارآمد چیزوں میں مشغول ہو کر جن کا تذکرہ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوَاهُمْ اِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوْفٍ أَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾ بہت کچھ نیکیاں حاصل کر سکتے تھے، اگرچہ ان باتوں میں گناہ کا ایک لفظ بھی نہیں ہے، اس کے باوجود اپنے آپ کو نقصان میں تو ڈالا ہی ہے۔ اسی لئے اس کو لایعنی کہا گیا ہے۔

ورنہ اگر کوئی گناہ کی بات ہے تو اس کے نقصان ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہے مثلاً کوئی آدمی کسی کی غیبت کرتا ہے، کسی پر تہمت لگاتا ہے، کسی کے ساتھ جھگڑا کرتا ہے، تو اس میں تو گناہ ہونے ہی والا ہے۔ بلکہ غیر ضروری سوالات بھی گناہ تک پہنچانے والے ہیں۔

﴿تمہارا روزہ ہے؟ یہ سوال بھی لایعنی ہے﴾

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مثلاً آپ نے کسی سے عبادت کے متعلق سوال

کر دیا کہ تمہارا روزہ ہے؟ تو یہ بھی لایعنی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگر وہ جواب میں کہے گا: ہاں۔ تو ''ہاں'' کہنے میں ہوسکتا ہے کہ ریا کو دخل ہو جائے، گویا آپ اس کو ریا میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بنے اور ریا تو حرام کام ہے۔ ایک آدمی کو حرام کام میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن کر آپ بھی گناہ میں شریک ہو گئے۔ اور فرض کر لو کہ جواب دینے میں اس کے دل میں ریا نہیں آئی، تب بھی جو عبادت چھپ کر کی جاتی ہے، اس کے اندر ظاہر کر کے کئے جانے کے مقابلہ میں فضیلت زیادہ ہے۔ تو اس کی عبادت کے فضیلت والے پہلو کو تو آپ نے ختم ہی کر دیا۔ یہ تو اس وقت ہے جب کہ اس کا روزہ ہے اور وہ جواب میں ''ہاں'' کہے۔

اور اگر اس کا روزہ ہے اور وہ ''نا'' کہے گا تو اس کو جھوٹ میں مبتلا کرنے والے بن جاؤ گے۔

اور اگر وہ جواب نہیں دیتا بلکہ خاموشی اختیار کرتا ہے تو گویا وہ آپ کے ساتھ استحقار کا (آپ کو معمولی سمجھنے کا) معاملہ کر رہا ہے، کہ آپ سوال کر رہے ہیں اور وہ جواب نہیں دیتا۔

اور اگر جواب دینے میں وہ یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا کہ میرا روزہ ہے، تو اس دفاع کے لئے بات بنانے میں اس کو مشقت میں ڈالو گے؛ تو یہ اس کو تکلیف دینا ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ ایک عبادت کے لئے کیا جانے والا آپ کا ایک سوال بھی آدمی کیلئے مصیبت کا ذریعہ بن گیا۔ اسی لئے ہمارے اسلاف کے یہاں ان باتوں کا بڑا اہتمام تھا

زبان کے متعلق اکابر کے خیالات

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے منہ میں کنکر رکھ لیا کرتے تھے، تا کہ غیر ضروری بات زبان سے نہ نکل جائے۔ بہت سی مرتبہ وہ اپنی زبان کو کھینچ کر اس کی طرف اشارہ کر کے کہا کرتے تھے کہ یہی ہے جس نے مجھے مصیبت میں ڈالا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ اس اللہ کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں کہ طویل جیل میں ڈالے جانے کے سب سے زیادہ لائق تو یہ زبان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز اگر قید میں رکھنے کے قابل ہے تو وہ زبان ہے، اسی کو کنٹرول کرنا چاہیے

اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ﴿مَا النَّجَاةُ يَا رَسُوْلَ اللهِ؟﴾ اے اللہ کے رسول! کیا چیزیں دنیا اور آخرت میں نجات کا ذریعہ ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتیں بتلائیں ان میں پہلی بات یہ ہے: ﴿أَمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ﴾ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ اس کو قابو میں رکھنے ہی کے واسطے تدبیریں اختیار کیا کرتے تھے۔

حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میری زبان تو درندہ ہے، مَیں اگر اس کو چھوڑ دوں گا تو یہ مجھے کھا جائے گا۔ ان حضرات کے یہاں زبان کی یہ خطرناکی تھی۔

حضرت منصور بن معتمر رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے محدث ہیں ان کے متعلق لکھا ہے کہ چالیس سال تک انہوں نے عشاء کے بعد کوئی بات چیت نہیں کی۔

ایک اور بزرگ کے متعلق لکھا ہے کہ بیس سال تک انہوں نے دنیا کی کوئی بات نہیں کی۔ جب صبح ہوتی تھی تو قلم کاغذ اور دوات اپنے پاس رکھ لیا کرتے تھے، جو بولتے تھے اس کو لکھ لیتے تھے، اور شام کو وہ دیکھ کر اپنا محاسبہ کرتے تھے کہ آج مَیں نے کوئی غیر ضروری بات تو نہیں کی۔ لایعنی سے اپنے آپ کو بچانے کا اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے، بلکہ اگر کوئی غیر ضروری بات زبان سے نکل گئی تو وہ حضرات باقاعدہ اس پر اپنے آپ کو سزا دیا کرتے تھے

حسان بن ابی سنان رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں ان کے متعلق لکھا ہے

کہ وہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے، وہاں ایک نیا مکان بنا ہوا تھا، اس کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کب بنا؟ یہ بات بولنے کو تو بول گئے، اس کے بعد ان کو احساس ہوا کہ یہ تو ایک غیر ضروری سوال ہے جو میری زبان سے نکلا ہے۔ پھر وہ اپنے نفس کو ملامت کرنے لگے کہ تجھے کیا پڑی ہے کہ یہ کب بنا؟ تو اس میں اپنے آپ کو کیوں ڈالتا ہے؟ تو نے ایک غیر ضروری بات کر کے اپنا نقصان کیا ہے۔ مَیں ایک سال تک روزے رکھ کر تجھے سزا دوں گا۔

رباح قیسی رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ گزرے ہیں وہ ایک دوسرے بزرگ کی ملاقات کے لئے عصر کے بعد ان کے گھر گئے۔ پوچھا: وہ ہیں؟ گھر والوں نے بتلایا کہ سو رہے ہیں تو انہوں نے کہا: یہ کوئی سونے کا وقت ہے؟ ابھی کیوں سو رہے ہیں؟ یہ کہہ کر واپس لوٹے۔ یہ بھی بڑے آدمی تھے اس لئے گھر والوں نے ان کے پیچھے آدمی دوڑایا کہ اگر آپ کہیں تو ہم ان کو جگا دیں۔ وہ آدمی بہت دیر کے بعد واپس آیا اور کہنے لگا کہ وہ تو ایسی باتوں میں مشغول تھے کہ میری بات کی طرف توجہ ہی نہیں کی، وہ قبرستان کی طرف جا رہے تھے، مَیں پیچھے پیچھے تھا اور وہ اپنے نفس کو خطاب کر کے کہہ رہے تھے کہ تجھے کیا پڑی ہے کہ کوئی آدمی کس وقت سو رہا ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ کس کو کب سونے کی ضرورت ہے۔ تو نے کیسے کہہ دیا کہ یہ کوئی سونے کا وقت ہے۔ اور تجھے کس نے اختیار دیا تھا؟ ہر آدمی اپنے لئے فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کو سونے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تو نے بلا وجہ اپنے آپ کو ایک غلط چیز میں لگایا۔ اب مَیں ایک سال تک زمین پر نہیں لیٹوں گا۔

حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک صاحب آئے اور ان کے کمرہ کے اوپر نظر کی تو دیکھا کہ کمرہ کی کڑی (جس کو گجراتی میں (વળી) کہتے ہیں) ٹوٹی ہوئی تھی۔

انہوں نے کہا کہ حضرت! یہ کب ٹوٹی؟ انہوں نے کہا کہ مَیں نے بیس سال سے اوپر دیکھا ہی نہیں ہے۔ گویا انہوں نے ایسی فضول نظر سے بھی اپنے آپ کو بچایا تھا۔ اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ادھر اُدھر دیکھے بغیر ہمیں چلتا ہی نہیں ہے۔

یہ حضرات اپنے آپ کو ایسی غیر ضروری چیزوں سے بچانے کا بڑا اہتمام کرتے تھے

بہر حال! ایسے اقوال، افعال اور اشیاء جن میں دنیا یا آخرت کا کوئی فائدہ نہیں ہے ان سب کو ''لایعنی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایسی چیزوں سے بچنا بھی بہت ضروری اور اہم ہے اسی کو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿مِنْ حُسْنِ اِسْلاَمِ الْمَرْءِ تَرْکُهُ مَالاَ یَعْنِیْهِ﴾

یہاں دیکھو! لایعنی کو عام رکھا ہے، یہ بھی نبی کریم ﷺ کے کلام کی بلاغت ہے کہ صرف بات کے ساتھ مخصوص نہیں کیا، بلکہ فرمایا کہ ''لایعنی'' کو چھوڑ دے۔ اب لایعنی بات ہو تو اس کو بھی چھوڑنا چاہیے، لایعنی فعل اور کام ہو تو اس کو بھی چھوڑنا چاہیے، لایعنی چیز ہو تو اس کو بھی چھوڑنا چاہیے۔ کوئی بھی لایعنی ہو اس سے اپنے آپ کو دور رکھنے کا اہتمام کیا جائے

بہر حال! یہ ارشاد نبی کریم ﷺ کے جامع کلمات میں سے ہے اور آپ ﷺ کی ان تعلیمات اور ارشادات میں سے ہے جس میں الفاظ بہت کم ہیں اور تعلیم بہت بڑی دی گئی ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر مجھے آپ کو عمل کی توفیق وسعادت نصیب فرمائے

مراقبہ
مجلس ﴿۴﴾

﴿اقتباس﴾

جو عورتیں تمہارا حکم نہیں مانتیں، تمہاری بات کے خلاف کرتی ہیں؛ ان کی اصلاح کے لئے کیا طریقہ اپنایا جائے؟

پہلے درجہ پر تو قرآنِ مجید فرماتا ہے: ﴿فَعِظُوهُنَّ﴾ اس کو نصیحت کرو اور سمجھاؤ، فہمائش سے کام لو۔ اگر اس سے کام چل جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ پھر آگے اور کوئی اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر اس سے کام نہیں چلا تو ﴿وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ بستر الگ کر دو۔ یہ بھی بڑا مؤثر علاج ہے۔

اور تیسرا درجہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَاضْرِبُوهُنَّ﴾ ان کی پٹائی کر سکتے ہو۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے پٹائی کو پسند نہیں فرمایا ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ:-

وہ آدمی کیسا ہے کہ دن میں تو اپنی بیوی کی پٹائی کرے، اور رات میں اسی کو اپنے پہلو میں لے کر اس سے سکون حاصل کرے۔ بھلا یہ کوئی شرافت کی بات ہے؟ یعنی ایک شریف آدمی کی شرافت اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی کہ دن میں پٹائی کر کے جس کا دل دُکھایا ہے، رات کو اسی کو پہلو میں لے کر سو رہا ہے اور اس سے سکون حاصل کر رہا ہے اس لئے حضور ﷺ پٹائی کو پسند نہیں فرماتے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿مراقبہ ۴﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد.

عن عمر رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لَایُسْأَلُ الرَّجُلُ فِیْمَاضَرَبَ اِمْرَأَتَہٗ. (رواہ أبوداؤد وغیرہ)

اس باب کا عنوان ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی ذات کا دھیان اور استحضار رکھتے ہوئے اس بات اہتمام کرے کہ جس موقعہ پر جو حکم اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے؛ اس کو بجالانے کی پوری کوشش ہو۔ اوامر کو انجام دے، اور نواہی سے بچنے کا اہتمام کرے۔ گویا اس تصور کو اپنے دل و دماغ میں ہر وقت تر وتازہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں؛ اسی کو مراقبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی ضمن میں یہ آخری روایت پیش کی ہے

﴿میاں بیوی کے آپسی معاملات میں دخل نہ دیا جائے﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے۔ یہاں ابوداؤد شریف کے حوالے سے اس روایت کو پیش کیا ہے جو مختصر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس روایت کے نقل کرنے والے حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ ہیں جو صحابی ہیں۔

ابن ماجہ شریف میں یہ روایت تفصیل سے ہے۔ حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں مہمان ہوا۔ دیر گئے رات کو دیکھا کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بیوی کی پٹائی کررہے ہیں۔ مَیں اٹھا اور دونوں کا بیچ بچاؤ کردیا، معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ جب مَیں اپنے بستر کی طرف واپس آنے لگا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دیکھو! میری ایک بات سنو۔ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی آدمی اگر اپنی بیوی کی پٹائی کرے؛ تو اس سے وجہ نہ پوچھی جائے کہ آپ نے اپنی بیوی کی پٹائی کیوں کی۔ (ابن ماجہ شریف، ۱۹۷۶)

دراصل بات یہ ہے کہ میاں بیوی کے آپسی معاملات میں بہت ساری باتیں وہ ہیں جن کا دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا؛ حیاء اور شرم کے ساتھ ساتھ رازدارانہ تعلقات کے تقاضے کے بھی خلاف ہے۔ شوہر کو اپنی بیوی کی طرف سے ناگواری کی بعض باتیں ایسی پیش آسکتی ہیں جس کی وجہ سے اس کو ناراضگی ہو، اور وہ اس پر بیوی کو تادیب اور سزا دینا چاہتا ہے، لیکن وہ چیز ایسی نہیں ہے جس کا دوسرے کے سامنے اظہار کیا جاسکے۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں ایک اصولی بات بتلادی کہ اگر شوہر بیوی کی پٹائی کررہا ہے تو اس سے یہ نہ پوچھا جائے کہ تو نے اس کی پٹائی کیوں کی۔ لیکن یہ تو ایک عام حکم ہے۔ اگر معاملہ آگے بڑھ جائے اور یہ بات حاکم کی عدالت میں پہنچے اور حاکم واقعہ کی تحقیق اور تفتیش کے طور پر پوچھنا چاہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔

﴿ کیا بیوی کی پٹائی جائز ہے؟ ﴾

رہا معاملہ پٹائی کا کہ شوہر بیوی کی پٹائی کرسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کرسکتا ہے تو کب کرسکتا ہے؟ اور کن صورتوں میں اس کو اجازت ہے؟ تو اس سلسلے میں قرآنِ پاک ہی میں اللہ تعالیٰ نے پٹائی کرنے اور نہ کرنے والے مسئلے کو واضح کردیا ہے۔

ابوداؤد شریف ہی کی ایک دوسری روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام ﷡ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لاتَضْرِبُوْا اِمَآءَ اللہِ﴾ اللہ کی بندیوں کی پٹائی نہ کرو۔ گویا عورتوں کی پٹائی کرنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمادیا۔ آپ ﷺ کی اس ہدایت پر کچھ وقفہ گذرا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ﴿ذَئِرْنَ النِّسَآءُ عَلٰی أَزْوَاجِهِنَّ﴾ (سنن ابوداود، حدیث نمبر ۱۸۳۴) عورتیں اپنے شوہروں پر جری اور بے باک ہوگئیں یعنی آپ نے پٹائی سے منع کردیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو معلوم ہوگیا کہ اب ہم کچھ بھی کریں، ہمارا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے، تو شوہروں کے ساتھ ان کو جو اطاعت وفرمانبرداری کا معاملہ کرنا چاہیے، اور ان کا جو ادب واحترام ملحوظ رکھنا چاہیے؛ وہ بات نہیں رہی۔

انسان کے مزاج کا تقاضہ ہے کہ وہ ہمیشہ اسی کی بات مانتا ہے، جس کی طرف سے کسی قسم کا دباؤ اور سختی کا اندیشہ ہو۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا؛ وہاں آدمی جری ہوجاتا ہے۔ بعد میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے پٹائی کی اجازت بھی ملی۔ خیر! یہ انسان کا ایک مزاج ہے۔

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں ایک اللہ والے کا قصہ لکھا ہے، وہاں ضمناً ایک بات فرمائی ہے کہ اللہ والوں کی بیویاں ''ڈیڑھ خصم'' ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ بے چارے ہمیشہ اسی فکر اور ادھیڑ بن میں ہوتے ہیں کہ ہماری طرف سے ان پر کوئی زیادتی نہ ہوجائے، اسی لئے ہمیشہ ان کی رعایت کا اہتمام کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سر پر سوار ہوجاتی ہیں۔ ویسے ایک روایت بھی ہے اگرچہ وہ قوی نہیں ہے جس میں یہ ہے: ﴿یَغْلِبْنَ الْکِرَامَ وَیَغْلِبُهُنَّ اللِّئَامُ﴾ (عنایہ شرح ہدایہ ۲/۱۵۴) شریفوں پر یہ غالب آتی ہیں اور کمینے ان پر غالب آتے ہیں۔ اور آج کل تو ماشاء اللہ سب ہی شریف ہیں۔ بہر حال! اللہ والوں کے یہاں ان کے حقوق کا بڑا اہتمام اور رعایت ہوا کرتی ہے اس لئے وہاں یہ بات پائی جاتی ہے۔

خیر! جب نبی کریم ﷺ کی طرف سے یہ ہدایت جاری کی گئی کہ ان کی پٹائی مت کرو تو ظاہر ہے کہ صحابہ کیسے پٹائی کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی طرف سے شوہروں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہونے لگی، اور جرأت و بے باکی کا مظاہرہ ہونے لگا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آکر نبی کریم ﷺ سے شکایت کی۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے ان کی پٹائی کی اجازت دی۔ دوسرے ہی دن حضراتِ ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین کے یہاں عورتوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ہر ایک اپنے شوہروں کی شکایت لے کر حاضر ہوئیں اور بتلانے لگیں کہ مجھے یہاں مارا، یہاں مارا اور یہ ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہاں عام دستور یہی تھا کہ کسی عورت کو کوئی بات پیش کرنی ہوتی تو ازواجِ مطہرات میں سے کسی کے واسطے سے اپنی بات نبی کریم ﷺ تک پہنچایا کرتی تھیں۔ جب نبی کریم ﷺ کے پاس یہ شکایتیں پہنچیں تو آپ ﷺ نے اپنے بیان میں فرمایا: بھائی! آج تو ہمارے گھروں پر عورتوں کی بھیڑ لگ گئی، لہٰذا جو لوگ اپنی بیویوں کی پٹائی کرتے ہیں؛ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔

﴿ بیویوں کی سرزنش کی قرآنی ترتیب ﴾

بہرحال! قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے اس مسئلے کو صاف کر دیا ہے: ﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ. فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَاتَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلاً﴾ جن عورتوں کی طرف سے زیادتی، نافرمانی اور سرکشی کا تمہیں اندیشہ ہے یعنی جو تمہارا حکم نہیں مانتیں، تمہاری بات کے خلاف کرتی ہیں؛ ان کے لئے کیا طریقہ اپنایا جائے؟

﴿ عورتوں کی اصلاح کا پہلا درجہ ﴾

پہلے درجہ پر تو قرآنِ مجید فرماتا ہے: ﴿فَعِظُوْهُنَّ﴾ اس کو نصیحت کرو اور سمجھاؤ،

فہمائش سے کام لو۔ اگر اس سے کام چل جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ پھر آگے اور کوئی اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ﴿اَلسَّیُفُ آخِرُالُحِیَل ﴾ سختی کا معاملہ تو آخر میں ہوا کرتا ہے، اگر اس سے کام چل گیا تو فبہا۔

﴿ عورتوں کی اصلاح کا دوسرا درجہ ﴾

اگر اس سے کام نہیں چلا تو ﴿وَاهُجُرُوُهُنَّ فِی الُمَضَاجِعِ﴾ بستر الگ کر دو۔ یہ بھی بڑا مؤثر علاج ہے۔ عام طور پر مردوں سے یہ تو ہوتا نہیں ہے۔ اگر یہ علاج اپنائیں تو پٹائی کی ضرورت پیش ہی نہیں آئے گی۔ مَیں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اس علاج میں آدمی کو خود بھی کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے نا، اس لئے لوگ اس کو اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ یہ بڑا مؤثر علاج ہے۔ اس لئے قرآنِ پاک کی جو ترتیب ہے اس کو اپنایا جائے۔ نبی کریم ﷺ نے خود بھی اس پر عمل کیا ہے۔

﴿ حضورِ اکرم ﷺ کا ازواجِ مطہرات سے ناراضگی کا واقعہ ﴾

بخاری شریف میں روایت موجود ہے۔ ازواجِ مطہرات میں سے بعضوں کی طرف سے بہت سارے معاملات جمع ہو گئے تھے۔ ایک موقعہ پر یہ ہوا تھا کہ سب نے مل کر اپنے نفقات میں زیادتی کا مطالبہ پیش کیا اور حضور ﷺ کے سامنے اپنی ڈیمانڈ کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی درمیان حضور ﷺ کی آواز پر ان کی آواز بلند ہو گئی۔ اور بھی معاملات پیش آئے تھے۔ جب بہت ساری چیزیں جمع ہو گئیں؛ تو نبی کریم ﷺ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے قسم کھالی کہ مَیں ایک مہینہ تک تم میں سے کسی کے قریب نہیں آؤں گا۔ آپ کا ایک بالا خانہ تھا سب کو چھوڑ کر آپ اس میں چلے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ

نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی۔ اس واقعہ سے مسلمانوں پر بڑا اثر ہوا تھا۔ بعضوں پر تو گریہ و بکا طاری ہو گیا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۴۵۳۲)

﴿علمی فوائد سے مستفید ہونے کا ایک طریقہ﴾

بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہی یہ واقعہ منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میرا ایک پڑوسی تھا جس سے مَیں نے یہ معاملہ کر رکھا تھا کہ ایک دن تم نبی کریم ﷺ کی مجلس میں حاضری دو گے، اور وہاں جو باتیں حضور ﷺ سے سنو گے، وہ مجھے بیان کرو گے۔ اور ایک دن مَیں حاضری دوں گا، اور وہاں جو باتیں حضور ﷺ سے سنوں گا، وہ مَیں تم کو بتلاؤں گا۔ ایسا اس لئے کیا تھا تا کہ ہر ایک اپنا کام کاج بھی کر سکے، کسی کے کاروبار، کھیتی باڑی، تجارت وغیرہ کا بھی حرج نہ ہو، اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات وارشادات بھی ہر ایک کو پہنچتے رہیں۔ علم حاصل کرنے اور علمی فوائد سے مستفید ہونے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز جب میرے پڑوسی کی باری تھی، رات کے وقت وہ آیا اور زور زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ مَیں نے پوچھا کہ بھائی! کیا بات ہے؟ کیا غسانی آ گئے؟

اس زمانہ میں شام کی طرف سے مدینہ منورہ پر حملہ کا اندیشہ تھا اور ہر وقت ہم سہمے ہوئے رہتے تھے کہ پتہ نہیں کب وہ آ کر حملہ کریں گے۔ جب وہ ساتھی زور زور سے میرا دروازہ ٹھوک کر پوچھ رہا تھا کہ عمر ہیں؟ تو اس کی اس بے صبری کے ساتھ دروازہ ٹھوکنے کی وجہ سے مَیں سمجھا کہ وہ آ گئے ہیں، اس لئے مَیں نے پوچھا کہ کیا غسانی آ گئے؟ تو اس نے کہا کہ اس سے بھی زیادہ اہم معاملہ پیش آ گیا ہے۔ مَیں نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ تو اس نے کہا:

نبی کریم ﷺ نے اپنی بیویوں سے علاحدگی اختیار کرلی ہے۔مَیں نے پوچھا: کیا طلاق دے دی؟اس نے کہا: یہ تو معلوم نہیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے پہلے ہی سے یہ اندیشہ تھا کہ ایسا کچھ ہوگا۔یہ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ اس سے پہلے خود ان کا ایک معاملہ پیش آچکا تھا۔

﴿مکی مدنی عورتوں کے مزاج کا فرق﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم مکہ کے رہنے والے قریشی لوگ عورتوں کو کوئی زیادہ حیثیت دیتے نہیں تھے،اور نہ ان کو یہ حق تھا کہ وہ ہمارے معاملات میں دخل دیں اور نہ وہ ہمارے سامنے کچھ بول سکیں۔اس کے برخلاف جب ہم ہجرت کرکے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے تو یہاں دیکھا کہ عورتوں کا اپنے شوہروں پر بڑا اثرورسوخ ہے۔جب ہماری عورتیں یہاں آئیں تو انہوں نے بھی اپنی سہیلیوں سے سیکھنا شروع کیا۔یہ تو ہوتا ہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں اپنے کسی معاملہ میں سوچ رہا تھا،اور میری بیوی کو پتہ تھا کہ مَیں کس سلسلے میں متفکر ہوں۔اس نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ یوں کرلو؛ تو مناسب ہے۔گویا اس نے بغیر پوچھے ہی مجھے رائے دی۔اس کے اس طرح بولنے پر مجھے طیش آگیا اور مَیں نے کہا: اچھا! تمہاری یہ جرأت ہوگئی کہ میرے معاملہ میں مجھے مشورہ دینے لگی؟ جب مَیں نے اس کو ڈانٹا تو اس نے کہا: اے عمر! تم بھی عجیب آدمی ہو،مَیں نے ایک بھلی بات کہی جو تمہارے خیر کی ہے؛ اس پر تم ناراض ہو رہے ہو؟ اور نبی کریم ﷺ کی ازواج کبھی حضورِ اکرم ﷺ سے کسی بات پر ناراض ہوجاتی ہیں تو کئی کئی دن تک حضور سے بات نہیں کرتیں، کٹّی کرلیتی ہیں۔مَیں نے کہا: اچھا! ایسا ہوتا ہے؟ تب تو وہ بڑے خسارہ میں ہیں۔ ان کو تو سمجھانا چاہیے۔

میری بیٹی حفصہ بھی ازواجِ مطہرات میں سے تھی، اس لئے مجھے پہلے اس کی فکر ہوئی لہٰذا مَیں نے تو چادر لی اور فوراً بیٹی کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ ایسا ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! ہوتا ہے۔ مَیں نے کہا: ایسا مت کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کے رسول کی ناراضگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں اور تمہارا بیڑا غرق ہو جائے۔ اگر تم کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا، مَیں لا دیا کروں گا۔ تم خود حضور ﷺ سے ایسا کوئی مطالبہ مت کیجیو۔

ان کو سمجھا کر مَیں ازواجِ مطہرات میں سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا۔ ان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کچھ رشتہ داری تھی۔ جب ان کے پاس جا کر مَیں نے سمجھانے کیلئے بات شروع کی تو انہوں نے تو میرے حوصلے ہی پست کر دیے۔ انہوں نے کہا: اے عمر! تمہارا بھی عجیب حال ہے؟ تم ہر چیز میں دخل دیتے ہو؟ کیا ہماری اصلاح اور درستگی کیلئے نبی کریم ﷺ کافی نہیں ہیں کہ آپ آ کر ہمیں نصیحت کرتے ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایسا سخت جواب دیا کہ مَیں تو وہاں سے لوٹ ہی آیا، آگے کسی اور کے پاس گیا ہی نہیں۔

کیا نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق دی؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے یہ سب ہوا تھا، جب اپنے ساتھی سے یہ سنا تو مَیں مسجدِ نبوی میں گیا۔ حضور ﷺ نے تو علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ جب مَیں مسجدِ نبوی میں پہنچا تو دیکھا کہ کچھ صحابہ منبر کے پاس بیٹھے ہوئے اس واقعہ کی اہمیت کی وجہ سے رنج میں رو رہے ہیں۔ مَیں نے ان سے پوچھا: کیا نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی؟ انہوں نے کہا: ہمیں تو پتہ نہیں ہے لیکن حضور اکرم ﷺ بالا خانہ میں تشریف فرما ہیں۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ مَیں وہاں گیا تو دیکھا کہ بالا خانہ کے دروازے پر ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ مَیں نے

اس سے کہا کہ میرے لئے حضورِ اکرم ﷺ سے اجازت حاصل کرلو کہ عمر آئے ہیں اور اجازت چاہتے ہیں۔ وہ بچہ اندر گیا اور واپس لوٹ کر کہنے لگا کہ میں نے کہا لیکن حضور ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مَیں وہاں سے لوٹ کر مسجد میں آیا اور ان لوگوں کے پاس کچھ دیر بیٹھا۔ لیکن میری طبیعت میں چین نہیں تھا اس لئے مَیں دوبارہ گیا اور اس بچہ سے کہا کہ میرے لئے اجازت چاہو۔ پھر اس نے آ کر بتلایا کہ مَیں نے کہا لیکن حضورِ اکرم ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب چوتھی مرتبہ گیا تو اس نے آ کر یہی کہا۔ جب مَیں لوٹ رہا تھا تو اس نے دوڑ کر آ کر کہا کہ حضور ﷺ نے اجازت دے دی ہے، آپ اندر جا سکتے ہیں۔ مَیں اندر گیا اور آپ کے دروازے پر کھڑے ہو کر پہلا سوال تو مَیں نے یہ کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ مارے خوشی کے مَیں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ گویا یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اس کے بعد مَیں نے حضورِ اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھ کر یعنی آپ کا مزاج اور موڈ دیکھ کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں کچھ بات کر سکتا ہوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! کر سکتے ہو۔ تو مَیں آگے بڑھا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے تو یہ ڈر ہی تھا کہ ایسا کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اور پھر وہ سارا واقعہ بیان کیا کہ پہلے مَیں نے اپنی بیٹی کو سمجھایا اور پھر جب حضرت ام سلمہ والا واقعہ سنایا اور ان کا جواب سنایا تو حضور بھی ہنسنے لگے۔ پھر اور بھی باتیں ہوئیں۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۲۲۸۸)

خیر! عورتوں کی اصلاح کا یہ دوسرا درجہ ہے۔ دیکھو! یہاں حضورا کرم ﷺ نے علاحدگی اختیار کرلی۔ بستر الگ کرنے کی دو شکلیں ہیں، ایک تو یہ کہ گھر میں رہتے ہوئے ہی اپنا بستر الگ کرلے، اور دوسری شکل یہ ہے کہ گھر میں سوئے ہی نہیں بلکہ دوسری جگہ چلا جائے۔ جیسے

مسجد میں چلا جائے، یا دوسرے مکان میں اور دوسرے فلیٹ میں سونا شروع کر دے۔ اب یہ تو موقع اور محل کے اعتبار سے اسی کو فیصلہ کرنا ہے کہ گھر میں رہتے ہوئے علاحدگی اختیار کرنے میں زیادہ اثر ہے، یا دوسری جگہ چلے جانے میں زیادہ اثر ہے۔

﴿عورتوں کی اصلاح کا تیسرا درجہ﴾

باری تعالیٰ آگے تیسرا درجہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ ان کی پٹائی کر سکتے ہو۔ یہ تو تیسرا اور آخری درجہ ہے۔ اسی لئے مَیں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ دوسرے نمبر کا علاج بستر الگ کرنے والا بہت مؤثر ہے، لیکن لوگ اس پر اپنی ہی کمزوری کی وجہ سے عمل نہیں کرتے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اگر دوسرے پر عمل کیا اور اثر نہیں ہوا تو پھر تیسرے کا نمبر آتا ہے، لیکن لوگ اس ترتیب پر عمل نہیں کرتے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی کیسا ہے کہ دن میں تو اپنی بیوی کی پٹائی کرے، اور رات میں اسی کو اپنے پہلو میں لے کر اس سے سکون حاصل کرے۔ بھلا یہ کوئی شرافت کی بات ہے؟ یعنی ایک شریف آدمی کی شرافت اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی کہ دن میں پٹائی کر کے جس کا دل دُکھایا ہے، رات کو اسی کو پہلو میں لے کر سو رہا ہے اور اس سے سکون حاصل کر رہا ہے۔ اس لئے حضور ﷺ پٹائی کو پسند نہیں فرماتے۔

﴿فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا﴾ اس کے بعد اگر وہ تمہاری اطاعت کر لیتی ہے اور تمہاری بات ماننے لگتی ہے؛ تو پھر آگے اور کوئی اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿معاشرتی امور میں نبی کریم ﷺ کا عملی نمونہ﴾

شراح فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی تشریح کے متعلق خود قرآنِ پاک نے یہ بتلایا

ہے:﴿وَأَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ﴾ قرآن کی تشریح نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور آپ کا عمل ہے۔لہٰذا معاشرتی امور میں تو نبی کریم ﷺ نے باقاعدہ عمل کر کے بتلایا۔ یہاں بھی دیکھئے کہ قرآنِ کریم کی اس آیت کی ترتیب پر آپ ﷺ نے کیسے عمل کیا۔ اس آیت میں تین باتیں کہی گئی ہیں۔نمبرایک﴿فَعِظُوْھُنَّ﴾اس پر بھی آپ نے عملی نمونہ پیش فرمایا۔اور نمبردو﴿وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ﴾ اس پر عمل کرنے کے معاملہ میں بھی آپ نے عملی نمونہ پیش فرمایا۔لیکن تیسری بات پر آپ نے کوئی عملی نمونہ پیش نہیں فرمایا۔ ہاں! زبان سے اجازت دی ہے۔

مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت حجۃ الوداع کے موقع کی موجود ہے اس میں یہ ہے کہ اگر نصیحت بھی کارگر نہ ہو اور بستر الگ کرنے سے بھی کام نہ چلے تو پھر ان کو ہلکی مار جس سے بدن پر نشان نہ آئیں؛ مار سکتے ہو۔(مسلم شریف،۱۶۲۸) آپ نے اپنے ارشاد سے وضاحت تو فرمائی،لیکن عملی طور پر ایسا کر کے نہیں بتلایا۔گویا آپ پٹائی والی شکل کو پسند نہیں فرماتے تھے۔

ویسے نبی کریم ﷺ کے پاکیزہ اخلاق کا تقاضہ بھی یہی تھا۔آپ ﷺ کے شمائل میں ہے کہ آپ نے کبھی کسی کو مارا نہیں ہے، نہ کسی عورت کو، نہ کسی غلام کو، نہ کسی جانور کو۔لہٰذا علماء فرماتے ہیں کہ پٹائی کی اجازت تو ہے لیکن نبی کریم ﷺ کی نگاہوں میں یہ چیز پسندیدہ نہیں ہے۔اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو اس طرح اپنی بیویوں کی پٹائی کرتے ہیں؛ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ہے:﴿خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِأَھْلِہٖ وَأَنَاخَیْرُکُمْ لِأَھْلِیْ﴾ تم

میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہوں، اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب میں سب سے اچھا سلوک کرنے والا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کے صبر وضبط کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ازواجِ مطہرات کے معاملہ میں بھی آپ نے یہ چیز کر کے دکھلائی۔

﴿تمہاری ماں کو غیرت آ گئی﴾

بخاری شریف میں ایک واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ازواجِ مطہرات میں سے کسی ایک کے یہاں تھے۔ اس روایت میں نام کی تصریح نہیں ہے۔ لیکن شراح نے لکھا ہے کہ غالباً حضرت عائشہؓ ہی کے یہاں تھے۔ دوسری زوجۂ مطہرہ کے یہاں سے کھانے کی کوئی چیز آئی۔ انہوں نے پکائی تھی، ان کی خادمہ دینے کے لئے آئی۔ حضور ﷺ جس زوجہ کے یہاں تھے ان کو بڑی غیرت آئی کہ میرے گھر کی باری میں انہوں نے یہ کیوں بھیجا؟ بس انہوں نے جو ایک جھاپٹ ماری تو وہ سب گر گیا، پیالہ بھی ٹوٹ گیا اور کھانے کی جو چیز بھیجی گئی تھی وہ بھی بکھر گئی۔ راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ گرا ہوا جمع کر رہے تھے اور فرما رہے تھے: ﴿غَارَتْ اُمُّكُمْ﴾ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۴۸۲۴) تمہاری ماں کو غیرت آ گئی۔ آپ اندازہ لگائیے کہ کیسا موقعہ تھا۔ ہے کوئی بڑے سے بڑا صبر وضبط کرنے والا؛ جو اس موقعہ پر کچھ نہ کرے؟ کچھ نہ کچھ تو بولے گا، یا کچھ نہ کچھ سزا دے گا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے کچھ نہیں کیا، بلکہ ان کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے آپ یہ فرماتے ہیں کہ تمہاری ماں کو غیرت آ گئی۔

یہاں غیرت کا مطلب یہ ہے کہ ہر عورت کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ میرے شوہر کے ساتھ میرا جو معاملہ ہے اس میں کسی دوسرے کی شرکت نہ ہو، یہاں تک کہ سوکن کی شرکت

کو بھی وہ گوارا نہیں کرتی۔ حالانکہ جیسے یہ اس کی بیوی ہے وہ بھی اس کی بیوی ہے۔

بہر حال! یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ آدمی اپنی بیوی کی پٹائی کرے تو اس بارے میں اس سے پوچھا نہ جائے، بشرطیکہ اس نے ان حدود و قیود کی رعایت کی ہو جو شریعت نے اس سلسلے میں بتلائی ہیں۔ اگر ان سے ہٹ کر کچھ کیا ہو؛ تو پھر اس کی کوئی رعایت نہ کی جائے گی، بلکہ اس سے باز پرس ہوگی۔

بیویوں کی پٹائی کے حدود و قیود

اب وہ حدود و قیود کیا ہیں؟ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو واضح کر دیا ہے۔ چنانچہ مَیں یہاں فقہاء کی ہی بات کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ شوہر کو اپنی بیوی پر کن کن چیزوں میں اختیار حاصل ہے؟

شوہر کی عزت و آبرو اور خود اس کے نفس اور شوہر کے مال و زر کی حفاظت اور شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کے معاملہ میں اگر عورت کی طرف سے کوئی کوتاہی ہو؛ تو شوہر تادیب یعنی معمولی سزا کے طور پر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ بیوی کی طرف سے کوئی ایسا قصور پیش آوے کہ جس میں شریعت نے کوئی سزا مقرر نہ کی ہو۔ مثلاً عزت و آبرو کا معاملہ ہے کہ خدانہ کرے کہ عورت زنا کی مرتکب ہوگئی، اور زنا شرعی طور پر ثابت بھی ہوگیا تو وہاں شریعت کی طرف سے سزا مقرر ہے، وہی دی جائے گی۔ شوہر کو اپنی طرف سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر شوہر مناسب سزا دے سکتا ہے۔ اس میں اتنا ضرور خیال رکھا جائے کہ سخت قسم کی پٹائی نہیں ہونی چاہیے۔

کن کن چیزوں میں شوہر بیوی کی پٹائی کر سکتا ہے؟ تو ان چیزوں میں سے ایک تو یہ

ہے کہ شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت اس کے لئے زیب وزینت کرے۔یعنی شوہر کے سامنے اچھے کپڑے پہن کراور مزین ہوکر آوے،لیکن عورت اس کا اہتمام نہیں کرتی۔میلی کچیلی بھوتنی بنی رہتی ہے۔

﴿عورتوں کی اُلٹی چال﴾

عورتوں کا بھی عجیب مزاج ہے کہ اجنبیوں کے سامنے مزین ہوکر جائیں گی۔مثلاً گھر سے باہر نکلنا ہوتو کام دس منٹ کا ہوگا اوراس کے لئے تیاری ایک گھنٹہ تک کرے گی۔ اچھے کپڑے پہنے گی،زیورات سے آراستہ ہوگی،اورسب تیاری کرے گی۔بے چارہ شوہر؛ جس کے پیسوں سے یہ سب آیا ہے،کپڑے اورزیوراسی نے تو خرید کردئے ہیں،زیب و زینت کا سامان بھی اسی کے پیسوں سے آیا ہے،وہ تو اس کا جلوہ دیکھنے کو ترستا ہی رہتا ہے،اور یہ عورت مزین ہوکر ساری دنیا کے سامنے آتی جاتی ہے۔یہ بھی عورتوں کی بڑی عجیب نفسیات ہے،جس کی اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔شریعت نے عورت کو شوہر کے علاوہ کسی اور کے سامنے زیب وزینت کے ساتھ آنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

بلکہ حدیثِ پاک میں تو آتا ہے۔نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی عورت اگر خوشبو لگا کر اجنبیوں کے بیچ میں سے گذرتی ہے،تو وہ ایسی ایسی ہے یعنی زانیہ ہے۔(ترمذی۲/۱۰۶) گویا اس کی خوشبو جب غیروں کی قوتِ شامّہ تک پہنچے گی،تو ان کے دل میں اس کی طرف شہوت کے جذبات بھڑکیں گے۔تو وہ عورت ان کے دلوں میں برے خیالات پیدا کرنے والی بنی، اس لئے اس پر اتنی سخت وعید ہے۔

اسی لئے عورت کو گھر سے باہر بے پردہ نکلنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ضرورت

کے موقع پر پردے اور حجاب کے ساتھ اور میلے کچیلے کپڑوں میں نکلنے کی اجازت ہے۔اس لئے مَیں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر شریعت کی ان ہدایتوں کا لحاظ کیا جائے تو عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا ہی بند ہو جائے۔اگر کوئی عورت گھر سے باہر نکلنے کی اجازت مانگے اور شوہر کہے کہ ان شرطوں کی رعایت کرتے ہوئے جانا ہو تو جاؤ۔تو عورت کہے گی کہ اگر ایسے ہی جانا ہے؛ تو پھر کون جاوے؟ چلو رہنے دو۔تو شوہر بھی کہہ دے کہ اچھا ٹھیک ہے، پھر تو باہر جانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔

﴿ان صورتوں میں پٹائی کی اجازت ہے﴾

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ عورت کو شوہر کے لئے زیب وزینت کرنا چاہیے، لیکن اگر وہ نہیں کرتی تو اس پر شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ عورت اگر حیض ونفاس میں نہیں ہے، بلکہ پاک ہے۔اور بیمار بھی نہیں ہے۔اور شوہر چاہتا ہے کہ اس سے صحبت کرے لیکن وہ تیار نہیں ہوتی؛ تو اس صورت میں بھی شریعت نے اس کی پٹائی کرنے کی اجازت دی ہے۔

تیسرا یہ کہ کسی اجنبی کے سامنے اپنا چہرہ کھلا رکھ کر آتی ہے اور وہاں فتنہ کا اندیشہ ہے تو اس پر بھی شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

چوتھے یہ کہ کسی معاملہ میں شوہر سے الجھ کر شوہر کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔اگر ایک دو لفظ ہی بولے ہیں تو کچھ نہ کرے۔لیکن زیادہ جری بن کر وہ لپٹ گئی اور اس نے شوہر کے کپڑے ہی پھاڑ ڈالے؛ تو اس پر بھی شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

پانچویں یہ کہ کسی اجنبی سے بات کرتی ہے اور وہاں فتنہ کا اندیشہ ہے تو اس صورت

میں بھی شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

چھٹے یہ کہ شوہر کے ساتھ کسی معاملہ میں الجھ رہی ہے اور جھگڑ رہی ہے اور زور زور سے بول رہی ہے۔ یا شوہر سے اتنی زور سے بات کرتی ہے کہ اس کی آواز باہر اجنبیوں تک پہنچتی ہے؛ تو شوہر کو چاہیے کہ اس کو روکے۔ اگر نہیں رکتی تو اس پر بھی شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

ساتویں یہ کہ کھانے پینے کی چیزیں اجنبیوں کو دیتی ہے۔ اس میں ذرا تفصیل ہے، ایک تو یہ ہے کہ گھر میں کھانے کی جو چیزیں بنتی ہیں، وہ کسی مانگنے والے کو یا ضرورت مند کو دینے کا یا پڑوسی کے یہاں بھیجنے کا عرف اور رواج ہے۔ مثلاً کچھ اچھا کھانا پکا، تو ایک پلیٹ پڑوسی کے یہاں بھی بھیج دی۔ تو شریعت بھی اس کی تاکید کرتی ہے۔ یا کوئی بھوکا فقیر اور مسافر آیا تو اس کو کچھ دے دیا۔ تو عام طور پر جتنا دینے کا رواج ہے، اتنی ہی مقدار میں دیتی ہے تو اس کے لئے شوہر کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ رواج اور عرف ہی شوہر کی طرف سے اجازت سمجھی جائے گی، الا یہ کہ شوہر نے اس سے بھی صاف لفظوں میں منع کر دیا ہو؛ تو پھر نہ دیا کرے۔ ورنہ رواج کی وجہ سے اتنا دینے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ دینے کی اجازت نہیں۔ لیکن اگر اس سے زیادہ دیتی ہے اور کہنے کے باوجود نہیں مانتی؛ تو اس غلطی پر بھی شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

آٹھویں یہ کہ چھوٹے ناسمجھ بچے کے رونے پر اس کی پٹائی کرتی ہے اور اس کو مارتی ہے۔ شوہر منع کرتا ہے کہ مت مارو، پھر بھی مانتی نہیں ہے؛ تو اس غلطی پر بھی شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

نویں یہ کہ شریعت نے جہاں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی، وہاں بلا وجہ شوہر کی بغیر اجازت کے گھر سے باہر نکلتی ہے؛ تب بھی شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

دسویں یہ کہ شوہر کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی سے پیش آتی ہے، برا بھلا کہتی ہے گالیاں دیتی ہے،تو اس پر بھی شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

گیارہویں یہ کہ نماز چھوڑتی ہے، یا غسلِ جنابت نہیں کرتی اور ناپاک ہی رہتی ہے تو اس پر بھی اس کی پٹائی کی جاسکتی ہے۔

گویا یہ وہ امور ہیں جن میں بطورِ تنبیہ کے شوہر بیوی کی پٹائی کر سکتا ہے۔

﴿یہ جائز نہیں﴾

خیر! یہاں بات اس پر چل رہی تھی کہ شوہر کو اپنی عورت پر کن چیزوں میں اختیار حاصل ہے۔عورت اپنے ذاتی مال میں اپنے طور پر کچھ تصرف کرتی ہے تو شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔اس میں اگر شوہر کی طرف سے کوئی جبر کیا جائے گا تو وہ شرعاً جائز نہیں ہے۔مثلاً باپ نے یا بھائی نے اس کو ہدیہ دیا ہے، یا وراثت میں اس کو کچھ ملا ہے؛ تو اس مال میں وہ جو چاہے تصرف کرے۔وہ اس کا ذاتی مال ہے۔

ہمارے سماج میں یہ ایک مصیبت ہے کہ لڑکی کو باپ کے یہاں سے کچھ مل رہا ہے اور وہ اس میں اپنی مرضی سے کچھ تصرف کرنا چاہتی ہے؛ تو شوہر اس میں آڑے آتے ہیں۔ تو شرعاً شوہر کو اس میں آڑے آنے کی اجازت نہیں ہے۔اگر شوہر ایسا کرتا ہے تو شریعت کی مقرر کردہ حدود کو توڑنے والا سمجھا جائے گا۔وہ اس عورت کا اپنا مال ہے،شرعی حدود میں رہ کر وہ جس طرح چاہے تصرف کر سکتی ہے۔ویسے اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ اپنے مال کو کہیں اچھے کام میں خرچ کرنا چاہتی ہے تو شوہر سے مشورہ کرلے۔لیکن شوہر کو اس پر پابندی لگانے کا اور روک ٹوک کرنے کا حق نہیں ہے۔اس لئے کہ اپنے مال کی مالک وہ خود ہے۔اور شوہر اس سے وہ مال جبراً لے بھی نہیں سکتا۔

ہمارے سماج میں بہت سے لوگ زبردستی بیوی کا مال لے لیتے ہیں۔اس کے پاس اس کے باپ کے یہاں سے آیا ہے، یا وراثت میں ملا ہے تو شوہر یہ چاہتا ہے کہ مَیں لے لوں اور اس پر قبضہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں،اس بے چاری کو تصرف کرنے نہیں دیتے؛ یہ جائز نہیں ہے۔یہ ظلم ہے۔اس کی رضا اور خوشنودی کے بغیر ایسا نہیں کر سکتے۔

﴿ گھر سے باہر نکلنے کے لئے کب شوہر کی اجازت کی ضرورت نہیں ﴾

اب یہ بات رہ گئی کہ کن صورتوں میں بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکل سکتی ہے؟ تو وہ درجِ ذیل ہیں:-

(۱) بیوی اپنے ماں باپ کی ملاقات کے لئے گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ویسے شوہر کو چاہیے کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ماں باپ کی ملاقات کے لئے جانے کی اجازت دے۔ اور عورت کو چاہیے کہ ملاقات کر کے خیر خیریت معلوم کر کے تھوڑی دیر میں واپس آجائے۔ وہاں ٹھہرے نہیں۔لیکن اگر شوہر اجازت نہیں دیتا تو بغیر اجازت کے بھی جا سکتی ہے۔لیکن جانے کی تمام شرطیں وہی ہیں کہ بے پردہ نہ جائے، زیب وزینت کر کے نہ جائے، پردے کے ساتھ حجاب کی رعایت کرتے ہوئے اور ایسا سادہ لباس پہن کر جو کسی لئے فتنہ اور کشش کا ذریعہ نہ بنے؛ ایسی ہیئت بنا کر جا سکتی ہے۔

(۲) ماں باپ کے علاوہ دوسرے جو محرم ہیں جیسے بھائی، چچا، ماموں وغیرہ ان کی ملاقات کے لئے سال میں ایک مرتبہ جانے کی اجازت ہے۔اگر شوہر جانے سے روکنا چاہے تو اس کو روکنے اجازت نہیں ہے، بلکہ جانے دینا پڑے گا۔اگر اجازت نہیں دیتا تو بغیر اجازت کے بھی جا سکتی ہے۔لیکن یہ یاد رہے کہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔صرف

ملاقات کر کے واپس آ جائے۔

(۳) اسی طریقہ سے یہ لوگ اگر ملاقات کے لئے شوہر کے گھر پر آ رہے ہیں تو شوہر انکار نہیں کر سکتا، اگر ہفتہ میں ایک بار آ رہے ہیں۔ لیکن اگر روزانہ آویں تو روک سکتا ہے۔ لیکن اپنے گھر میں ٹھہرنے سے روک سکتا ہے۔ اگر وہ لوگ گھر میں آ کر پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں تو منع بھی کر سکتا ہے کہ آپ ملاقات کر کے تشریف لے جائیے۔ اگرچہ یہ اخلاق کے مناسب نہیں ہے، لیکن ضرورت کی وجہ سے منع کرنے کی نوبت آوے؛ تو اس کی گنجائش ہے۔

(۴) اسی طریقہ سے عورت کے ماں باپ میں سے کوئی بیمار ہے، اور اس عورت کے سوا ان کی خدمت کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے، تو اگر شوہر منع کرے؛ تب بھی اس کی اجازت کے بغیر ان کی خدمت کے لئے جا سکتی ہے۔ اور جب تک ان کو ضرورت ہو تب تک وہاں ٹھہر بھی سکتی ہے۔ اس سے شوہر روک نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اگر ماں باپ غیر مسلم ہیں تو ان کی خدمت کے لئے بھی اس کو جانے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔

(۵) اسی طرح اس کا کوئی حق ہے جس کو وصول کرنے کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا پڑے۔ مثلاً اس کے پیسے کہیں سے لینے باقی ہیں اور ان کو وصول کرنے کے لئے کیس کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے کورٹ میں جانا پڑے؛ تو اگر شوہر انکار کرے تب بھی اس کے لئے جایا جا سکتا ہے۔

(٦) حج فرض ہو چکا ہے، اور اپنا فرض حج ادا کرنے کے لئے محرم کے ساتھ سفر کر رہی ہے تو شوہر کو روکنے کا حق نہیں ہے۔ اگر شوہر منع کرے تب بھی وہ جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ یہ شریعت کا مقرر کردہ فریضہ ہے، فرضِ عین ہے۔ اس کی ادائیگی سے شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔

(۷) کوئی دینی مسئلہ ضروری پیش آ گیا جیسے حیض ونفاس سے متعلق کوئی مسئلہ پیش آیااور دریافت کرنا ضروری ہے،اور شوہر خود عالم بھی نہیں ہے اور عالموں سے پوچھ کر بتلاتا بھی نہیں ہے۔ایک تو یہ ہے کہ خود عالم ہے اور مسئلہ بتا رہا ہے، پھر بھی وہ یوں کہتی ہے کہ مَیں تجھ سے نہیں بلکہ فلاں عالم سے پوچھوں گی؛تو یہ درست نہیں ہے۔دوسری شکل یہ ہے کہ خود عالم تو نہیں ہے لیکن اس نے کہہ رکھا ہے کہ تم کو کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو لکھ کر مجھے دو،مَیں جواب لا کر دوں گا،لیکن وہ مانتی نہیں ہے اور باہر نکلنا چاہتی ہے تو اس صورت میں تو روک سکتا ہے۔ لیکن نہ تو وہ خود عالم ہے کہ بتا سکتا ہو،اور نہ کسی عالم سے پوچھ کر لا کر بتاتا ہے؛تو اس صورت میں عورت مسئلہ پوچھنے کے لئے کسی دارالافتاء میں کسی مفتی کے پاس خود جانا چاہے؛تو جا سکتی ہے۔اب آج کل یہ ضرورت فون سے بھی پوری ہو سکتی ہے۔

(۸) جس گھر میں رہتے ہیں وہ گھر گرنے کے بالکل قریب ہو گیا ہے۔یا آگ لگ گئی،اگر اس گھر میں رہیں گے اور شوہر کی اجازت لینے کا انتظار کریں گے،تو گھر بھی جلے گا اور خود بھی جل جائے گی۔یا سیلاب آ گیا اور اس گھر کے گر جانے کا اندیشہ ہے،اگر اجازت کا انتظار کرے گی تو ڈوب جائے گی تو ان سب صورتوں میں شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا چاہے؛تو نکل سکتی ہے۔

بہر حال! یہ سب وہ صورتیں ہیں جس میں شریعت نے عورت کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔

تقویٰ
مجلس ۱

اقتباس

ہم لوگ لفظِ تقویٰ سنتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو بہت بڑی بات ہے
لیکن ایسا نہیں ہے۔
تقویٰ کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچائے
رات بھر تہجد پڑھنے کا نام تقویٰ نہیں ہے، بارہ مہینہ روزے رکھنے کا نام تقویٰ نہیں ہے
عبادت اور نوافل کی کثرت کا نام تقوی نہیں ہے
بلکہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچانے کا نام ہے
دیکھو! نیکی کے کام کر لینا بہت آسان ہے، لیکن گناہ سے بچنا بہت اہم چیز ہے
ابھی بڑی رات گذری تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ کبھی مسجد میں نہ آنے والے بھی پہلی صف میں ایسا قبضہ جما کر بیٹھ گئے کہ روزانہ کے پہلی صف والے بھی دیکھتے رہ گئے، ان کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ اور وہ لوگ مغرب سے لے کر آدھی رات تک برابر عبادت کے اندر لگے رہتے ہیں۔ رمضان المبارک کا مہینہ آئے گا تو برابر لگے رہیں گے۔
اگر آدمی ذرا سا ارادہ کر لے تو کچھ نفلیں پڑھ لینا، عبادت کے اندر مشغول ہو جانا، نیکی کے کام کر لینا؛ یہ سب بہت آسان ہے
لیکن اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچ جانا؛ یہ اصل چیز ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد:—

فاعوذباللہمن الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم

يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوااتَّقُوْااللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَاتَمُوْتُنَّ اِلَّاوَأَنْتُم مُّسْلِمُوْنَ.(آل عمران ۔ ۱۰۲)

یہ باب تقویٰ کے سلسلے میں قائم کیا ہے۔تقویٰ کے سلسلے میں قرآنِ پاک میں بہت ساری آیتیں ہیں۔اس کا حکم،اس کے فوائد اور تقویٰ کی نسبت سے مختلف چیزیں قرآنِ پاک کے اندر کثرت سے بیان کی گئی ہیں۔قرآنِ پاک میں تقریباً دوسو سے زیادہ مواقع ہیں؛ جہاں تقویٰ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

تقویٰ کیا ہے؟

تقویٰ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ڈر اور خوف کا آتا ہے۔بچنے اور پرہیزگاری کا معنیٰ بھی آتا ہے۔جیسے بیماری میں پرہیز ہوتا ہے یعنی اس کے استعمال سے آدمی بچتا ہے اوراس کا ارتکاب کرنے سے ڈرتا ہے کہ اگر یہ کرلوں گا تو کہیں بیماری بڑھ نہ جائے۔اصل ڈراورخوف کے معنیٰ میں آتا ہے۔اوراللہ تعالیٰ کے ساتھ لفظِ تقویٰ کا تذکرہ ہوتو وہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے آدمی کی طبیعت میں جو ڈر پیدا ہوتا ہے؛ وہ مرادلیا جاتا ہے۔مثلاً میں فلاں گناہ کا کام کرلوں تو اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔قرآنِ پاک

میں ہے:﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى﴾ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے اور اللہ تعالیٰ کے حضور حساب دینے کے تصور سے ڈرا، اور اس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکا؛ تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔ آدمی کے نفس کے اندر بڑی سے بڑی مضبوط خواہش پیدا ہو، لیکن جب یہ سوچ لے کہ اگر میں اس کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی کرلوں گا؛ تو مجھے اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہونا ہے اور اپنے کئے کا جواب دینا ہے، اس وقت کیا منہ دکھاؤں گا؟ یہی اللہ تعالیٰ کی عظمت کا تصور ہے۔

دیکھو! یہاں جہنم کی آگ کے ڈر سے یا عذاب کے ڈر سے بچنے کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے بچنے کا تذکرہ ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے بچا کہ اگر میں نے فلاں گناہ کا کام کرلیا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرلی؛ تو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوکر کیا منہ دکھاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے دل کے اندر خوف وڈر کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے آدمی گناہ اور نافرمانی سے اپنے آپ کو بچاتا ہے؛ اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

جہنم کی آگ اور عذابات وغیرہ سے ڈرنا بھی دراصل اسی وجہ سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مظہر ہیں۔ اصل تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے، وہ ناراض ہوگا تو ہمیں عذاب دے گا اور جہنم میں ڈالے گا۔ ایک مؤمن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ایسی عظمت ہونی چاہیے کہ اس کی ناراضگی سے اپنے آپ کو بچائے۔

جیسے اپنے بڑے، استاذ، باپ یا شیخ وغیرہ ہوتے ہیں کہ دل میں ان کی عظمت بھی

ہو اور محبت بھی ہو؛ تب ہی آدمی کوئی ایسی حرکت کرنے سے اپنے آپ کو روکتا ہے۔ سو بار سوچتا ہے کہ اگر ان کو پتہ چل گیا تو ان کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا؟ ان کو کیا جواب دوں گا؟ گویا ایسے کاموں کے کرنے کو ان کی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی عظمت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے بچانا اور نافرمانی سے اپنے آپ کو روکنا؛ اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

﴿حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مناقب﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا مقام حضراتِ صحابہ کے اندر بڑا اونچا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا: ﴿أَقْرَؤُهُمْ أُبَيٌّ﴾ (مستدرک، حدیث نمبر ۵۷۸۴) حضرات صحابہ میں قرآنِ پاک کے سب سے زیادہ اچھے پڑھنے والے اور علمِ قرآت کے ماہر حضرت ابی بن کعب ہیں۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ مَیں آپ کو ''سورۂ لم یکن الذین کفروا'' پڑھ کر سناؤں۔ انہوں نے عرض کیا: ﴿يَا رَسُوْلَ اللهِ! آللّٰهُ سَمَّانِيْ؟﴾ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر کہا کہ آپ ابی کو سنایئے؟ اس لئے کہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوں کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے صحابہ میں سے کسی کو یہ سورۃ پڑھ کر سنایئے اور آپ اپنے طور پر حضرت ابی بن کعب کا نام تجویز کرتے۔ گرچہ یہ شکل ہوتی تب بھی ان کے لئے بڑی سعادت اور فخر کی چیز ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطلق کہا گیا اور حضور کی نظر انتخاب ان پر پڑی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا اس لئے انہوں نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر کہا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: جی ہاں! اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام لے کر فرمایا ہے۔ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو آ گئے۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۳۵۲۵) خوشی کے آنسو بھی ہوا کرتے ہیں:

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بہر حال! یہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں، ان کا لقب سید الانصار ہے، بڑے فقہاءِ صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

﴿تقویٰ کی حقیقت﴾

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: تقویٰ کیا ہے؟ اس پر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ﴿أَسَلَكْتَ طَرِيْقاً ذَا شَوْكَةٍ﴾ کبھی کسی کانٹے دار راستہ پر سے گذرنے کی نوبت آئی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! ایسا تو بارہا ہوا ہے۔ کہا: اس وقت آپ نے کیا کیا؟ فرمایا: ﴿شَمَّرْتُ ثُمَّ اجْتَهَدْتُ﴾ اپنے کپڑوں کو خوب اچھی طریقہ سے لپیٹا اور بچ بچا کر نکل گیا۔ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿خَلِّ الذُّنُوْبَ كُلَّهَا، صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا؛ ذَاكَ التُّقٰى﴾ تمام گناہوں کو چھوڑ دو، چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں؛ اسی کا نام تقویٰ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، ۱/۱۶۴)

﴿تقویٰ ڈرنے کی چیز نہیں، ڈرنے کا نام ہے﴾

ہم لوگ لفظِ تقویٰ سنتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو بہت بڑی بات ہے؛ لیکن ایسا نہیں ہے۔ تقویٰ کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچائے۔ رات بھر تہجد پڑھنے کا نام تقویٰ نہیں ہے۔ بارہ مہینہ روزے رکھنے کا نام تقویٰ نہیں ہے۔ عبادت اور نوافل کی کثرت کا نام تقویٰ نہیں ہے۔ بلکہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچانے کا نام ہے۔ گناہ سے بچنا بہت اہم چیز ہے۔

﴿نیکی کے کام کر لینا بہت آسان﴾

دیکھو! نیکی کے کام کر لینا بہت آسان ہے۔ ابھی بڑی رات گذری تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ کبھی مسجد میں نہ آنے والے بھی پہلی صف میں ایسا قبضہ جما کر بیٹھ گئے کہ روزانہ کے پہلی صف والے بھی دیکھتے رہ گئے، ان کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ اور وہ لوگ مغرب سے لے کر آدھی رات تک برابر عبادت کے اندر لگے رہتے ہیں، رمضان المبارک کا مہینہ آئے گا تو برابر لگے رہیں گے۔ اگر آدمی ذرا سا ارادہ کر لے تو کچھ نفلیں پڑھ لینا، عبادت کے اندر مشغول ہو جانا، نیکی کے کام کر لینا؛ یہ سب بہت آسان ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچ جانا؛ یہ اصل چیز ہے۔

نفل کام کا حال ایسا ہے کہ آدمی اگر کرے گا تو ثواب ہے۔ اور اگر نہیں کیا تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ فلاں نفل کام آپ نے کیوں نہیں کیا۔ لیکن فرائض کے متعلق سوال ہوگا۔ اور گناہ سے بچنا ضروری اور فرض ہے، اور فرائض وواجبات کو انجام نہیں دے گا تو گناہ ہے۔ لہٰذا گناہ سے اپنے آپ کو بچانا ضروری اور فرض ہو گیا۔ اور گناہ کے متعلق لکھا ہے کہ اگر گناہ کا ارتکاب کر لیا، چاہے چھوٹا سا گناہ ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے اعتبار سے چھوٹا اور بڑا؛ دونوں برابر اور یکساں ہیں۔

﴿انگارہ اور چنگاری برابر﴾

ایک مرید نے اپنے شیخ سے پوچھا: بدنظری چھوٹا گناہ ہے یا بڑا؟ شیخ نے جواب میں کہا: کوئی آدمی چھوٹی سی چنگاری کو چھوٹی سمجھ کر اپنے کپڑوں کے باکس میں نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ کپڑے کے باکس کو جلانے کے لئے بڑا انگارہ ہو یا چھوٹی چنگاری ہو؛ دونوں کافی ہیں، جب آگ لگ جائے گی تو آپ کے گھر کو پھونک کر جائے گی۔

اور پھر آدمی یہ سوچے کہ مَیں کس کی نافرمانی کررہا ہوں؟ کس کا حکم توڑ رہا ہوں؟ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلالت، اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور بڑائی کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ کام کیسے ہوسکتا ہے؟ کسی چھوٹے کے سامنے آپ نے کوئی نامناسب حرکت کرلی؛ تو یہ کوئی گستاخی نہیں سمجھی جاتی، لیکن کسی بڑے کے سامنے ذراسی بے رُخی سے آدمی پیش آوے؛ تو یہ بھی بڑی گستاخی میں شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی شان کے اعتبار سے چھوٹا سا گناہ بھی چھوٹا نہیں ہے؛ بلکہ بڑا ہی کہا جائے گا۔ اور پھر یہ ہے کہ آدمی چھوٹا گناہ بار بار کرتا رہے؛ تو وہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے۔ بہرحال! گناہوں سے اپنے آپ کو بچانا؛ اسی کا نام تقویٰ ہے۔

﴿تقویٰ کے درجات﴾

علماء نے لکھا ہے کہ تقویٰ کے تین درجے ہیں:-

ایک درجہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کفروشرک سے بچائے، گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کفروشرک ہے، وہ ایسا گناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف نہیں کرتے جب تک کہ بندہ توبہ کرکے اس سے باز نہ آئے ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ یہ تقویٰ کا ادنیٰ درجہ ہے جو ہر مومن میں پایا جاتا ہے۔ جو مسلمان اپنے آپ کو کفروشرک سے بچا رہا ہے؛ وہ تقویٰ کے اس ادنیٰ درجہ پر فائز ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی ہر چھوٹے بڑے گناہ سے اور اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی سے اپنے آپ کو بچائے۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی غیراللہ کے تصور سے دل کو پاک وصاف رکھے۔ دل میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا خیال آنے ہی نہ دے۔ دل اسی لئے بنایا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ ہی کو جگہ دے، کسی اور کو جگہ نہ دے۔ یہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ ہے۔ یہ مقام اور درجہ

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔

بہر حال! تقویٰ کا خلاصہ اتنا ہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کا اہتمام کرے۔ اسی کو فرمایا: ﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ سے جیسے ڈرنا چاہیے؛ ایسا ڈرو۔ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو باز رکھو۔ ہر چھوٹے بڑے گناہ سے باز رکھنا آدمی کے لئے ضروری ہے۔

﴿تقویٰ اختیار کرنے کے فوائد﴾

تقویٰ اختیار کرنے پر جو فوائد مرتب ہوتے ہیں وہ بے شمار ہیں۔ قرآنِ پاک میں ان کو بیان کیا گیا ہے، جن میں سے چند فائدے پیش فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ﴾ جو آدمی اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اور گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے گا؛ تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیوی مصیبتوں سے بھی اور آخروی کی مصیبتوں سے بھی نجات کا راستہ نکالیں گے۔ اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیں گے جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔

آج لوگوں کی نگاہ میں روزی کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ اگر آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچالے تو اس کی ہر پریشانی دور ہو جائے گی۔ لوگ پریشانیوں کے شکار ہیں اور کہتے ہیں کہ میری فلاں پریشانی ہے، اس کے لئے کوئی نسخہ بتادو، کوئی وظیفہ بتادو۔ اس کا بہترین وظیفہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی ہر چھوٹی بڑی نافرمانی سے بچنے کا اہتمام کرلے۔

﴿موجودہ دور کی بڑی مصیبت﴾

آج کل ایک بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ گناہ کیا ہے اس سے بھی لوگ واقف نہیں ہیں

بہت سے کام تو ایسے کرتے ہیں کہ کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہی نہیں کہ مَیں گناہ کر رہا ہوں حالاں کہ گناہ سے بچنے کا نام تقویٰ ہے اور جو گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے گا، اللہ تعالیٰ ہر پریشانی سے نجات کا راستہ نکالیں گے، غیب سے سامان پیدا کریں گے۔ اور ایسی جگہ سے روزی دیں گے جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔

ایک تاجر تجارت کرتا ہے، اگر اس میں وہ جھوٹ بول رہا ہے، خیانت کر رہا ہے۔ تو دنیوی اعتبار سے بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ وہ ذرا آگے پیچھے کرلے گا تو زیادہ منافع ملے گا، نفع کا پرسنٹیج (%) بڑھ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جھوٹ بولنا، دھوکہ دینا، جھوٹی قسم کھانا اور تجارت کی لائن کے جتنے بھی گناہ ہیں، ان کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فائدہ زیادہ ہوگا، لیکن اگر وہ یہ سمجھ کر کہ یہ گناہ کے کام ہیں، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، اس لئے ان سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، تو اگر چہ بظاہر نفع کم مل رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس میں برکت دیں گے

کون فائدہ میں رہا؟

برکت کا مطلب کیا ہے؟ تھوڑی سی چیز سے اپنی ساری ضرورتیں پوری ہوجائیں؛ اسی کا نام برکت ہے۔ ایک آدمی رشوت لیتا ہے اور دوسرے غلط طریقے اپنا کر مہینہ کے پانچ ہزار کما کرلاتا ہے، لیکن اس کا حال یہ ہے کہ بیوی بیمار ہے، بچہ بیمار ہے، ڈاکٹر کے پاس گئے؛ تو دس طرح کے رپورٹ نکلوائے اور دو تین ہزار اسی میں چلے گئے۔ اور پھر اچانک کا کوئی ایسا حادثہ پیش آگیا کہ اس میں ہزار چلے گئے۔ اب لے دے کر دو ہزار بچے۔

اور ایک آدمی ایسا ہے جو دو ہزار ہی کماتا ہے اور اس سے اس کی ساری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، کبھی کوئی تکلیف و پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ تو غور کرو کہ کون فائدہ میں رہا۔ برکت کا خلاصہ یہی ہے۔

بہر حال! اگر تاجر اپنے آپ کو جھوٹ اور خیانت سے بچاتا ہے، شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے بچنے کا اہتمام کرتا ہے تو ظاہر کے اعتبار سے اگر چہ نفع کم نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا و آخرت میں نجات کا راستہ نکالیں گے، اور اس کی روزی میں بھی برکت دیں گے۔

﴿تجارت میں سچائی: ایمان لانے کا سبب﴾

کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ کپڑوں کا ایک تاجر تھا، اس زمانہ میں ایک مشہور دلال تھا جس کا نام احمد بن حبیب تھا۔ انہوں نے کپڑوں کا ایک بڑا تھان اس کو دیا اور کہا: اس میں فلاں عیب ہے جس کے ہاتھ بھی فروخت کرو، اس کو بتا کر دینا۔ احمد بن حبیب نے وہ تھان بیچ دیا اور عیب بتانا بھول گئے۔ جب قیمت حوالے کی تو انہوں نے پوچھا: وہ عیب بتا دیا تھا؟ اس نے کہا: وہ عیب بتانا تو مَیں بھول ہی گیا۔ پوچھا: کس کے ہاتھ بیچا ہے؟ کہا: ایک قافلہ بغداد کی طرف جا رہا تھا اس میں ایک شخص کے ہاتھ بیچا ہے، اور وہ قافلہ تو روانہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے ایک تیز رفتار گھوڑا لیا اور بغداد کا راستہ پکڑا، دو دن کے بعد اس قافلہ میں پہنچے اور اعلان کیا کہ فلاں قسم کے کپڑے کا تھان تم میں سے کس نے خریدا ہے؟ ایک آدمی نے بتلایا: مَیں نے خریدا ہے۔ کہا: دیکھو! مَیں نے وہ تھان جس آدمی کو فروخت کرنے کیلئے دیا تھا اس کو کہہ رکھا تھا کہ اس میں فلاں عیب ہے، بیچتے ہوئے بتا دینا لیکن وہ آپ کو بتانا بھول گیا تھا، اس لئے اپنی قیمت واپس لے لو اور تھان واپس کر دو؛ تا کہ دھوکہ نہ ہو۔ خریدار غیر مسلم تھا، اس نے ان کا یہ عمل دیکھ کر پہلے تو کلمہ پڑھا اور اس کے بعد یوں کہا: وہ پیسے مجھے واپس کرو، اس لئے کہ یہ پیسے جعلی ہیں اور اب میں تم کو اصلی پیسے دیتا ہوں۔ اور اتنی ہی رقم میں وہ تھان خرید لیا۔

دیکھئے! اگر یہ امانت داری سے کام نہ لیتے تو وہ خود دھوکہ کھا جاتے۔ جب آدمی تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتے ہیں؛ جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

﴿تقویٰ اختیار کرنے کی برکت﴾

بہت سی کتابوں میں ایک مشہور واقعہ لکھا ہے:-

اللہ کے ایک نیک بندے محمد بن عبدالباقی نامی تھے، حج کے لئے گئے ہوئے تھے، ان کے مصارف ختم ہوگئے، اور ان کے پاس کچھ نہیں بچا، فاقہ میں مبتلا ہوئے، پریشان تھے راستے میں ایک تھیلی پڑی ہوئی نظر آئی، اس کو اُٹھائی اور کھول کر دیکھا تو اس میں ہیروں کا ایک قیمتی ہار تھا، اس کو انہوں نے امانت داری سے اپنے پاس رہنے دیا۔ اسی دوران ایک آدمی کو اعلان کرتے ہوئے سنا کہ فلاں آدمی کے ہیرے کا ہار گم ہوا ہے، جس کو بھی ملا ہو؛ وہ اس آدمی تک پہنچا دے، وہ فلاں جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ پہنچانے والے کو دس ہزار درہم انعام کے طور پر دیئے جائیں گے۔ اس زمانہ کے دس ہزار درہم آج کے لاکھوں کے برابر ہوتے ہیں۔ بہر حال! یہ اللہ کے نیک بندے بتائی ہوئی علامت کے مطابق اس جگہ پہنچے اور خفیہ طور پر معلوم کر کے جس کا ہار تھا، اس تک پہنچا کر اپنے آپ کو ظاہر کئے بغیر چپکے سے وہاں سے چلے آئے؛ اور وہ انعام بھی حاصل نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس کا پہنچانا میری ذمہ داری اور میرا فریضہ ہے، اس پر انعام کیا معنٰی رکھتا ہے۔ چنانچہ اس مالک کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کون پہنچا گیا۔ اس کی بڑی تمنا تھی کہ جس نے پہنچایا ہے اس کو انعام کی رقم دوں۔ اس نے بہت اعلان کیا کہ پہنچانے والا مجھ کو ملے، لیکن انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔

خیر! وہ آدمی حج کے بعد اپنے وطن چلا گیا، یہ بھی اپنے وطن واپس جانے کے لئے کشتی میں سوار ہوئے۔ اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ کشتی سمندر کے تھپیڑوں کی وجہ سے ٹوٹ گئی، ان کے ہاتھ میں ایک تختہ آ گیا، وہ اسی پر سوار ہوکر ایک جزیرے میں پہنچے، آبادی میں جا کر ایک مسجد میں گئے، وضو کر کے نماز پڑھی۔ لوگوں نے دیکھا کہ مسافر ہے، کھانے کا انتظام کیا صاحبِ کمال آدمی تھے، عالم بھی تھے۔ بستی والوں نے جب دیکھا کہ صاحبِ فضل وکمال ہیں تو ان سے کہا: ہمارے امام صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، ہم کو آدمی کی ضرورت بھی تھی، آپ یہیں ٹھہر جایئے۔ ان کے کمالات کی وجہ سے تمام لوگ ان سے محبت کرنے لگے۔ پھر لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ ایسا اچھا آدمی ہاتھ لگا ہے، کہیں نکل نہ جائے، اس لئے اس کے پاؤں میں بیڑی ڈال دو۔ لہٰذا ان سے کہا: آپ کا نکاح کرا دیں؟ انہوں نے کہا: صالحہ لڑکی ملے تو مَیں بھی تیار ہوں۔ لوگوں نے کہا: سابق امام صاحب کی ایک لڑکی ہے، بہت ہی نیک وصالحہ ہے اور بڑی حسین وجمیل بھی ہے، اس سے نکاح کر لو۔ انہوں نے کہا: مَیں دیکھ لوں۔ خیر! فیصلہ کر لیا اور نکاح ہو گیا۔ جب رخصت ہو کر وہ لڑکی آئی تو دیکھا کہ اس کے گلے میں وہی ہار ہے۔ انہوں نے پوچھا: یہ ہار کیسا ہے؟ اس نے کہا: یہ میرے والد صاحب نے میرے لئے میراث میں چھوڑا تھا۔

پھر اس نے کہا: میرے والد صاحب حج میں گئے تھے اور یہ ہار گم ہو گیا تھا، انہوں نے اعلان کیا تھا کہ جو یہ ہار پہنچا دے گا، اس کو دس ہزار درہم انعام دیں گے۔ لیکن ایک آدمی پہنچا کر چلا گیا اور انعام بھی وصول نہیں کیا۔ والد صاحب ہمیشہ تمنا کرتے تھے کہ کاش! وہ آدمی ملے تو مَیں اپنی لڑکی کا نکاح اس سے کراؤں۔ انہوں نے کہا: مَیں وہی آدمی ہوں۔ اس نے کہا: میرے والد صاحب کی تمنا پوری ہوئی۔

خیر! اس کے بعد ان سے اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئیں، اس کے بعد اس عورت کا انتقال ہو گیا اور کچھ مدت کے بعد بیٹا اور بیٹی کا بھی انتقال ہو گیا اور یہ ہار ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ کے طور پر تقویٰ اختیار کرنے کی برکت سے وراثت میں ان کو مل گیا۔ ایسے بے شمار واقعات کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ (ذیل طبقات الحنابلۃ، ۱/۷۹)

﴿بصیرت کا نور﴾

ایک اور آیت پیش کی ہے: ﴿إِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو گے تو اللہ تعالیٰ ایک نور اور ایسی صلاحیت وطاقت تمہارے دل میں عطا فرمائیں گے؛ جس کے ذریعہ حق وباطل کے درمیان فرق وتمیز کرسکو گے ﴿فُرْقَان﴾ یعنی بصیرت کا نور۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کا کفارہ کردے گا اور تمہاری مغفرت فرمادے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔

بہر حال! قرآنِ پاک میں تقویٰ کے بے شمار فوائد بیان کئے گئے ہیں۔ تقویٰ ہی کی وجہ سے ساری چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

﴿تقویٰ کیسے حاصل ہو؟﴾

اب تقویٰ کیسے حاصل ہو؟ تو اس کا طریقہ بھی قرآنِ پاک ہی کی ایک آیت میں بتلایا گیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کی نافرمانی سے بچو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ﴿كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ کا جو حکم دیا گیا ہے؛ اس میں تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

دیکھو! قاعدہ ہے کہ ہر چیز اپنے مرکز سے ملا کرتی ہے۔ اور تقویٰ کا مرکز اور کان

صالح اور نیک لوگوں کے قلوب ہیں ﴿لِكُلِّ شَيْءٍ مَعْدَنٌ وَمَعْدَنُ التَّقْوىٰ قُلُوبُ الصَّادِقِيْنَ﴾ ہر چیز کی ایک کان ہوکرتی ہے اور تقویٰ کی کان، یعنی جہاں سے تقویٰ ملے گا؛ وہ صلحاء کے قلوب ہیں، جو آدمی ان کی صحبت اختیار کرے گا اس کو تقویٰ ملے گا۔

ایک آدمی باورچی بننا چاہتا ہے تو اس کو کسی باورچی کے صحبت اختیار کرنی پڑے گی کھانا بنانے کے فن میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں ہیں، اگر وہ سب اس نے پڑھ لیں؛ تب بھی نمک ڈالنے کا طریقہ نہیں آئے گا؛ جب تک کہ کسی باورچی کی صحبت اختیار نہ کرلے۔

ایک آدمی درزی بننا چاہتا ہے تو خیاطی کے فن میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ ساری پڑھ لے گا؛ تب بھی جب تک درزی کی صحبت اختیار نہیں کرے گا وہاں تک سوئی کے اندر تاگا کس طرح پرویا جاتا ہے اور بٹن کا کاج کیسے بنایا جاتا ہے؛ وہ اس کو نہیں آئے گا۔

﴿صحبت کی تاثیر﴾

صحبت تو ایسی چیز ہے کہ بے جان چیزوں میں بھی اثر کرتی ہے۔ اردو میں کہاوت ہے:۔ ''خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے''۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں گلستاں اور بوستاں وغیرہ ہمارے یہاں مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ گلستاں کے مقدمہ میں انہوں نے صحبت کی تاثیر کو بتلانے کے لئے بہت اچھے اشعار کہے ہیں:۔

گلے خوشبوئے در حمام روزے	رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم مشکی یا عبیری	کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم	و لیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہم نشین در من اثر کرد	و گر نہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(گلستاں سعدی، دیباچہ، صفحہ ۵/۶)

ہم غسل کرتے وقت صابن کی ٹکیہ استعمال کرتے ہیں، پرانے زمانہ میں مٹی کو خوشبو میں بسایا جاتا تھا اور وہی مٹی نہانے کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ صابن بھی خوشبو میں بسی ہوئی مٹی کی طرح ہی ہے۔ تو فرماتے ہیں: کہ ایک خوشبودار مٹی کی ٹکیہ مجھے غسل خانہ کے اندر محبوب کے ہاتھوں مل گئی۔ مَیں نے اس سے پوچھا: تو مشک ہے یا عنبر ہے؟ کہ تیری دل کو لبھا لینے والی خوشبو کی وجہ سے میرے طبیعت میں ایک مستی سی آ گئی ہے۔ وہ کہنے لگی: مَیں تو معمولی مٹی تھی، لیکن ایک زمانہ تک پھول کی صحبت میں رہی، تو اس کی خوبصورتی نے میرے اندر اثر کر دیا؛ ورنہ مَیں تو وہی مٹی ہوں۔

اہل اللہ کی صحبت کی برکت

تو حقیقت یہ ہے کہ گناہوں کو چھوڑنے کی کوئی آدمی اپنے طور پر لاکھ محنت کر لے، نہیں چھوڑ سکتا، جب تک کہ ایسے لوگ کی صحبت اختیار نہ کرے جو گناہوں کو چھوڑے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار ہیں، اپنے آپ کو ہر چھوٹے بڑے گناہ سے بچانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اہل اللہ اور صلحاء کی صحبت میں نہیں رہے گا؛ وہاں تک گناہ نہیں چھوٹیں گے۔ یہ بات یاد رکھئے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اللہ والوں کی صحبت کا ادنیٰ فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو گناہوں سے توبہ کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے۔

گناہوں کے چھوٹنے کا نسخہ

دیکھو! باغ کے اندر جو کانٹے ایسے ہیں کہ پھولوں کے اندر چھپے ہوئے ہیں، ان کو مالی کچھ نہیں کرتا۔ اور جو صرف کانٹے ہی کانٹے ہیں، ان کو اُکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ تو اگر ہم

کانٹے ہیں تو ہمیں ضرورت ہے کہ پھولوں کی صحبت میں رہیں، تب خلعتِ گُل سے نوازے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ دھیرے دھیرے پھول والی صفت پیدا کردے گا۔ ورنہ کم از کم نیک لوگوں کی صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں، اوراس کی بدبختی نیک بختی سے، شقاوت سعادت سے بدل دی جاتی ہے: ﴿هُمُ الْقَوْمُ لَايَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ﴾ اللہ کے رسول فرماتے ہیں: یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں رہتا۔ تو گناہوں کو چھوڑنے کے لئے یہی ایک نسخہ ہے۔ اسی لئے کہا گیا: ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ﴾ سچوں کے ساتھ رہو اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

﴿چنبیلی کا تیل﴾

البتہ ان کی صحبت اختیار کرنے سے فائدہ کب ہوگا؟ یہ سمجھنا بھی ضروری ہے۔ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی زبان سے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں یہ سنا تھا (آج ہی اُن کے صاحب زادہ سے ملاقات بھی ہوئی تھی) حضرت فرماتے تھے: ہمارے یہاں جونپور میں چنبیلی کا تیل بنایا جاتا ہے، یہ چنبیلی کا تیل کیا ہے؟ چنبیلی کے پھول کو نچوڑنے سے تیل نکلتا ہے؛ ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ تیل تو تِل کا ہی ہوتا ہے۔ تِل کے تیل کو چنبیلی کا تیل بنانے کے لئے کیا یہ جاتا ہے کہ تلوں کی ایک تہہ جمائی جاتی ہے، اس کے اوپر چنبیلی کے پھول بچھائے جاتی ہیں، پھر اس کے اوپر تلوں کی ایک تہہ ہوتی ہے، پھر اس کے اوپر چنبیلی کے پھول کی ایک تہہ ہوتی ہے، اس طرح ان تلوں کو بچھا کر چنبیلی کے پھولوں کے ساتھ کچھ دنوں تک رہنے دیتے ہیں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ان پھولوں کو ہٹا کر ان تلوں کو کولہو کے اندر پیس کر تیل نکالا جاتا ہے۔ اب یہ تیل تِل کا تیل نہیں رہا بلکہ چنبیلی کا تیل بن گیا۔

لیکن حضرت مولانا فرماتے تھے: کہ ان تلوں کے اندر چنبیلی کا اثر لانے کے لئے ان تِلوں کے اوپر ایک پتلی پرت اور جھلّی ہوتی ہے اس کو دور کرنا پڑتا ہے۔تو تیل بنانے والے ان تِلوں کو اچھی طرح دھو لیتے ہیں۔جیسے ڈائنگ مل کے اندر کپڑے کو رنگنے سے پہلے اچھی طرح دھوتے ہیں۔اس کے بعد اس کپڑے کو ڈائی کیا جاتا ہے، دھوئے بغیر ڈائی نہیں کرتے ورنہ رنگ برابر نہیں آتا۔اسی طریقہ سے ان تلوں کو اچھی طرح دھوتے ہیں، اس کے بعد اس کی گھسائی کرتے ہیں تاکہ اوپر کی باریک جھلّی دور ہو جائے اور وہی باریک جھلّی ہی دراصل کسی چیز کے مؤثر ہونے میں رکاوٹ بنتی ہے۔جب جھلّی دور ہوگئی اس کے بعد ان تلوں کو پھولوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے تو پھولوں کا اثر آتا ہے۔اور پھر ان تلوں کو جب پیسا جاتا ہے تو جو تیل نکلتا ہے؛ وہ چنبیلی کا تیل کہلاتا ہے۔

اسی طریقہ سے اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھنے سے ان کا اثر اس وقت آئے گا؛ جب رکاوٹیں دور ہوں گی۔

﴿رکاوٹیں کیا ہیں؟﴾

اب رکاوٹیں کیا ہیں یہ معلوم ہونا بہت ضروری ہے۔تو ایک رکاوٹ تو بدعقیدگی ہے۔اسی لئے جب بھی کسی اللہ والے کے پاس بیٹھے تو عقیدت کے ساتھ بیٹھے؛ تب ہی اثر ہوگا۔اگر انکار کے ساتھ بیٹھے گا یعنی دل میں اس پر اعتراض ہے کہ پتہ نہیں یہ کیا کرتے رہتے ہیں۔اگر اس طرح بداعتقادی کے ساتھ ان کے پاس زندگی بھی گذار دیں گے؛ تو ذرّہ برابر بھی فائدہ نہیں ہوگا۔عقیدت کے ساتھ ان کے پاس بیٹھے، دل میں ان پر ذرّہ برابر اعتراض نہ ہو۔

﴿صحبتِ شیخ بجائے مفید ہونے کے مضر......﴾

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ ہے ''اعتقاد و انکار''۔ وہ مستقل اسی موضوع پر لکھا ہے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے مَیں نے ایک مرتبہ پوچھا تھا: شیخ کی صحبت میں کتنی مدت گذارنی چاہیے؟ تو حضرت نے فرمایا: آج کل اکثر لوگوں کے مزاج ایسے بن گئے ہیں کہ ان کے مزاج میں اعتراض ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے شیخ کے صحبت بجائے مفید ہونے کے مضر ہو جاتی ہے۔ وہاں جاتے ہیں تو دل ہی دل میں اعتراض لے کر جاتے ہیں اور اعتراض ہی کرتے رہتے ہیں۔ لٰہذا کوئی فائدہ تو ہوتا نہیں ہے، البتہ اور زیادہ خطرناک اور مشکل حالت بنا کر آ جاتے ہیں۔ اگر کسی کو اپنے مزاج کے مطابق یہ اندیشہ ہو تو حضرت فرماتے تھے کہ ایسے آدمی کے لئے تو دور ہی دور رہ کر خط و کتابت کے ذریعہ ہدایات حاصل کرتے رہنا مفید ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ موانع اور رکاوٹ دور ہونے چاہئیں۔ موانع میں سے ایک مانع تو ''بداعتقادی'' ہے۔

دوسرا مانع اور رکاوٹ ''غذا'' ہے۔ غذا حلال ہونی چاہیے۔ حرام غذا کے ساتھ اہل اللہ کی صحبت کا اثر نہیں ہو پاتا۔ یہ بھی یاد رکھیے۔

تیسرا مانع اور رکاوٹ ''مجانستِ اضداد'' ہے یعنی اس لائن کے جو لوگ نہ ہوں ان سے تعلقات نہ بڑھائے۔ جو غلط صحبت والے ہیں ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ترک کر دے۔ اگر ان کی صحبت چھوڑے بغیر اہل اللہ کی صحبت میں آؤ گے؛ تب بھی کما حقہ فائدہ نہیں ہوگا۔

اسی طرح ''بدنظری'' بھی خطرناک چیز ہے۔ بزرگوں کی صحبت میں رہتے ہوئے بدنظری کا ارتکاب کرے گا؛ تب بھی فائدہ نہیں ہوگا۔

مہمانِ خصوصی کے ساتھ طفیلیوں کا بھی اکرام

بہرحال! مَیں عرض کر رہا تھا کہ صحبتِ اہل اللہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ گناہوں کی عادت چھڑا دیتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی آدمی یہ چاہتا ہو تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ اپنا ماحول چھوڑ کر نیک ماحول اختیار کرے۔ اور جب تقویٰ حاصل ہو جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ انہی انعامات و احسانات سے اس کو بھی نوازے گا جن سے اپنے نیک بندوں کو نوازتا ہے۔ جیسے آپ کے یہاں کوئی بڑا مہمان یا بڑے بزرگ آئے ہوں اور ان کے ساتھ پانچ دس آدمی ہوں تو جو کھانا ان بزرگ کو کھلائیں گے؛ وہی ساتھیوں کو بھی کھلائیں گے۔ جس کمرہ میں ان کو ٹھہرائیں گے؛ اسی کمرہ میں ان کے ساتھیوں کو بھی ٹھہرائیں گے۔ کسی کو تقریر کے لئے بلاتے ہیں تو جس اسٹیج پر وہ بیٹھتے ہیں ان کے ساتھ آئے ہوئے بھی اسی پر بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ اصل اعزاز تو مہمانِ خصوصی کا مقصود ہوتا ہے لیکن ان کے ساتھیوں کا بھی اعزاز کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی ہوتا ہے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا بہترین اندازِ بیان

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو گلستاں کے اندر بہت اچھے انداز سے بیان کیا ہے:۔

دیدم گلِ تازہ چند دستہ ❁ بر گنبدے نہادہ از گیاہ بستہ
گفتم چہ بود گیاہِ ناچیز ❁ تا در صفِ گل نشیند او نیز
بگریست گیاہ و گفت خاموش ❁ صحبت نہ کند کرم فراموش
گرنیست جمال و رنگ و بویم ❁ آخر نہ گیاہِ باغِ اویم

(گلستاں سعدی، باب ۲، صفحہ ۱۰۴)

فرماتے ہیں کہ مَیں نے چند پھولوں کوایک گھانس کے ساتھ بندھا ہوا دیکھا۔آپ نے گلدستہ دیکھا ہوگا کہ اس کو تیار کر کے گھانس سے باندھتے ہیں اور وہ گھانس بھی اسی باغ سے لی جاتی ہے۔تو فرماتے ہیں کہ مَیں نے ایک گلدستہ گھانس سے باندھا ہوا ایک گنبد پر رکھا ہوا دیکھا۔مَیں کہنے لگا: یہ معمولی گھانس بھی پھولوں کی صف میں جا کر بیٹھ گئی، اس کو بھی یہ مقام مل گیا۔میری بات سن کر گھانس رونے لگی اور کہنے لگی کہ چپ ہو جاؤ، جو شریف آدمی ہوتا ہے وہ صحبت کا فائدہ پہنچاتا ہے۔اگر چہ میرے اندر پھول جیسی خوب صورتی بھی نہیں ہے اس جیسا رنگ بھی نہیں ہے اور اس جیسی خوشبو بھی نہیں ہے۔لیکن مَیں اسی باغ کی ایک گھانس ہوں، اس لئے مجھے بھی وہی مقام دیا گیا ہے۔

بہر حال! آدمی اگر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچانا چاہتا ہے؛ تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے جڑے ہوئے ہیں ان کے ساتھ جڑ جائے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے پیش کر دے۔اس کا آسان طریقہ یہی ہے۔اسی کو فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ﴾

﴿باری تعالیٰ کی گارنٹی﴾

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آج کل اہل اللہ ملتے کہاں ہیں؟ یہ اعتراض تو قرآنِ پاک پر ہوا۔اس لئے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ جو کام آدمی کے بس میں نہ ہو، اس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں دیا جاتا۔معلوم ہوا کہ ہر زمانہ میں اور ہر علاقہ میں ایسے لوگ موجود رہیں گے جن کی صحبت اختیار کر کے آدمی اپنے آپ کو صالح بنا سکتا ہے، تب ہی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔

جیسے کوئی آدمی سخت بیمار ہو تو وہ یہ تو نہیں کہتا کہ مجھے کوئی ڈاکٹر ہی نہیں ملتا، بلکہ اس کو تو ہر آدمی ڈاکٹر نظر آتا ہے۔ جسمانی بیماری میں ہمارا یہ حال ہے۔ اور روحانی بیماری کے اندر آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میرا کوئی ڈاکٹر ہی نہیں ہے۔ یہ کیسی بات ہے؟ اس خیال کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق و سعادت عطا فرمائے

تقویٰ
مجلس ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد.

فاعوذباللہ من الشيطان الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم

يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوااتَّقُوااللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ. (آل عمران: ۱۰۲)

وقال تعالىٰ: فَاتَّقُوااللّٰهَ مَااسْتَطَعْتُمْ (التغابن: ۱۶)

تقویٰ کا بیان چل رہا ہے، تقویٰ کی تشریح اور اس کے حصول کا طریقہ بتلایا جا چکا ہے۔ اب یہاں چند آیتیں پیش کی ہیں۔

﴿اللہ تعالیٰ سے جیسا ڈرنا چاہیے؛ ویسا ڈرو﴾

پہلی آیت ہے: ﴿يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوااتَّقُوااللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے جیسا ڈرنا چاہیے؛ ویسا ڈرو۔ اب اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق کیسے ادا ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے علوِشان کی وجہ سے اس آیت کو سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سہم گئے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق تو ادا نہیں ہوسکتا اور ہمیں اس کا حکم دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس کی تشریح کے طور پر دوسری آیت نازل ہوئی: ﴿فَاتَّقُوااللّٰهَ مَااسْتَطَعْتُمْ﴾ تم سے جتنا ہوسکے اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرو، اپنے مقدور بھر ڈرنے کا اہتمام کرو۔ اور مقدور بھر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جن چیزوں کو کرنے کا حکم دیا ہے؛ ان کو بجالاؤ۔ اور جن چیزوں سے منع کیا ہے؛ اس سے باز رہو۔

اوامر کے امتثال اور نواہی سے اجتناب سے ڈرنے کا حق ادا ہو جائے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے انہیں چیزوں کو کرنے کا حکم دیا ہے جو آدمی کر سکتا ہے اور انہیں چیزوں سے بچنے کا حکم دیا ہے جو آدمی کے مقدور میں ہے ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ نے ایک اصول بتلایا ہے۔علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو فرمایا: ﴿ھذہ الآیة مبینة للمعنیٰ الاولیٰ﴾ پہلی آیت میں جو فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا جیسا حق ہے؛ ویسا ڈرو۔اس کی تشریح یہ آیت کرتی ہے۔

﴿حصولِ تقویٰ کا آسان طریقہ﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور درست بات کہو۔یعنی ایسی بات کہو جو صحیح ہو، خطا نہ ہو۔ راہِ راست سے ہٹی ہوئی نہ ہو، معتدل ہو۔اس آیت کو لا کر بتلایا کہ تقویٰ کا تعلق افعال اور اقوال دونوں سے ہے۔یعنی کرنے کے کاموں میں بھی تقویٰ اختیار کرنا ہے اور اپنے کلام میں بھی تقویٰ کا لحاظ کرنا ہے۔اگر تم ایسا کرلو گے، درست بات زبان سے نکالنے کی عادت ڈال لو گے؛ تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو درست کردیں گے اور تمہارے گناہوں کو معاف کردیں گے۔گویا تقویٰ کے حصول کے لئے ایک آسان راستہ بتلا دیا کہ آدمی اقوال میں معتدل بات کرنے کی عادت ڈال لے، اس کی برکت یہ ہوگی کہ دوسرے اعمال بھی درست ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ گناہوں کو بھی معاف کردیں گے۔

﴿سب سے زیادہ عزت والا کون؟﴾

عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال: قیل: یارسول اللہ! مَنْ أَکْرَمُ النَّاسِ؟ قَالَ: أَتْقَاهُمْ.

فقالوا: لَيْسَ عَنْ هٰذَا نَسْأَلُكَ، قَالَ: فَيُوْسُفُ نَبِيُّ اللهِ بْنُ نَبِيِّ اللهِ بْنِ نَبِيِّ اللهِ بْنِ خَلِيْلِ اللهِ قَالُوْا: لَيْسَ عَنْ هٰذَا نَسْأَلُكَ. قَالَ: فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْئَلُوْنِيْ؟ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْاِسْلَامِ اِذَا فَقُهُوْا. (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ کے یہاں لوگوں میں سب سے زیادہ عزت والا کون ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو آدمی جتنا زیادہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچائے گا اور جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا؛ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ عزت والا ہے ﴿اِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ﴾ عزت کا مدار اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے اپنے آپ کو بچانے پر ہے۔ اس روایت کو پیش کر کے یہی بتلانا مقصود ہے کہ حضور ﷺ کا پہلا جواب یہی تھا: ﴿أَتْقَاهُمْ﴾

صحابہ نے عرض کیا: ہمارے سوال کا منشا یہ نہیں ہے کہ بلکہ کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے عزت والا کون ہے؟ تو حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: حضرت یوسف علیہ السلام جو اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، اور وہ بیٹے ہیں اللہ کے نبی حضرت یعقوب کے، اور وہ بیٹے ہیں اللہ کے نبی حضرت اسحاق کے اور وہ بیٹے ہیں اللہ کے خلیل یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے۔ گویا ان کے گھرانے میں نبوت چار پشتوں تک جاری رہی۔ اس سے زیادہ عزت والا اور کون ہوگا؟ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارے سوال کا مقصد یہ بھی نہیں ہے۔

﴿ہر خاندان کے امتیازی اوصاف ہوتے ہیں﴾

تو حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْئَلُوْنِيْ؟﴾ عرب کی کانوں

(خاندان، قبائل) کے متعلق مجھ سے سوال کر رہے ہو؟ قبیلوں کو معادن سے تعبیر اس لئے کیا کہ ہر قبیلہ کے اندر کچھ نہ کچھ امتیازی اوصاف اور خصوصیات ہوا کرتی ہیں کہ اس قبیلہ میں پیدا ہونے والا ان امتیازی اوصاف کو اپنے اندر لے کر آتا ہے۔ جیسے سونے کی کان میں سے سونا نکلے گا اور چاندی کی کان میں سے چاندی نکلے گی، پیتل کی کان میں سے پیتل نکلے گا۔ اسی طریقہ سے ہر قبیلے اور خاندان کی کچھ امتیازی خوبیاں ہوا کرتی ہیں۔ جب کوئی بچہ اس قبیلہ میں پیدا ہوتا ہے تو اس میں وہ خوبیاں اور امتیازی اوصاف قدرتی طور پر موجود ہوتے ہیں۔

حضور ﷺ نے پوچھا: اس کے متعلق پوچھتے ہو؟ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿خِیَارُھُمْ فِی الْجَاھِلِیَّةِ خِیَارُھُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَافَقُھُوْا﴾ جو قبائل زمانۂ جاہلیت میں عمدہ اور اعلیٰ سمجھے جاتے تھے، اسلام میں بھی وہی اعلیٰ اور عمدہ ہیں۔ یعنی اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں جن قبائل کو دوسرے قبائل کے اوپر جو امتیاز اور فوقیت حاصل تھی اور اپنی خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے وہ دوسرے قبائل سے اونچے سمجھے جاتے تھے، اسلام کے بعد بھی وہی سلسلہ باقی ہے؛ بشرطیکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرلیں۔

﴿سونے پر سہاگہ﴾

اسی ارشاد کو سامنے رکھ کر علماء نے فرمایا ہے کہ کسی آدمی کو اگر خاندانی شرافت حاصل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اگر علم حاصل کرلے، فقاہت اور دینی سمجھ پیدا کرلے تو یہ خاندانی شرافت اس کے لئے کارآمد بن جائے گی۔ اور اگر صرف خاندانی شرافت ہے اور کوئی خوبی نہیں ہے، ایمان نہیں ہے، عملِ صالح نہیں ہے، فقاہت اور دین کی سمجھ نہیں ہے؛ تو پھر یہ خاندانی شرافت اس کے لئے کوئی کارآمد نہیں ہے۔ اگر خاندانی شرافت کے ساتھ یہ ساری

چیزیں بھی ہیں تو پھر چار چاند لگ جائیں گے۔ سونے پر سہاگہ ہو جائے گا۔ نور علیٰ نور والا معاملہ ہو جائے گا۔

اور ایک آدمی وہ ہے جس کو خاندانی شرافت حاصل نہیں، لیکن اس میں ایمان ہے، عملِ صالح ہے اور علم حاصل کیا ہے؛ تو پھر اس کی وجہ سے اس کا مقام بلند ہوگا۔ لیکن جس کو تین چیزوں کے ساتھ چوتھی چیز بھی حاصل ہے تو اس کا مقام اس سے بھی بلند سمجھا جائے گا؛ یہ ایک بدیہی چیز ہے، جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

﴿ دنیا بڑی شیرین اور سرسبز و شاداب ہے ﴾

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اِنَّ الدُّنیَا حُلوَۃٌ خَضِرَۃٌ وَاِنَّ اللہَ مُستَخلِفُکُم فِیھَا فَیَنظُرَ کَیفَ تَعمَلُونَ. فَاتَّقُوا الدُّنیَا وَاتَّقُوا النِّسَآءَ. فَاِنَّ أَوَّلَ فِتنَۃِ بَنِی اِسرَائِیلَ کَانَت فِی النِّسَآءِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دنیا بڑی شیرین، میٹھی اور سرسبز و شاداب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کو مال و دولت اور ثروت کے فوائد کے پیشِ نظر میٹھی اور سرسبز و شاداب سے تعبیر فرمارہے ہیں۔ دیکھنے میں بھی آدمی کا دل لبھاتی ہے، ہر آدمی اس کی طرف مائل ہوتا ہے، اسی کو ﴿حُلوَۃٌ خَضِرَۃٌ﴾ سے تعبیر کیا ہے۔

﴿ پھر اللہ تعالیٰ دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو ﴾

﴿وَاِنَّ اللہَ مُستَخلِفُکُم فِیھَا﴾ اللہ تعالیٰ اس میں تم کو جانے والوں کا جانشین بنائے گا یعنی پہلے یہ دنیا جن کے ہاتھوں میں تھی، ان سے لے کر تم کو دے گا۔ پہلے جو لوگ برسرِ اقتدار تھے؛ اللہ تعالیٰ وہ اقتدار ان سے لے کر تم کو دے گا اور تم کو ان کا جانشین بنائے گا ﴿فَیَنظُرَ کَیفَ

تَعْمَلُوْنَ﴾ پھر اللہ تعالیٰ دیکھے گا اور تم کو آزمائے گا کہ تم اس میں کیا کرتے ہو؟ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا کی جو نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتیں ہیں، چاہے حکومت و اقتدار ہو، منصب و عہدہ ہو، دولت وثروت ہو؛ یہ سب نعمتیں اس لئے دی جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دے کر آزماتا ہے کہ ان نعمتوں کے ملنے کے بعد یہ کیا کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے ہیں یا نہیں؟ شریعت کی پیروی کرتے ہیں یا نہیں؟ دولت وثروت میں پڑ کر اور عہدہ و منصب اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کے بعد کیا نافرمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنا شروع کرتے ہیں؟ گویا اللہ تعالیٰ تم کو یہ نعمتیں دے کر آزمائے گا۔

﴿فَاتَّقُوْا الدُّنْيَا وَاتَّقُوْا النِّسَآءَ﴾ لٰہذا دنیا سے بچیو اور عورتوں سے بھی ڈرتے رہیو۔ یعنی دنیا کی یہ دولت وثروت آوے تو اس کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس مت کھو دینا، بلکہ اس دنیا کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایتیں دی گئی ہیں اس کا اہتمام کرنا۔

﴿خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی دو چیزیں﴾

حدیثِ پاک میں ہے کہ قیامت کے روز مال کے متعلق سوال ہوگا: ﴿مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ﴾ (ترمذی شریف، حدیث نمبر ۲۳۴۰) کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ یہی دو چیزیں خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہیں۔ کمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کو توڑا نہ جائے۔ اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق کماؤ، شریعت سے ہٹ کر، جھوٹ بول کر، دھوکہ دے کر نہیں بلکہ صحیح طریقہ سے کماؤ۔ اور جب مال صحیح طریقہ سے آجائے تو خرچ بھی اسی طرح کرو جیسا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ مال آیا تو ہم اس کے مالک نہیں ہیں بلکہ امانت دار ہیں۔

﴿عورت: بڑی آزمائش کی چیز﴾

اور عورتوں سے بھی ڈریو۔ اس لئے کہ یہ بھی راہِ راست سے ہٹانے والی اور گمراہ کرنے والی چیز ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ عورتوں کی وجہ سے تھا۔ یہ عورت بھی بڑی آزمائش کی چیز ہے۔ اس لئے کہ عورتوں سے خلط ملط اور ان کے ساتھ بے محابہ ملنا، بے پردگی سے ان کے پاس آنا جانا یا شریعت کے بتلائے ہوئے اصول وحدود سے ہٹ کر ان کے ساتھ تعلقات قائم کرنا؛ یہ سب فتنہ میں ڈالنے والی چیزیں ہیں۔ اس سلسلے میں شریعت نے جو ہدایتیں دیں ہیں، مثلاً اجنبی عورتوں کی طرف سے نگاہوں کو نیچی رکھا جائے، ان کے ساتھ بلاضرورت گفتگو نہ کی جائے، بوقتِ ضرورت گفتگو کی نوبت آوے تو شریعت نے جو اصول مقرر کئے ہیں ان کا لحاظ کرتے ہوئے بات چیت کی جائے، کوئی چیز مانگی جائے تو پردہ کی آڑ میں سے مانگی جائے، عورت بھی ایسے موقع پر آواز کو نرم نہ کرے بلکہ سخت رکھے، گھر سے باہر نہ نکلے، نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو پُرانے اور میلے کچیلے کپڑوں میں نکلے، خوشبو لگا کر نہ نکلے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سارے اصول وحدود کا لحاظ رکھا جائے گا، تب ہی اس کے فتنہ سے آدمی اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ اور جہاں آدمی نے ذرا چھوٹ چھاٹ لے لی اور اس کے سلسلے میں ذرا بھی بے پروائی سے کام لیا؛ تو آدمی فتنہ میں مبتلا ہو جائے گا۔

﴿تقویٰ کی دعا؛ حضور ﷺ کی زبانی﴾

عن أبی مسعود رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ کان یقول: اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ الۡھُدیٰ وَالتُّقیٰ وَالۡعَفَافَ وَالۡغِنیٰ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی دعا میں یہ کلمات کہتے

تھے: اے اللہ! مَیں تجھ سے راہِ راست پر چلنے کا سوال کرتا ہوں اور تقویٰ یعنی تیرے ڈر کا سوال کرتا ہوں اور گناہوں سے حفاظت کا سوال کرتا ہوں، اور فواحش و بے حیائی کے کاموں سے بچنے کا سوال کرتا ہوں اور دل کی بے نیازی کا سوال کرتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ تقویٰ ایک ایسی صفت ہے جس کو مانگنے کا حضور ﷺ نے بھی اہتمام کیا ہے۔ یہ ایسی صفت ہے جس کو بذریعۂ دُعا اللہ تعالیٰ سے مانگی جائے۔ اس کے حصول کے لئے عملی طور پر تو ہمیں کوشش کرنا ہی ہے، اس کے ساتھ ساتھ دعا کا بھی اہتمام کرنا ہے۔

﴿تقویٰ والا پہلو اختیار کرنا چاہیے﴾

عن أبی طریف عدی بن حاتم الطائی رضی اللہ عنہ قال: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللہِ ﷺ یَقُوْلُ: مَنْ حَلَفَ عَلیٰ یَمِیْنٍ ثُمَّ رَأَی أَتْقیٰ لِلّٰہِ مِنْهَا، فَلْیَأْتِ التَّقْوٰی. (رواہ مسلم)

یہ روایت حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں: مَیں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کسی آدمی نے ایک چیز کی قسم کھالی اور پھر اس قسم کے علاوہ دوسرا کام محسوس کیا کہ جس میں اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف زیادہ ہے یعنی اس میں گناہ سے بچاؤ زیادہ ہے۔ تو اس کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ڈر والی چیز کو ہی اختیار کرے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی بات پر قسم کھالیتا ہے۔ مثلاً قسم کھالی کہ فلاں سے بات نہیں کروں گا، باپ ناراض ہوگیا تو بیٹے سے بات نہ کرنے کی قسم کھالی، پھر احساس ہوا کہ یہ تو قطع رحمی ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں! اگر بیٹے کی شرعی خلاف ورزی کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو گنجائش ہے۔ بہرحال! جس چیز کی قسم کھائی ہے اس کے بارے میں محسوس ہوا کہ اس قسم کی خلاف ورزی کرنا ہی شرعی اعتبار سے زیادہ مناسب ہے، تو پھر وہی کرنا چاہیے،

اور اپنی قسم توڑ کر اس کا کفارہ ادا کردے۔

معلوم ہوا کہ قسم کھانے کے بعد بھی جب یہ تاکید کی جا رہی ہے کہ تقویٰ والا پہلو دوسری بات میں ہو تو قسم توڑ دو۔ تو دوسرے کاموں میں بدرجۂ اولیٰ اس کا اہتمام کیا جائے گا۔

﴿ ''تقویٰ'' بنیادی امور میں سے ہے ﴾

عن أبی أمامة صدی بن عجلان الباهلی رضی اللہ عنہ قال: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَخْطُبُ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ. فَقَالَ: اِتَّقُوْا اللهَ، وَصَلُّوْا خَمْسَكُمْ، وَصُوْمُوْا شَهْرَكُمْ، وَأَدُّوْا زَكَاةَ أَمْوَالِكُمْ، وَأَطِيْعُوْا أُمَرَآءَ كُمْ، تَدْخُلُوْا جَنَّةَ رَبِّكُمْ. (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن صحيح.)

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ فرماتے ہیں: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے اندر خطبہ دیتے ہوئے سنا جس میں آپ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِتَّقُوْا اللهَ﴾ اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

یہاں تو اس روایت کو اسی لئے لائے ہیں کہ ظاہر ہے یہ ایک ایسا خطبہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ آج میرے سامنے اہلِ ایمان کا جو مجمع موجود ہے، آئندہ ایسا مجمع دوبارہ ملنے والا نہیں ہے۔ ایسے موقع پر جو اہم چیزیں ہوتی ہیں، انہیں کی آدمی اپنے ماتحتوں کو تاکید کرتا ہے۔ گویا یہ موقع بھی ایسا ہی تھا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جس چیز کی تاکید فرمائی اور جس چیز کی طرف متوجہ کیا؛ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم تھا۔

اور پانچ وقت کی نماز پڑھو، رمضان المبارک کے مہینہ کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوۃ ادا کرو اور اپنے حکام کی اطاعت وفرمانبرداری کرو؛ اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے

گویا یہ بنیادی امور ہیں جن کی طرف حضور اکرام صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا۔ اگر ان کا اہتمام کرلیا، تو ان شاء اللہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ھمیں تقویٰ والی صفت سے متصف فرمائے
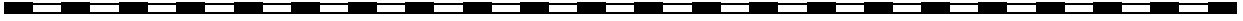
”یقین وتوکل“

مجلس ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد.

فأعوذباللہمن الشيطان الرجيم بسم اللہالرحمن الرحيم.

وَلَمَّارَأَى الْمُؤْمِنُوْنَ الْأَحْزَابَ قَالُوْاهٰذَامَاوَعَدَنَااللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُه.(الأحزاب)

یقین اور اس کے درجات

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان ''یقین وتوکل'' کا قائم کیا ہے۔ یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک ہے یقین اور ایک ہے توکل۔ یقین کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا ایسا پختہ علم ہو کہ اس میں کسی قسم کا کوئی تردد اور شک وشبہ نہ ہو، کسی بھی قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اگر کسی چیز کا ایسا پختہ علم ہے تو اس کو یقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہر مسلمان جانتا ہے کہ مکہ مکرمہ ایک شہر کا نام ہے، وہاں کعبۃ اللہ ہے۔ تو مکہ مکرمہ کے وجود کا علم ایسا پختہ ہے کہ اس میں کسی مسلمان کو کوئی تردد اور شک وشبہ نہیں ہے، یہ یقین ہے۔

اور اس یقین کے مختلف درجات ہیں۔ اس کا ایک درجہ علم کا ہے، اور یہی علم اگر مشاہدہ کی شکل اختیار کر لے؛ تو اس کو عین الیقین کہتے ہیں۔ اور یہی علم اگر تجربہ کی شکل اختیار کر لے؛ تو اس کو حق الیقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جیسے آگ کے متعلق ہر آدمی جانتا ہے کہ وہ جلاتی ہے۔ تو آگ کے جلانے کی صفت

کا ہر ایک کو یقین ہے، یہ تو علم الیقین کہلاتا ہے۔اور ایک شکل یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی نگاہوں کے سامنے آگ کے اس عمل کو دیکھے کہ کہیں آگ لگی اور آگ نے کسی چیز کو خاکستر کردیا، یہ جو یقین حاصل ہوا؛ وہ عین الیقین کہلاتا ہے۔اور اگر کہیں خود ہی آگ سے پالا پڑ گیا اور آگ میں ہاتھ یا پاؤں گر گیا اور اس کی وجہ سے ہاتھ یا پاؤں جل گیا تو اب اس یقین نے تجربہ کی شکل اختیار کرلی؛ تو اس کو حق الیقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یقین کے یہ تینوں درجات ہیں۔

﴿شنیدہ کے بود مانند دیدہ﴾

ویسے علم الیقین میں بھی کسی قسم کے شک وشبہ اور تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے،لیکن جب کسی چیز کا مشاہدہ ہوتا ہے تو یقین ہونے کے باوجود آدمی کے دل کو ایک قسم کے اطمینان و سکون کی کیفیت حاصل ہوجاتی ہے۔جیسے قرآنِ پاک میں ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باری تعالیٰ سے عرض کیا: ﴿رَبِّ أَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتیٰ﴾ اے پروردگار! مجھے دکھلایئے کہ آپ مردوں کو زندہ کس طرح کرتے ہیں؟ باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا گیا: ﴿أَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ کیا آپ کو اس کا یقین اور ایمان نہیں ہے؟ ﴿قَالَ بَلیٰ وَلٰکِن لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ﴾ کہا: کیوں نہیں لیکن میرے دل کو اطمینان ہوجائے۔ایک ایسی چیز کا جو عجیب وغریب ہو، جب خبر صادق کے ذریعہ سے یعنی ایسی اطلاع کے ذریعہ سے جس کو ہم جھٹلا نہیں سکتے؛ ہمیں یقین ہوجاتا ہے، اس یقین کے بعد پھر دل میں اشتیاق اور بے کلی کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ یہ چیز جس کا ہمیں یقین ہے؛ یہ کیسی ہوگی؟ جیسے ایک آدمی نے لوگوں کی زبان سے سنا کہ مکہ مکرمہ ایک بستی ہے اور وہاں کعبۃ اللہ آباد ہے، تو اس کا یقین ہے، لیکن اب دل میں اشتیاق، رغبت اور بے چینی کی کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس کی زیارت کروادے، اب یہ دعا کرتا ہے کہ

اے اللہ! وہاں کا منظر مجھے دکھلا دے، مدینہ پہنچا دے۔ شاعر لوگ اپنے کلام میں بھی اس کو پیش کرتے ہیں۔ تو یہ جو دعائیں کی جارہی ہیں اور مطالبہ کیا جارہا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے ہونے کا یقین نہیں ہے، بلکہ اس کا یقین ہے تب ہی تو آگے اس کی زیارت کی تمنا کا اظہار کیا جارہا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آگے کا مطالبہ خود اس یقین ہی کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خبر کے سچے اور یقینی ہونے کے باوجود جو کیفیت مشاہدہ کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے؛ وہ مزید چیز ہے۔ عربی میں مثل ہے: ﴿لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَۃِ﴾ سننے کے نتیجہ میں کسی چیز کا جو یقین حاصل ہوتا ہے؛ وہ دیکھنے کی طرح نہیں ہے۔

اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے جب یہ درخواست کی گئی کہ باری تعالیٰ مجھے دکھلایئے کہ آپ مردوں کو زندہ کس طرح کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس قدرت کا یقین تھا تب ہی آگے انہوں نے سوال کیا۔ چونکہ ایک عجیب وغریب چیز تھی کہ ایک چیز جو جاندار ہے، وہ مرجائے اور گل سڑ جائے، پھر مٹی میں مل جائے، اس کے بعد دوبارہ زندہ ہو۔ یہ عجیب چیز ہونے کی وجہ سے دل میں اشتیاق اور رغبت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اسی لئے سوال کیا۔

﴿انبیاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خصوصی معاملہ﴾

اب یہاں ایک سوال ہوسکتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین تھا پھر باری تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال کیوں کیا گیا: ﴿أَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ اے ابراہیم! کیا آپ ایمان و یقین نہیں رکھتے؟

دراصل اللہ تعالیٰ کے یہاں حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معاملہ میں بڑی احتیاط

برتی جاتی ہے، کوئی ایسی چیز جو ظاہری یا معنوی طور پر ان پر عیب لگنے کا ذریعہ بن سکتی ہو؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی ساری چیزوں سے ان کی ذات اور شخصیات کو پاک کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق حدیثِ پاک میں آتا ہے۔

بنی اسرائیل کے یہاں یہ رواج تھا کہ وہ لوگ جب غسل کرتے تھے تو کپڑے نکال کر سب کے سامنے برہنہ غسل کیا کرتے تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، ظاہر ہے کہ حیاء کی صفت ان میں کتنی کامل ہوگی۔ لہٰذا ان کو یہ چیز ناگوار تھی، اس لئے وہ بھی کپڑے اتار کر غسل کرتے تھے لیکن لوگوں کے سامنے نہیں، بلکہ چھپ کر کیا کرتے تھے، اس چیز کا بنی اسرائیل نے اُلٹا مطلب لے لیا، اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ چھپ کر غسل کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کوئی بات ہے۔ ان میں کوئی ایسا عیب ہے جس کو یہ چھپانا چاہتے ہیں، یا کوئی ایسی بیماری ہے جس کو ظاہر ہونے دینا نہیں چاہتے، برص کا کوئی داغ ہوگا یا خصیتین پھول گئے ہوں گے، اس لئے یہ چھپ کر غسل کرتے ہیں۔

یہاں دیکھئے کہ لوگوں کے دلوں میں ایسی چیز آرہی تھی جو نبی کی ذات کے متعلق عیب کی تھی اور اس کے نتیجہ میں ہوسکتا ہے کہ ان کے دلوں میں جو وقعت وعظمت نبی کی ہونی چاہیے؛ وہ باقی نہ رہے، اور یہی چیز ایمان اور نبی کی اطاعت وفرمانبرداری کے معاملہ میں مخل اور رکاوٹ بن جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے دور کرنے کا انتظام ہوا۔

چنانچہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تنہائی میں کپڑے نکال کر ایک پتھر پر رکھ کر غسل کررہے تھے، غسل سے فارغ ہوکر جب کپڑے لینے کے لئے آگے بڑھے تو اس پتھر نے چلنا شروع کردیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پتھر کے پیچھے

دوڑ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں:﴿ثَوْبِیْ حَجَرُ، ثَوْبِیْ حَجَرُ﴾ اے پتھر! میرے کپڑے لا، اے پتھر! میرے کپڑے لا۔ یہ اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور وہ پتھر بھی آگے آگے دوڑ رہا ہے۔ان کو یہ خیال ہی نہیں تھا کہ یہ پتھر مجھے کہاں لے جا کر کھڑا کرے گا۔ چنانچہ وہ پتھر ان کو ایسی جگہ لے گیا جہاں بنو اسرائیل کی ایک جماعت بیٹھ کر باتیں کر رہی تھی، وہ پتھر وہاں جا کر رکا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جلدی سے اپنے کپڑے لے کر پہنے اور اس پتھر پر لاٹھیاں بھی ماریں۔ حدیث میں ہے کہ لاٹھی کے نشان اس پتھر پر پڑ گئے، اب اتنی دیر میں ان لوگوں نے دیکھ لیا کہ ان کے جسم میں کوئی عیب نہیں ہے۔ دیکھئے! ان کی براءت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انتظام کیا گیا۔قرآنِ پاک میں ہے:﴿یَاأَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسیٰ فَبَرَّأَہُ اللّٰہُ مِمَّا قَالُوْا﴾ اے ایمان والو! تم ان کے جیسے نہ بنو جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی، پھر جن باتوں کا ان پر الزام لگتا تھا؛ اس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بری کر دیا۔

(مشکوٰۃ شریف، حدیث نمبر ۵۷۰۶/ بخاری شریف، حدیث نمبر ۲۶۹)

﴿ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی براءت ﴾

تو حضرات انبیاء کی شخصیات پر کوئی الزام آتا ہو، وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی براءت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآنِ پاک میں ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان سے پوچھیں گے:﴿أَءَ نْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَأُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ﴾ اس کی توجیہ حضراتِ مفسرین نے یہ کی ہے کہ ساری دنیائے عیسائیت حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ حضرت مریم کو خدا مانتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔اب دوسرے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال آئے گا کہ جب سب ہی حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کی عبادت کرتے ہیں تو شاید حضرت عیسیٰ ہی نے اپنی قوم کو یہ کہا ہوگا کہ میری اور میری ماں کی پوجا کرو۔ ورنہ یہ

محال لگتا ہے کہ سب ہی ان کی عبادت کے اندر لگے ہوئے ہوں، تو عیسائیوں کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے نعوذ باللہ یہ الزام حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آسکتا تھا، حالانکہ ایک نبی جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب دی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا نبی اور رسول بنایا ہے؛ وہ کبھی بھی اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کا حکم نہیں دے سکتا۔ قرآنِ پاک میں بھی اس کی صاف صاف صراحتاً نفی کردی گئی ہے۔ لیکن عیسائیوں کے طرزِ عمل کی وجہ سے دیکھنے والوں کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوسکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمام اولین و آخرین کی موجودگی میں ان کی براءت اس طرح ظاہر فرمائیں گے کہ باری تعالیٰ ان سے پوچھیں گے: ﴿أَءَ نْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَأُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب لوگوں کی موجودگی میں جواب عرض کریں گے: ﴿سُبْحٰنَکَ مَایَکُوْنُ لِیْ أَنْ أَقُوْلَ مَالَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ، اِنْ کُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ﴾ اے اللہ! تیری ذات پاک ہے، مَیں کیسے کہہ سکتا ہوں ایک ایسی بات جس کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اگر مَیں نے کوئی ایسی بات کہی ہے تو آپ تو جانتے ہیں۔ میرے اندر کی تمام باتوں کو آپ جانتے ہیں۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس الزام سے اپنے بری ہونے کا اعلان کریں گے یہ واقعہ تو قیامت کے روز ہونے والا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے قیامت میں پیش آنے والے واقعہ کو قرآنِ پاک میں نازل فرما کر دنیا میں بھی ان کی براءت ظاہر فرمادی۔ بہرحال! حضراتِ انبیاء کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ رہا ہے۔

﴿مزید توضیح﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے جب یہ سوال کیا گیا کہ اے پروردگار! آپ

مجھے دکھلایئے کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے یہ سوال نہیں تھا کہ باری تعالیٰ! کیا آپ مردوں کو زندہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟ بلکہ سوال یہ تھا کہ آپ کیسے زندہ کرتے ہیں۔ کیفیت پوچھی گئی تھی۔ خود زندہ کرنے کے متعلق کسی شک وشبہ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن جب کیفیت کے سلسلے میں سوال کیا جاتا ہے تو قرائنِ خارجیہ سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے، یعنی خارجی دلائل کو چھوڑ کر نفسِ سوال پر جب غور کیا جاتا ہے تو اس میں دونوں احتمال ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی آپ سے یوں کہے کہ مَیں ایک انگلی سے بیس مَن وزن اٹھا سکتا ہوں۔ یا ایک رسی باندھ کر کہے کہ مَیں اس رسی پر چل کر دکھلا سکتا ہوں۔ اب ایک آدمی کا رسی کے اوپر چلنا یا ایک انگلی سے بیس مَن وزن اٹھانا؛ یہ عجیب وغریب چیز ہے۔ اب جو آدمی یہ کہہ رہا ہے اس کے دیگر حالات کا سننے والے کو علم ہے، اور بھی بہت ساری عجیب وغریب چیزیں اس نے پہلے بھی کر کے دکھلائی ہیں، اور اس کے خارجی قرائن کو دیکھ کر اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ جب وہ کہتا ہے اور پہلے بھی کر چکا ہے تو یہ بھی کرسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود ایسی چیز کا دعویٰ کر رہا ہے جو عجیب وغریب ہے۔ لہٰذا کوئی اس سے کہتا ہے کہ ذرا کر کے تو دکھاؤ۔ تو ''کر کے دکھاؤ'' کا جو سوال ہے وہ اس لئے نہیں کیا ہے کہ یہ نہیں کرسکتا ہے، بلکہ اس طرح پتلی رسی پر چلنا ایک عجیب وغریب کام ہے، اور اس کی بات کا سننے والے کو یقین ہے کہ یہ ایسا کرسکتا ہے، تب ہی اس کے دل میں دیکھنے کا اشتیاق اور رغبت پیدا ہوئی، اس لئے سوال کیا۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ''کر کے دکھاؤ'' کا سوال تعجیز کے لئے کیا جاتا ہے۔ جیسے یہی دعویٰ ایک ایسا آدمی کرے، جس سے ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جاتا اور جس کی طرف سے آج

تک کوئی ایسی چیز نظر بھی نہیں آئی۔ تو سننے والا سوچے گا کہ اس کی ٹانگوں میں طاقت تو ہے نہیں، سیدھا چل تو سکتا نہیں، اور پھر ایسا دعویٰ کر رہا ہے۔ تو اب سننے والا کہے گا کہ پتلی رسی پر چل کر تو ذرا دکھاؤ۔ یہاں سوال ہی بتلا رہا ہے کہ اس کا عاجز ہونا بتلانے کے لئے یہ سوال کیا گیا ہے، گویا اس کو یقین ہے کہ یہ چل نہیں سکے گا پھر بھی سوال یہ بتلانے کے لئے کر رہا ہے کہ تو اس طرح چل کر نہیں بتلا سکتا۔ معلوم ہوا کہ اس طرح کے سوال میں دونوں احتمال ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں بلکہ ابوالانبیاء ہیں اور خلیل اللہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا یقین اللہ تعالیٰ کی قدرت پر جیسا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی شخصیت سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے اس سوال میں دونوں احتمال تھے کہ شاید یہ سوال تعجیز کے لئے کیا گیا ہو، اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاملہ میں یہ احتمال نہیں ہے، لیکن اوندھی کھوپڑیاں بھی ہوتی ہیں۔

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ خرابی دو وجہ سے آتی ہے، کج فہمی کی وجہ سے یا کم فہمی کی وجہ سے۔ یعنی یا تو سمجھ ہی نہیں ہے اس وجہ سے اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ یا اُلٹی سمجھ کی وجہ سے سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو ہو سکتا تھا کہ کوئی کم فہم یا کج فہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کی وجہ سے اشکال کرے کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی اس قدرت پر یقین نہیں تھا اس وجہ سے یہ سوال کیا: ﴿رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی زبان سے اس کا جواب دلوا کر ایسے اعتراض کا دروازہ بند کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ سوال کیا گیا: ﴿أَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ اے ابراہیم! آپ یہ سوال کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود

جواب دے رہے ہیں: ﴿بَلٰی﴾ کیوں نہیں! یہ یقین تو ہے، لیکن مزید اطمینان کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ دل میں اشتیاق ورغبت کی کیفیت ہے اور دل چاہتا ہے کہ ایسا عجیب وغریب منظر آنکھوں سے دیکھ لوں؛ تاکہ دل کو سکون ہوجائے۔

بہرحال! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ یقین کے تین درجات ہیں، علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔علم الیقین کا اگر مشاہدہ ہوجائے؛ تو اسی کو عین الیقین کہتے ہیں۔اور اگر اس کا تجربہ ہوجائے؛ تو اسی کو حق الیقین کہتے ہیں۔

﴿کفرِ جحود﴾

لیکن ایمان کے معاملہ میں صرف یقین کافی نہیں ہے، یقین کے ساتھ ماننا اور زبان سے اقرار کرنا بھی ضروری ہے۔اگر کسی کو یقین تو ہے جیسے مشرکینِ مکہ کو نبی کریم ﷺ کے اللہ کا رسول ہونے کا یقین تھا۔اسی طرح یہودیوں کو نبی کریم ﷺ کے نبی آخر الزمان ہونے کا یقین تھا؛ لیکن وہ لوگ مانتے نہیں تھے اور زبان سے اقرار نہیں کرتے تھے۔قرآنِ پاک میں موجود ہے: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ﴾ مشرکین نے نبی کریم ﷺ کی نبوت اور اللہ تعالیٰ کی آیات ونشانیوں کا انکار کیا، حالانکہ ان کے دلوں کو اُس کا یقین تھا۔اسی طرح اہلِ کتاب کے بارے میں ہے: ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ أَبْنَآئَهُمْ﴾ اہلِ کتاب نبی کریم ﷺ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔لیکن پھر بھی انہوں نے انکار کیا۔اسی کو محدثین اور علماء کی اصطلاح میں کفرِ جحود کہتے ہیں یعنی ایسا انکار کہ دل کو یقین ہے پھر بھی زبان سے انکار ہے۔دنیا میں بھی ایسا ہوتا ہے۔

آپ کورٹوں میں دیکھیں گے کہ ایک مجرم ہے جس کے خلاف جرم عائد کیا گیا ہے،

پولیس نے اس کے خلاف کیس داخل کیا لیکن وہ جانتا ہے کہ پولیس کے پاس میرے اس جرم پر کافی ثبوت موجود نہیں ہیں۔ اب اس کے دل کو یقین ہے کہ یہ جرم تو مَیں نے کیا ہے، اس کے باوجود سب کے سامنے وہ انکار کر دیتا ہے کہ مَیں نے یہ نہیں کیا، مَیں نہیں مانتا۔ کفر جو د میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔

تو ایمان کے لئے صرف یقین کافی نہیں ہے، ایمان صرف یقین سے نہیں آتا، بلکہ یقین کے ساتھ ساتھ ماننا اور پھر زبان سے اس کا اقرار کرنا بھی ضروری ہے۔

یقین وتوکل

بہر حال! علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کے اندر یقین کا تذکرہ کیا ہے اور یقین کے ساتھ توکل کو بھی جوڑ دیا ہے۔ اس لئے کہ لغت کے اعتبار سے ''توکل'' کہتے ہیں کسی چیز پر، کسی شخص پر یا کسی تدبیر پر بھروسہ کرنے کو۔ اور شریعت کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرنے کو ''توکل'' کہتے ہیں۔ گویا آدمی یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی میرے کام بنانے والے ہیں۔ اور توکل اسباب کے چھوڑنے کا نام نہیں ہے۔ شریعت نے جہاں توکل کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں اسباب کو اختیار کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں جو بھی چیزیں وجود میں آتی ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے اسباب ووسائل کے ساتھ جوڑا ہے۔ نفع و نقصان، کامیابی وناکامی کے اسباب مقرر کر دیے ہیں کہ یہ کرو گے تو اس کا نتیجہ فلاں شکل میں ظاہر ہوگا۔ محنت کرو گے تو کامیاب ہوگے اور محنت نہیں کرو گے، سستی کر کے بیٹھے رہو گے تو ناکام ہو جاوگے۔ تو اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دارالاسباب بنایا۔ اس لئے امورِ دنیا ہوں یا امورِ آخرت؛ تمام کے لئے اسباب مقرر کئے ہیں، اور اسی لئے اسباب ووسائل کو اختیار کرنے کا بھی حکم دیا

ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی تعلیم دی کہ اس کے نتائج کو ظاہر کرنے میں اللہ تعالیٰ ان اسباب و وسائل کا محتاج نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ﴿لِكُلِّ دَآءٍ دَوَآءٌ اِلَّا الْمَوْتَ﴾ (ابوداؤدشریف، ۳۳۵۷) ہر بیماری کی ایک دوا ہے سوائے موت کے۔ گویا آپ ﷺ نے بتلا دیا کہ جتنی بھی بیماریاں ہیں ہر ایک کی کوئی نہ کوئی دوا ہے اور شریعت کا حکم بھی ہے کہ علاج کرو۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ﴿تَدَاوَوْا﴾ تم دوا کرو۔ (سنن ترمذی، ۴/۳۸۳)

اب کوئی آدمی بیمار ہو جائے تو وہ طبیب کے پاس جائے گا۔ طبیب بیماری کی تشخیص کرے گا، اس کے بعد علاج تجویز کرے گا اور پرہیز بتلائے گا، یہ طبیب کا کام ہے، بیمار کا کام یہ ہے کہ طبیب کی تجویز کے مطابق علاج معالجہ کرے، ساتھ میں پرہیز کا بھی اہتمام کرے۔ لیکن اس پر شفا کا ہو جانا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو تندرستی ہوگی اور اگر نہیں چاہیں گے تو تندرستی نہیں ہوگی۔ تو اسباب اختیار کرنا ضروری ہے؛ لیکن نتیجہ کا ظاہر ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔

﴿ترکِ اسباب کا نام توکل نہیں﴾

شریعت نے اسباب کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ بندے کو یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے نتیجہ کے معاملہ میں تمہارے دل میں یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو نتیجہ مرتب ہوگا۔ بندہ تو محتاج ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ اسباب موجود ہوں اور نتیجہ مرتب نہ ہو۔

جیسے آگ جلاتی ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے جب آگ میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا: ﴿كُونِىْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰىٓ اِبْرَاهِيْمَ﴾ اب ہر آدمی جانتا ہے کہ آگ

کی خاصیت جلانا ہے لیکن آگ اپنی اس خاصیت کے اندر اللہ تعالیٰ کے ارادے، اس کے حکم اوراس کی مشیت کی محتاج ہے۔گویا مومن کو جہاں اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، وہاں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلایا گیا کہ اسباب کو اختیار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا ہے اسباب کو ضرور اختیار کیا جائے گا۔شریعت ترکِ اسباب (جس کو علماء کی اصطلاح میں تعطّل کہا جاتا ہے، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا) کی اجازت نہیں دیتی۔روزی دینے والی ذات اللہ کی ہے:﴿اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْن﴾ لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ﴾ (معجم کبیر للطبرانی،۸/۳، نمبر۹۸۵۱) حلال روزی کو حاصل کرنا، اس کی جستجو میں لگنا؛ فرائض کے بعد ایک اہم فریضہ ہے۔اسی طرح حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزی کے دس حصوں میں سے نو حصے تجارت میں رکھے ہیں۔(المطالب العالیۃ،۴/۳۷۴)

ایک آدمی سوال کرنے کے لیے حضور ﷺ کے پاس آیا، حضور ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک پیالہ ہے۔تو حضور ﷺ نے اس کا نیلام کرکے اس سے کلہاڑے کا پھل خرید کر اس میں دستہ لگا کر اس کو دیا کہ اس سے محنت کرو۔ (ابوداؤد شریف، حدیث نمبر ۱۳۹۸) تو دیکھو! تعطّل کی اجازت نہیں ہے۔لیکن اسباب اختیار کرنے بعد بھی بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے۔مومن اسباب کو انجام دیتا ہے لیکن وہ اسباب کا غلام اوراسیر وقیدی نہیں ہوا کرتا، اس کی نگاہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ہوتی ہے؛ اسی کا نام توکل ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے ترمذی شریف کی روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنے اونٹ کے متعلق پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا اس کے گھٹنے کو باندھوں پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کروں یا ایسے ہی کھلا ہوا چھوڑ دوں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کروں؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا

کہ باندھواور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔(مجمع الزوائد،طبرانی ۱۰/۲۹۱۔سنن ترمذی،۲۴۴۱) گھر کھلا ہوا رکھ کر بھروسہ مت کرو کہ مال محفوظ رہے گا، بلکہ تالا لگاؤ، پھر تالے پر بھروسہ مت کرو، بلکہ بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے؛اسی کا نام توکل ہے۔

شریعت میں تدبیر کو اہمیت دی گئی ہے۔حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ دو آدمیوں کا معاملہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔آپ ﷺ نے ان میں سے ایک کے حق میں فیصلہ کیا تو دوسرا جس کے خلاف فیصلہ کیا تھا وہ کہنے لگا:﴿حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل﴾ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:﴿عَلَیْکَ بِالْکَیْس﴾ تمہیں سمجھداری اور تدبیر سے کام لینا چاہیے تھا ﴿فَاِنْ عَجَزْتَ وَغَلَبَکَ﴾ پھر اگر تم تدبیر سے عاجز آجاتے اور حالات تم پر غالب آجاتے؛ تو پھر تمہیں زبان سے کہنا چاہیے:﴿حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل﴾اسباب اختیار کئے بغیر نہیں۔

(ابوداؤد شریف،حدیث نمبر ۳۱۴۳)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اسباب کی تفصیل بیان کی ہے جو آئندہ مجلس میں بتلائی جائے گی

”یقین وتوکل“

مجلس ﴿۲﴾

اقتباس

ترکِ اسباب یعنی اسباب چھوڑنے کا نام توکل نہیں ہے، بلکہ ترکِ اعتماد علی الاسباب یعنی اسباب پر اعتماد و بھروسہ چھوڑنے کا نام توکل ہے

شریعت نے جہاں توکل اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں اسباب اختیار کرنے کا بھی حکم دیا ہے، اس لئے کہ دنیا میں جو بھی چیزیں وجود میں آتی ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے اسباب و وسائل کے ساتھ جوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دارالاسباب بنایا، اس لئے امورِ دنیا ہوں یا امورِ آخرت؛ تمام کے لئے اسباب مقرر کئے ہیں، اور اسی لئے اسباب و وسائل کو اختیار کرنے کا بھی حکم دیا ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی تعلیم دی کہ اس کے نتائج کو ظاہر کرنے میں اللہ تعالیٰ ان اسباب و وسائل کا محتاج نہیں ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے توکل حاصل کرنے کا بہت آسان نسخہ بتلایا ہے۔ اور بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اگر اس پر عمل کریں گے تو امید ہے کہ ان شاء اللہ توکل حاصل ہو جائے گا۔ وہ یہ ہے کہ جب بھی کسی کام کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرنے جا رہا ہو تو پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر دل میں یہ سوچ لے کہ اے اللہ! اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے میں اس تدبیر کو انجام تو دے رہا ہوں، لیکن اس مقصد کا حاصل ہونا تیری مشیت اور تیرے ارادے پر موقوف ہے۔ تو اگر چاہے گا تو حاصل ہوگا، ورنہ حاصل نہیں ہوگا۔ اپنے ذہن میں یہ بات مستحضر کر لے اور پھر اس تدبیر کو انجام دے

اگر آدمی روزانہ اس کی عادت ڈال لے گا اور اسی سوچ کے ساتھ آگے بڑھے گا تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ تھوڑے دنوں کے بعد اس کی کیفیت بدل جائے گی، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل و اعتماد کی صفت آسانی سے حاصل ہو جائے گی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد.

فأعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم. وَلَمَّارَأَی الْمُؤْمِنُوْنَ الْأَحْزَابَ قَالُوْاھٰذَامَاوَعَدَنَااللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ، وَمَازَادَھُمْ اِلَّااِیْمَاناً وَّتَسْلِیْماً. (الأحزاب)

یقین وتوکل کا بیان چل رہا تھا، ویسے دونوں چیزیں الگ الگ ہیں جیسا کہ پہلے بتلایا جاچکا ہے لیکن وہ ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں کہ آدمی کا یقین جس قدر پختہ ہوگا اتنا ہی اس کو اللہ تعالیٰ کی کارسازی پر بھروسہ زیادہ ہوگا، اور وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرے گا، اس لئے دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے، اور توکل کے بارے میں بتلا دیا تھا کہ ترکِ اسباب یعنی اسباب چھوڑنے کا نام توکل نہیں ہے، بلکہ ترکِ اعتماد علی الاسباب یعنی اسباب پر اعتماد و بھروسہ چھوڑنے کا نام توکل ہے۔ آدمی اسباب تو اختیار کرے گا، البتہ دل سے اس بات کا پختہ یقین ہو کہ کام بنانے والی ذات تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔

﴿اسباب کی تفصیل اور ان کا حکم......یقینی اسباب﴾

علماء نے اسباب کے متعلق تفصیل بیان کی ہے کہ اسباب تین طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ اسباب، جو یقینی ہیں، ان کو تو اختیار کرنا شریعت نے ضروری قرار دیا ہے، اگر کوئی ان اسباب کو اختیار نہ کرے، تو وہ گنہ گار ہوگا۔ جیسے بھوک کے لئے کھانا۔ تو کھانا

کھانے کی وجہ سے آدمی شکم سیر ہوجاتا ہے اوراس کی بھوک ختم ہوجاتی ہے۔تو شکم سیری کا سبب کھانا ہے۔اسی طرح پیاس کے لئے پانی کا پینا۔آدمی پانی پئے گا تو وہ سیراب ہوجائے گا۔تو کھانے کے نتیجے میں شکم سیری کا حاصل ہونا اور پانی پینے کے نتیجے میں پیاس کا بجھنا؛ یہ یقینی اسباب میں سے ہے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔کبھی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اس کے خلاف کردیں وہ الگ بات ہے۔جیسے ایک بیماری استسقاء (જલંદર) ہوتی ہے، جس میں آدمی پانی پیتا ہی رہے، اس کے باوجود اس کی پیاس بجھتی نہیں ہے۔یا ایک بیماری جوع البقر کی ہوتی ہے کہ اس میں آدمی کھاتا ہی رہے اس کے باوجود بھوک مٹتی نہیں ہے۔ ویسے عام حالات میں یہی ہوتا ہے کہ کھانے کے نتیجے میں شکم سیری اور پینے کے نتیجے میں سیرابی حاصل ہوتی ہے۔ان اسباب کو ''یقینی اسباب'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اوران کا اختیار کرنا شریعت ضروری قرار دیتی ہے ایک آدمی بھوکا ہے اور کھانا سامنے موجود ہے، تو شریعت اس کو حکم دیتی ہے کہ کھانا کھا کر اپنی بھوک مٹاؤ۔اب اگر کھانا سامنے موجود ہونے کے باوجود نہ کھاوے، یہاں تک کہ بھوک کی وجہ سے موت آجاوے؛ تو وہ آدمی گنہگار ہوگا اور جیسے خودکشی کرنے والا نافرمان قرار دیا جاتا ہے، ایسا ہی حکم اس پر بھی لاگو پڑے گا۔یہی حکم پیاسے کا ہے کہ پانی موجود ہے، اور شریعت حکم بھی دیتی ہے کہ پانی پیو، اس کے باوجود وہ پانی نہیں پیتا یہاں تک کہ پیاس کی وجہ سے موت آجائے تو گنہگار ہوگا۔لیکن جس وقت وہ کھانا کھا رہا ہو یا پانی پی رہا ہو، اس وقت دل میں یقینی اسباب ہونے کے باوجود اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ اس کھانے کے ذریعہ سے شکم سیری کا حاصل ہونا اور پانی کے ذریعہ سے سیرابی کا حاصل ہونا؛ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور چاہت وارادے پر موقوف ہے، اگر اللہ

چاہے گا تو میرا پیٹ بھرے گا، اور اگر اللہ نہیں چاہے گا تو نہیں بھرے گا۔ اگر اللہ چاہے گا تو اس پانی سے میری پیاس دور ہوگی اور اگر اللہ نہیں چاہے گا تو نہیں ہوگی۔ دل میں یہ یقین ہونا چاہیے، یقینی اسباب کا یہی حکم ہے۔

﴿ظنی اسباب﴾

دوسرا درجہ ظنی اسباب کا ہے، یعنی ان اسباب کو اختیار کرنے کی وجہ سے اکثر حالات میں نتیجہ مرتب ہوتا ہے، اور اس کے بالمقابل کم حالات وہ ہیں جن میں نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی آدمی بیمار ہے، تو اس کا علاج ومعالجہ کرنا۔ تو عام حالات میں علاج ومعالجہ کی وجہ سے تندرستی حاصل ہوتی ہے، لیکن صدفی صد نہیں۔ تو یہ سبب ''سببِ ظنی'' کہلاتا ہے۔ ایسے اسباب اختیار کرنے کو سنت قرار دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے خود نبی کریم ﷺ نے بہت سی بیماریوں کے علاج بتلائے اور خود آپ ﷺ نے علاج کروائے۔ اور حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کوئی ایسی بیماری نہیں جس کی دوا اللہ تعالیٰ نے اتاری نہ ہو، سوائے بوڑھاپے کے۔ (ابوداؤد شریف، ۳۳۵۷) اور آپ نے حکم بھی دیا: ﴿یَـاعِبَـادَاللّٰہِ اِتَدَاوَوْا﴾ (ترمذی، ۱۹۶۱) اے اللہ کے بندو! علاج کرو۔ اور خود حضور اکرم ﷺ نے اس کو اختیار کیا اور حضرات صحابہ یا آپ کے گھر کے افراد میں سے کوئی بیمار ہوتا تھا تو آپ ﷺ اس کا علاج کرواتے تھے۔ تو یہ سنت قرار دیا گیا ہے۔ لیکن وہاں بھی وہی بات پیش نظر رہے کہ طبیب کو چاہیے کہ وہ بیماری کی تشخیص کر کے اس کیلئے علاج تجویز کرے، یہ اس کا کام ہے۔ اور مریض کا کام یہ ہے کہ اس کے لیے طبیب کی طرف سے جو دوا تجویز کی گئی ہے اس کو استعمال کرے۔ لیکن یقین تو یہی ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اس سے شفاء ہوگی؛ ورنہ نہیں ہوگی۔ گویا یہ عقیدہ اور خیال رکھتے ہوئے ان ظنی

اسباب کو اختیار کرنا چاہیے۔ بندہ تو شفاء کے لیے علاج ومعالجہ کا محتاج ہے، لیکن اللہ تعالیٰ شفاء دینے کے لیے علاج ومعالجہ کا محتاج نہیں ہے۔ تو علاج ومعالجہ سنت ہے۔ اب کوئی آدمی بیمار ہے اور علاج ومعالجہ نہیں کرواتا، تو اس صورت میں وہ سنت کا چھوڑنے والا قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح کمائی کے اسباب اختیار کرنا بھی سنت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی ہے

﴿اسبابِ وہمیہ﴾

تیسرا درجہ اسبابِ وہمیہ ہے۔ مثلاً تعویذ وغیرہ کے طریقے۔ ان کو اسبابِ وہمیہ میں سے قرار دیا گیا ہے، ان کا اختیار نہ کرنا اور چھوڑنا؛ شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ اور مستحب ہے۔ توکل کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی ان کو اختیار نہ کرے۔ ویسے اگر کوئی آدمی ان اسباب کو شریعت کے بتلائے ہوئے حدود کے مطابق اختیار کرے گا؛ تو منع بھی نہیں ہے۔ اس کو اختیار کرنے کی اجازت ہے، لیکن اختیار نہ کرنا اچھا ہے۔ اسباب کی یہ تیسری قسم ہوئی۔

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ شریعت کی نگاہ میں اسباب کو چھوڑنے کا نام توکل نہیں ہے، بلکہ اسباب پر اعتماد کو چھوڑنے کا نام توکل ہے۔ ایک آدمی کمائی کے لیے دوکان کرتا ہے، کارخانہ کھولتا ہے، ملازمت کرتا ہے، کمائی کے واسطے یہ سارے اسباب ہیں، ان کو اختیار کرے، لیکن بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو، یہ سمجھے کہ روزی دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، بہت سے حضراتِ اکابر نے اسباب اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اسباب پر اعتماد نہ کرنے کو اعلیٰ درجہ کا توکل قرار دیا ہے، اور اسباب چھوڑنے کو اس سے کم درجہ کا توکل قرار دیا ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! مَیں اپنی اونٹنی کا گھٹنہ باندھوں اور پھر اللہ پر توکل کروں یا اس کو کھلا ہوا چھوڑ دوں اور

پھر توکل کروں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کو باندھو اور توکل کرو (مجمع الزوائد، طبرانی ۱۰/۲۹۱، سنن ترمذی، ۲۴۴۱)

گویا اسباب اختیار کرنے کے بعد بھی نظر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، یہ اعلیٰ درجے کا توکل ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ جو آدمی اسباب چھوڑتا ہے اس کو تو توکل کرنا ہی ہے۔ ویسے جن اہل اللہ کا یقین اعلیٰ درجے کا ہے اور کسی حال میں بھی ان کی نظر کسی اور طرف نہیں جاتی؛ ان کے حق میں اسباب چھوڑنے کو اعلیٰ درجہ قرار دیا گیا ہے۔

ایک آدمی کارخانہ چلا رہا ہے اور اس کو یقین ہے کہ روزی دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، کارخانے سے روزی نہیں ملتی؛ تو یہ اصل توکل ہے۔ ہاں! ایک بات ہے کہ اسباب اختیار کرنے کے معاملہ میں غلو سے کام نہ لے۔ اسباب کے اندر اتر نہ جائے، آج کل جس کو ہم لوگ کہتے ہیں کہ ڈیپ (deep) میں نہ اترے۔ یعنی اسباب کے اندر اتنا زیادہ مشغول ہو جانا جس سے دیکھنے والا یوں سمجھے کہ اس کی نظر ہی اسباب کے اوپر ہے؛ شریعت میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ اسی لیے فقہ کی کتابوں میں بھی جہاں علاج ومعالجہ کا حکم بتلایا گیا ہے، وہاں یہی لکھا ہے کہ آدمی اس یقین اور عقیدے کے ساتھ علاج کرائے کہ شفاء دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے؛ تب تو جائز ہے، اور اگر یہ یقین نہیں ہے تو علاج کرانے کی بھی اجازت نہیں ہے، ایسا علاج کرانا گناہ ہے۔

آج کل لوگوں کا عام مزاج یہی بنا ہوا ہے کہ فلاں ڈاکٹر صاحب کے پاس جاؤ، فلاں صاحب کو دکھلاؤ۔ اور یہ اس انداز سے کہتے ہیں کہ وہاں جائیں گے تو تندرستی ہو ہی جائے گی۔ گویا نظر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوتی ہی نہیں ہے، اگر یہ حالت ہے تب تو علاج کرانے کی اجازت ہی نہیں ہے۔

اسی لیے مَیں تو کہا کرتا ہوں کہ علاج کے معاملہ میں کسی اعلیٰ ڈاکٹر کے بجائے کسی چھوٹے ڈاکٹر کے علاج کو اختیار کیا جائے تا کہ نظر خود بہ خود اس کے علاج کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو جائے۔ یہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ توکل کا حاصل ہی یہ ہے کہ آدمی کا بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو۔

پرندے اسکیم نہیں بناتے

توکل کے سلسلہ میں روایت میں آتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے اوپر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس کا حق ہے، تو اللہ تعالیٰ تم کو ایسی طرح روزی دے جیسا کہ پرندوں کو روزی دیتے ہیں کہ صبح کو اپنے گھونسلوں سے خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے ہوئے واپس لوٹتے ہیں۔ (ترمذی شریف، ۲۲۶۶)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں غور کیجئے کہ پرندوں نے بھی سبب تو اختیار کیا کہ اپنے گھونسلوں میں بیٹھے نہیں رہے بلکہ گھونسلوں سے باہر نکلے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہماری طرح کسی پلان کے ساتھ نہیں۔ ہمارا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کل صبح ہم کوئی تدبیر کرنے والے ہوتے ہیں، تو رات ہی سے اس کے آگے پیچھے کی ساری اسکیم ہمارے ذہن میں بنتی ہے، پرندے ایسی کوئی اسکیم نہیں بناتے کہ کل صبح ہم نکلیں گے تو فلاں جگہ جائیں گے اور ایسا کریں گے۔ جس وقت وہ نکل رہے ہوتے ہیں اس وقت بھی ان کے ذہن میں ایسا نہیں ہوتا کہ مجھے فلاں جگہ ہی جانا ہے۔ بس! وہ نکل کر جنگل میں پہنچتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے لیے روزی کا انتظام کر دیتے ہیں۔ اسباب کے معاملہ میں آدمی کا ذہن اسی طرح کا ہونا چاہیے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دو قصے......ایک سبق

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ وجانشین بنایا گیا، تو چونکہ کپڑوں کی تجارت ان کا پیشہ تھا، دوسرے دن معمول کے مطابق وہ اپنے کپڑوں کی گٹھری لے کر باہر نکلے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کہاں جا رہے ہیں؟ کہا کہ مجھے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنا ہے، اس لیے تجارت کے لیے جا رہا ہوں۔ (نصب الرایہ،۴/۲۸۷) غور کیجیے کہ ظاہر ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صدیقیت کے اعلیٰ مقام پر ہیں تو ایسا تو نہیں ہے کہ باری تعالیٰ کی ذاتِ عالی پر نگاہ نہیں ہوگی، لیکن وہ بھی اسباب اختیار کر رہے ہیں، ایک موقعہ وہ بھی تھا کہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی تو گھر کا سب کچھ سمیٹ کر لے آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا چھوڑا؟ تو کہا: اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں۔ اب دیکھئے! یہاں ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ گھر والوں کے لئے کوئی اسباب چھوڑا نہ جائے، بلکہ وہ جانتے تھے کہ مَیں تاجر آدمی ہوں اگرچہ سب لے آیا لیکن کسی دن بغیر کسی سرمایہ کے بازار میں چلا بھی جاؤں گا تو کوئی نہ کوئی معاملہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ایسا کروا دیں گے کہ میری ضرورت پوری ہو جائے گی۔

جو آدمی تجربہ کار اور ماہر ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے توقع وامید ہوتی ہے، جیسے ایک آدمی کوئی صنعت وحرفت جانتا ہے، ہنرمند آدمی ہے، تو اگرچہ آج اس کے پاس کوئی آرڈر نہیں آیا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ ایک ہنرمند آدمی ہوں، مجھے کوئی نہ کوئی کام مل ہی جائے گا۔ جیسے شہروں میں مزدوروں کو دیکھا ہوگا کہ صبح کو اپنا سامان وغیرہ لے کر آ جاتے ہیں۔ اب ان کو یہ پتہ نہیں ہوتا ہے کہ ہمیں کون لے جائے گا، لیکن جب وہ نکلتے ہیں تو جانتے ہیں کہ کوئی

نہ کوئی مزدوری مل ہی جائے گی، اور ہمارا کام بن جائے گا۔ یہی اصل ہے اسباب کے معاملہ میں زیادہ گہرائی اختیار کرنا اور اسباب کو اس انداز سے برتنا کہ دیکھنے والا یوں سمجھے کہ اس کا سارا زوران اسباب پر ہی لگا ہوا ہے؛ پسندیدہ نہیں ہے۔

﴿اپنی ذاتی ضرورت سے زیادہ کمانا﴾

اور پھر اسباب کے معاملہ میں بھی بقدرِ ضرورت پر اکتفاء کرنا چاہیے، اسی لیے کمائی کے اندر زیادہ مبالغہ آرائی کو بھی شریعت پسند نہیں کرتی۔ حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ سے کسی نے ٹیکس کے متعلق پوچھا کہ اتنی کمائی پر حکومت اتنا سب ٹیکس وصول کر لیتی ہے۔ تو حضرت نے فرمایا کہ اتنا سب کماتے ہی کیوں ہو؟ آپ کی ضرورت تو اس سے کم میں پوری ہو جاتی ہے، پھر کاہے کو اتنا سارا کماتے ہو؟ اتنا سارا کمانا ہی شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے ہاں! اگر کوئی یہ نیت کرے کہ مَیں کما کر اللہ کے راستے میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ کروں گا تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضرورت تو اس سے بہت کم میں پوری ہو رہی ہے تو پھر آگے کی شریعت کی طرف سے اجازت نہیں ملتی ہے۔ دونوں میں فرق ہے جس کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

﴿توکل حاصل کرنے کا آسان نسخہ﴾

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے توکل حاصل کرنے کا بہت آسان نسخہ بتلایا ہے۔ اور بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اگر اس پر عمل کریں گے تو امید ہے کہ ان شاء اللہ توکل حاصل ہو جائے گا۔ وہ یہ ہے کہ آدمی کسی بھی کام کے لیے آدمی تدبیر اختیار کرتا ہے، آدمی کا کام ہی تدبیر کرنا ہے۔ جیسے بچہ کا اسکول میں داخلہ کرانا ہے تو اس کے لئے کوئی تدبیر کرے گا، اور کوئی

ضرورت ہوگی تو اس کے مناسب کوئی تدبیر کرے گا۔ تو جب بھی کسی کام کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرنے جارہا ہو تو پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر دل میں یہ سوچ لے کہ اے اللہ! اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مَیں اس تدبیر کو انجام تو دے رہا ہوں، لیکن اس مقصد کا حاصل ہونا تیری مشیت اور تیرے ارادے پر موقوف ہے۔ تو اگر چاہے گا تو حاصل ہوگا، ورنہ حاصل نہیں ہوگا۔ اپنے ذہن میں یہ بات مستحضر کرلے اور پھر اس تدبیر کو انجام دے۔ اگر آدمی روزانہ اس کی عادت ڈال لے گا اور اسی سوچ کے ساتھ آگے بڑھے گا تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ تھوڑے دنوں کے بعد اس کی کیفیت بدل جائے گی، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل و اعتماد کی صفت آسانی سے حاصل ہو جائے گی۔

﴿غزوۂ خندق اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان ویقین﴾

اب امام نووی رحمۃ اللہ علیہ یقین وتوکل کے سلسلے میں چند آیتیں پیش کررہے ہیں

﴿وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ﴾

سورۂ احزاب کی اس آیت میں غزوۂ خندق کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ۵ھ کا واقعہ ہے کہ مشرکینِ مکہ نے ایک بڑا لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کی تھی، اس کی ابتداء یوں ہوئی تھی کہ قبیلۂ بنونضیر (جو یہودیوں کا ایک قبیلہ ہے) کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے جلاوطن کردیا تھا، وہ لوگ اپنی اسی دشمنی کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ قبیلۂ بنونضیر اور بنووائل کے کچھ لوگ مکہ مکرمہ گئے جس میں حی بن اخطب، ابن ابی الحقیق اور کچھ لوگ تھے۔ انہوں نے مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں کے خلاف ورغلایا کہ تم مدینہ منورہ پر حملہ کرو، ہم بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔ ویسے تو مشرکینِ مکہ

مسلمانوں کے دشمن تھے ہی، ان کو مسلمانوں کے خلاف آمادہ کرنے کے لئے سمجھانے اور ورغلانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ لوگ تو ویسے بھی انہیں تدبیروں میں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں لگے ہی رہتے تھے۔ لیکن روایتوں میں آتا ہے کہ جب وہ لوگ اس طرح سمجھانے کے لئے گئے اور یوں کہا کہ ہم تمہارا ساتھ دیں گے تو ان کو خیال آیا کہ یہ اہلِ کتاب ہیں اور مسلمان جس طرح ہمارے دین یعنی بت پرستی کو برا سمجھتے ہیں، یہ لوگ بھی آسمانی دین کو ماننے والے ہونے کی وجہ بت پرستی کو اچھا نہیں سمجھتے ہوں گے، اس لئے مشرکین نے ان سے پوچھا کہ ہمارا دین بہتر ہے یا ان مسلمانوں کا؟ انہوں نے کہا: تمہارا۔ حالانکہ یہود کو اس بات کا یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں اور اسلام بت پرستی سے روکتا ہے، اور بت پرستی کے مقابلہ میں مسلمانوں کا دین بہتر ہے، اس کے باوجود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف انہوں نے یہ کہا، پھر بھی مشرکین کو یقین نہیں آیا تو کہا کہ چلو! ہم مسجد حرام میں جائیں۔ وہاں سے آئے ہوئے تقریباً بیس آدمی اور مکہ مکرمہ کے پچاس یا سو آدمی سب مل کر مسجد حرام میں گئے اور کعبۃ اللہ کا پردہ پکڑ کر اور کعبہ کی دیواروں سے اپنے سینے لگا کر آپس میں معاہدہ کیا کہ محمد ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف ہم ایک دوسرے کا برابر ساتھ دیں گے یہاں تک کہ وہ لوگ دنیا سے ختم ہو جائیں یا ہم مارے جائیں۔

دیکھئے! یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا حلم ہے کہ اللہ کے دشمن اللہ ہی گھر میں، اس کی دیواروں سے سینے لگا کر اور اس کے پردے پکڑ کر اللہ کے محبوب رسول ﷺ کے خلاف سازشیں تیار کر رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو مہلت اور ڈھیل دے رہے ہیں۔ ویسے اس معاہدے کا انجام جو ہوا؛ وہ تو ساری دنیا نے دیکھا۔

خیر! ان کو آمادہ کرنے کے بعد وہ لوگ قبیلۂ غطفان کے سرداروں کے پاس گئے، یہ قبیلہ مکہ مکرمہ کے آس پاس آباد تھا۔ ویسے ان کو تو مسلمانوں سے براہِ راست کوئی دشمنی نہیں تھی، لیکن ان کو مال کا لالچ دیا کہ خیبر میں کھجوروں کی پیداوار ہوتی ہے جس کا پورا یا آدھا حصہ ہم تم کو دیں گے، مکہ والے تیار ہوئے ہیں تم بھی ان کے ساتھ آجانا۔ وہ مال کے لالچ میں آگئے اور اس طرح طے کرلیا گیا۔ چنانچہ اسی معاہدے کے مطابق مکہ مکرمہ سے ابوسفیان کی سرداری میں چار ہزار کا لشکر نکل کر مقام مرالظہر ان میں آکر ٹھہرا، قبیلۂ غطفان کے جو قبائل تھے ان کو خبر دی گئی، تو وہ بھی آگئے۔ کل ملا کر دس یا بارہ یا پندرہ ہزار کا لشکر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ روانہ ہوا

نبی کریم ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے مشورہ کے لئے صحابہ کرام کو جمع کیا کہ ایسی اطلاع ملی ہے، کیا کیا جائے؟ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو اس وقت نئے نئے اسلام لائے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں فارس میں یہ طریقۂ کار رہا ہے کہ اگر بڑا دشمن ہو کہ میدان میں کھل کر اس کا مقابلہ مشکل ہو تو خندق کھود کر اس کے راستہ میں رکاوٹ ڈال دی جاتی ہے، اور پھر خندق کے اِس طرف سے دشمن کا دفاع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی یہ رائے پسند کی گئی اور نبی کریم ﷺ نے اس کے مطابق فیصلہ فرمایا اور خندق کھودنے کے لئے دس دس آدمیوں کی ٹولیاں بنائی گئیں اور ہر جماعت کو ایک ایک حصہ مقرر کر کے بتلایا گیا کہ تمہیں اتنا اتنا حصہ کھودنا ہے۔ چنانچہ پانچ گز یعنی پندرہ فٹ چوڑی اور گہرائی میں اتنی کہ تری نکل آوے اور ساڑھے تین میل لمبی خندق تیار کی گئی۔ اتنی بڑی خندق کو ان حضرات نے صرف چھ دن میں مکمل کرلیا۔ جب خندق کھود کر تیار کر لی گئی تو معلوم ہوا کہ لشکر آ گیا ہے، لیکن اس لشکر نے دیکھا کہ خندق ہے اور ادھر جا نہیں سکتے۔

اس لشکر کو دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا کہا؟ اس منظر کو باری تعالیٰ نے اس آیت میں بتلایا

ہے: ﴿وَلَمَّارَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوْاهٰذَامَاوَعَدَنَااللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُه﴾ ایمان والوں نے جب مختلف دشمنوں کا یہ مجمع دیکھا تو گھبرائے نہیں، بلکہ انہوں نے کہا کہ ارے! یہ تو وہی چیز ہے جس کا اللہ اوراس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اللہ کے رسول نے ہمیں پہلے ہی بتلا دیا تھا کہ دشمن کی طرف سے تم پراس طرح حملہ کیا جائے گا اوراس موقعہ پراللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے شاملِ حال ہوگی۔ گویا یہ تو وہ وقت آ گیا۔ تو دشمن کو دیکھ کر بجائے پست ہمت ہونے کے یا گھبرانے کے وہ خوش ہوگئے کہ اب تو اللہ کے وعدہ کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ﴿وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ واقعہ یہ ہے کہ اللہ اوراس کے رسول نے سچ کہا۔ ﴿وَمَازَادَهُمْ اِلَّآاِيْمَانًاوَّتَسْلِيْمًا﴾ دشمنوں کے لشکروں کے دیکھنے سے ان کے ایمان میں اور اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے کے جذبے میں اور اللہ کے حکم کو ماننے میں اضافہ ہی ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دیکھ کر ان کے ایمان میں اور اضافہ ہوگیا۔ گویا یہ اللہ پر توکل کی علامت تھی ورنہ اتنے بڑے لشکر کو دیکھ کر عام طور پر ہمتیں پست ہو جایا کرتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کی زبانی جو وعدے کئے گئے تھے، ان پر ان کا ایمان ویقین اور زیادہ بڑھ گیا

اللّٰہ تعالیٰ ھمیں بھی یقین وتوکل کا کمال نصیب فرمائے

”یقین وتوکل“

مجلس ﴿۳﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً۔ أمابعد.

فأعوذباللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْجَمَعُوْالَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًاوَّقَالُوْاحَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ فَانْقَلَبُوْابِنِعْمَۃٍمِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْھُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْارِضْوَانَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ ذُوْفَضْلٍ عَظِیْمٌ

یقین وتوکل کا بیان چل رہا ہے۔سورۂ آل عمران کی اس آیت میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔

﴿غزوۂ حمراء الاسد......اجتماعی یقین کا ایمان افروز منظر﴾

غزوۂ اُحد کے موقعہ پر جب مشرکین کو کامیابی اور مسلمانوں کو شکست ہوئی،اس موقعہ پر ابوسفیان نے-جو مشرکین کے سردار تھے- نبی کریم ﷺ سے کہا تھا کہ آئندہ سال موسم میں مقام بدر میں ہمارا مقابلہ ہوگا اور نبی کریم ﷺ نے اس کو منظور فرمایا تھا،چنانچہ اسی وعدے کے مطابق نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو تیاری کا حکم دیا۔اُدھر اپنے وعدے کے مطابق ابوسفیان نے بھی دو ہزار کا لشکر تیار کیا،اس میں گھوڑے سوار بھی تھے، مکہ مکرمہ سے چل کر مقام مرالظہر ان میں آکر قیام کیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ایسا رعب اور ہیبت ڈالی کہ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی،لیکن دل میں یہ خیال آیا کہ اگر ہم

لوٹ جائیں گے تو لوگوں کو یہ کہنے کا موقعہ ملے گا کہ اپنے وعدے کے مطابق آئے نہیں، بزدلی اور پست ہمتی کا مظاہرہ کیا، اس لئے کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ ہم نہ جائیں، ہماری بات بھی رہ جائے اور سارا الزام مسلمانوں کے اوپر آئے۔ چنانچہ قبیلۂ اشجع کا ایک شخص نعیم بن مسعود عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ گیا ہوا تھا، واپسی میں ابوسفیان سے ملاقات ہوئی تو ابوسفیان نے اس سے کہا کہ اگلے سال ہمارا جو وعدہ ہوا تھا اس کے مطابق ہم لوگ نکلے تو ہیں لیکن یہ قحط کا سال ہے، اور قحط کے سال میں لڑائی نہیں کی جاتی، لڑائی کے بڑے مصارف ہوتے ہیں، قحط والا سال ان کا متحمل نہیں، لیکن چونکہ ان کے ساتھ وعدہ ہوا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہم پر کوئی آنچ نہ آوے، ہماری بزدلی اور پست ہمتی کا مظاہرہ بھی نہ ہو، اور الزام مسلمانوں کے سر آوے، تو آپ ایسا کریں کہ مدینہ منورہ جا کر مسلمانوں کو ڈرائیں کہ مکہ والوں نے تمہارے مقابلے کے لئے بہت بڑا لشکر تیار کیا ہے، اور وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو چکے ہیں، ان کے مقابلے کے لئے تمہارا نکلنا مناسب نہیں ہے۔ اور ابوسفیان نے نعیم بن مسعود سے کہا کہ اگر تم یہ کام کرو گے تو مَیں تمہیں دس اونٹ بطور انعام کے دوں گا۔ چنانچہ نعیم بن مسعود اشجعی ابوسفیان کے کہنے کے مطابق مدینہ منورہ آیا اور مسلمانوں کو ڈرایا۔ آج کل کی زبان میں جس کو پروپیگنڈہ کہتے ہیں کہ جھوٹی بات کو اس انداز سے چلانا کہ لوگ اس کو سچ سمجھنے لگیں۔ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ مکہ والے بہت بڑا لشکر اور بہت سارا ساز و سامان لے کر مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے ہیں اور دیکھو گذشتہ سال وہ لوگ یہاں تمہارے شہر میں آ کر تمہارا مقابلہ کر کے گئے ہیں اور تمہیں شکست ہوئی، تم کو بڑا نقصان پہنچایا تھا، اگر اب کے تم میدان بدر میں وعدے کے مطابق جاؤ گے تو کوئی بھی زندہ واپس نہیں آئے گا اس لئے

تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ تم لوگ نہ نکلو۔اس نے جب یہ بات کہی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں ایسا یقین وایمان پیدا فرمایا کہ اس کی بات سن کر کہنے لگے کہ نہیں بھائی! ہم تو ضرور جائیں گے: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل﴾ اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ہم یہاں نہیں رہیں گے بلکہ وعدے کے مطابق جائیں گے، ہم کو تو نکلنا ہی نکلنا ہے، اللہ تعالیٰ جو فیصلہ کرے گا؛ ہمیں منظور ہے۔اس نے نبی کریم ﷺ سے بھی کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی نہیں آئے گا تو میں اکیلا جاؤں گا۔اسی کو یہاں بیان کیا ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْجَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ﴾ وہ اہل ایمان جن کو لوگوں یعنی نعیم بن مسعود نے کہا کہ تمہارے واسطے لوگوں یعنی مکہ والوں نے بہت بڑا لشکر اور بہت سارا ساز وسامان تیار کیا ہے، اس لئے ان سے ڈرو، اور نکلنے کا ارادہ ملتوی کرو ﴿فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا﴾ اس کی اس بات نے مسلمانوں کے ایمان میں اضافہ کردیا۔یہ بات سن کر بجائے اس کے کہ یہ پست ہمت ہوتے اور ان میں بزدلی آتی، ان کے ایمان میں اور اضافہ ہوگیا۔اور اپنی زبان سے کہنے لگے: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ صحابہ کا لشکر لے کر نکلے اور مقام بدر میں پہنچے۔ان دنوں میں وہاں میلہ اور بازار بھی لگتا تھا، نبی کریم ﷺ نے وہاں آٹھ روز قیام کیا، دورانِ قیام صحابہ نے خرید وفروخت اور تجارت بھی کی، جس کی وجہ سے ان کو تجارت میں مالی نفع بھی ہوا۔اور ان آٹھ دنوں میں مکہ والے نہیں آئے۔بہر حال! بڑی کامیابی کے ساتھ نفع کما کر وہاں سے واپس لوٹے ﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ﴾ یہ اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کی

نعمت اوراللہ کافضل یعنی مالی نفع کما کروہاں سے واپس لوٹے،ان کوکوئی گزنداور تکلیف نہیں پہنچی ﴿وَاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللہِ﴾ اورمزید برآں یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بھی انہوں نے حاصل کی ﴿وَاللہُ ذُوْفَضْلٍ عَظِیْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں

پروپیگنڈہ کسی بھی حال میں قابلِ قبول نہیں

یہاں ان حضرات کے یقین کو بیان کرنا مقصود ہے،اسی لئے اس آیت کو پیش کیا ہے۔اوراسی میں آگے ہے: ﴿اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطَانُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَ ہٗ فَلاَ تَخَافُوْھُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ﴾ شیطان کی تو عادت ہے کہ وہ اہلِ ایمان کواپنے دوستوں سے ڈرایا کرتا ہے،یعنی اس طرح کے پروپیگنڈے کئے جاتے ہیں،اورایسے پروپیگنڈوں سے شیطان اپنے دوستوں کی مدد کرتا ہے اورایمان والوں کواپنے دوستوں کا خوف دلاتا ہے۔باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان سے مت ڈریو بلکہ مجھ سے ڈریو اگر تم ایمان والے ہو۔اوراس طرح کے پروپیگنڈوں اور جھوٹی باتوں کے پھیلانے کی اسلام کسی بھی حال میں اجازت نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ دشمن کے خلاف بھی جھوٹی بات کے پھیلانے کی اسلام میں اجازت نہیں ہے۔ پروپیگنڈہ کسی بھی حال میں قابلِ قبول نہیں ہے۔

حضورِاکرم ﷺ کوتوکل کا حکم

﴿وَتَوَکَّلْ عَلَی الْحَیِّ الَّذِیْ لاَ یَمُوْتُ﴾ پہلی دوآیتیں تو یقین سے متعلق تھیں اور اب چندآیتیں توکل سے متعلق پیش کررہے ہیں۔باری تعالیٰ قرآنِ پاک میں حکم دیتے ہیں کہ بھروسہ کرواس ذات پر جو کہ زندہ ہے اور جس کوکبھی موت نہیں آئے گی۔آدمی اپنے معاملات میں ایسی ذات پر بھروسہ کرتا ہے جس کے متعلق اس کو یقین ہوتا ہے کہ جس معاملہ

میں مَیں اس پر بھروسہ کرنے جارہا ہوں اس معاملہ کو مجھ سے بہتر طریقہ سے انجام دینے کی اس کے اندر قدرت ہے، اور اس معاملہ کو مجھ سے بہتر طریقہ سے وہ سمجھ رہا ہے اور اس معاملہ میں اس کو مجھ سے زیادہ علم حاصل ہے۔ گویا بھروسہ کرنے والا اس معاملہ کی انجام دہی میں جس پر بھروسہ کررہا ہے اس کو تمام خوبیوں اور اوصاف میں بہتر سمجھتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا جو حکم دیا گیا اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص صفت ''حیات'' کو ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ذات جو ہمیشہ زندہ رہے گی جس کو کبھی موت نہیں آتی، ایسی ذات پر بھروسہ کرو۔ دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ جس پر بھروسہ کیا کہ وہ فلاں وقت ہمارے کام آئے گا اور وقت آنے سے پہلے ہی وہ دنیا سے چل دیا تو تمہارا کیا ہوگا؟ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، وہاں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ جس معاملہ میں آپ نے اس پر بھروسہ کیا ہے، اس معاملہ کی انجام دہی سے پہلے نعوذ باللہ کوئی ایسی بات پیش آوے۔

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اللہ ہی کے اوپر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے

﴿مشورہ﴾

﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مشورہ کا حکم دیا ہے۔ ویسے تو آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن علوم اور کمالات سے نوازا تھا اس کے پیشِ نظر بظاہر کوئی ضرورت نہیں تھی کہ آپ کو مشورہ کا پابند کیا جاتا، لیکن مشورہ ایک ایسی چیز ہے جس کے نتیجہ میں آپس میں تعاون وتناصر کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، ایک دوسرے پر اعتماد پیدا ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں کام اچھے طریقے سے انجام دئے جاسکتے ہیں، اس لئے نبی کریم ﷺ کو باری تعالیٰ نے حکم

دیا:﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ایسا کوئی معاملہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کوئی صریح حکم نہیں دیا گیا ہے، ان میں آپ ان سے مشورہ کیجیے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح حکم اور وحی آجاوے وہاں تو پھر مشورہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی کے مطابق کرنا ہے۔

گویا مشورہ ایک تدبیر ہے کہ آئندہ ان معاملات کو انجام دینے کے لئے کیا شکل اختیار کی جائے، کیا تدبیریں کی جائیں، کیسے اسباب اختیار کئے جائیں۔ اسباب اختیار کرنے اور تدبیروں کے سلسلے میں مشورہ ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی عادتِ شریفہ ہر موقعہ پر مشورہ کرنے کی تھی۔ غزوۂ بدر کے موقعہ پر جب آپ ﷺ قریش کے تجارتی قافلہ کے تعاقب کے لئے روانہ ہوئے اور راستے میں معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ سے ایک لشکر اس قافلہ کی حمایت وحفاظت کے لئے نکل چکا ہے، اب حالات بدل گئے، فوراً نبی کریم ﷺ نے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ غزوۂ احد کے موقعہ پر جب پتہ چلا کہ مکہ مکرمہ سے ایک بڑا لشکر مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے ارادے سے چلا ہے تو نبی کریم ﷺ نے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ حدیبیہ کے موقعہ پر جب آپ روانہ ہوئے اور معلوم ہوا کہ مکہ والوں نے نبی کریم ﷺ کو روکنے کے لئے ساری تدبیریں کر لی ہیں کہ کسی حال میں ان لوگوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے نہیں دیں گے تو آپ ﷺ نے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ تو نبی کریم ﷺ ایسے مواقع پر جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی صریح حکم بذریعۂ وحی نہیں ملتا تھا؛ مشورہ کیا کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ مشورہ تدبیروں کے سلسلے میں ہوتا تھا کہ یہ حالات ہیں اس موقعہ پر کون سی تدبیر اختیار کرنا مناسب ہے۔ اور جب یہ مشورہ ہو جائے ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ﴾ اور اس مشورے کے نتیجے میں اے نبی جب آپ کوئی فیصلہ

کرلیں (اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشورہ تو سب سے کیا جائے گا، لیکن فیصلہ امیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے، وہ جو مناسب سمجھے؛ فیصلہ کردے۔ اور مشورہ کے بعد جو تدبیر اختیار کرنے کا فیصلہ ہوا ہے اس پر بھروسہ نہیں کرنا ہے بلکہ) ﴿فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾ تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ واعتماد کرنا ہے۔ یہاں وہی بات آ گئی کہ اسباب کو اختیار کرنا ہے لیکن ان اسباب پر بھروسہ نہیں کرنا ہے، بھروسہ تو اللہ تعالیٰ ہی پر کرنا ہے۔ یہی اصل توکل ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توکل کے سلسلے میں قرآنِ پاک میں بہت ساری آیتیں ہیں جو اہلِ علم کے سامنے واضح ہیں۔

﴿توکل پر کیا ملے گا؟﴾

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ جب توکل کا حکم دیا ہے، تو اب اگر آپ توکل کریں گے تو آپ کو کیا ملے گا؟ اس بات کو بتلانے کے لئے یہ آیت پیش کی ہے کہ باری تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہے کہ جو آدمی کسی بھی معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے اوپر بھروسہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہو جائے گا۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ اہلِ ایمان کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل اللہ کے خوف سے لبریز ہو جاتے ہیں ﴿وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ اور جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو پڑھا جاتا ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے ﴿وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ اور اپنے پروردگار ہی پر وہ بھروسہ کرتے ہیں۔

اب اس سلسلے میں روایتیں پیش کرتے ہیں:-

﴿بغیر حساب کے جنت میں جانے والے﴾

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: عُرِضَتْ عَلَيَّ الْأُمَمُ، فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ وَمَعَهُ رُهَيْطٌ، وَالنَّبِيَّ وَمَعَهُ الرَّجُلُ وَالرَّجُلانِ، وَالنَّبِيَّ وَلَيْسَ مَعَهُ أَحَدٌ. اِذْ رُفِعَ لِيْ سَوَادٌ عَظِيْمٌ، فَظَنَنْتُ أَنَّهُ أُمَّتِيْ، فَقِيْلَ لِيْ هٰذَا مُوْسىٰ وَقَوْمُهُ، وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْأُفُقِ، فَنَظَرْتُ فَإِذَا سَوَادٌ عَظِيْمٌ، فَقِيْلَ لِيْ اُنْظُرْ اِلَى الْأُفُقِ الْآخَرِ، فَإِذَا سَوَادٌ عَظِيْمٌ، فَقِيْلَ لِيْ هٰذِهٖ أُمَّتُكَ. وَمَعَهُمْ سَبْعُوْنَ أَلْفًا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ وَلَا عَذَابٍ. ثُمَّ نَهَضَ فَدَخَلَ مَنْزِلَهُ، فَخَاضَ النَّاسُ فِيْ أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ وَلَا عَذَابٍ. فَقَالَ بَعْضُهُمْ فَلَعَلَّهُمُ الَّذِيْنَ صَحِبُوْا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ. وَقَالَ بَعْضُهُمْ: فَلَعَلَّهُمُ الَّذِيْنَ وُلِدُوْا فِي الْإِسْلَامِ وَلَمْ يُشْرِكُوْا بِاللهِ شَيْئًا. وَذَكَرُوْا أَشْيَاءَ. فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَقَالَ: مَنِ الَّذِيْ تَقُوْلُوْنَ؟ فَأَخْبَرُوْهُ. فَقَالَ: هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَرْقُوْنَ وَلَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ، وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ. فَقَامَ عُكَّاشَةُ بْنُ مِحْصَنٍ وَقَالَ: اُدْعُ اللهَ أَنْ يَّجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ. فَقَالَ: أَنْتَ مِنْهُمْ. ثُمَّ قَامَ رَجُلٌ آخَرُ وَقَالَ: اُدْعُ اللهَ أَنْ يَّجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے اگلی امتیں پیش کی گئیں، مَیں نے اس منظر میں دیکھا کہ ایک نبی ہیں اور ان کے ساتھ ایک چھوٹی سی جماعت ہے۔﴿رُهَيْطٌ﴾ کا اطلاق تین سے لے کر نو تک کے لئے ہوتا ہے۔ گویا ان کے ساتھ بہت کم لوگ ہیں۔ اور بعضے ایسے نبی بھی دیکھے کہ ان کے ساتھ ایک ہی آدمی یا دو آدمی ہیں۔ گویا ان پر ایمان لانے والوں کی تعداد صرف ایک یا دو تھی۔ اور ایک نبی ایسا بھی دیکھا کہ ان کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔

اِس زمانے میں جو دین کا کام کرنے والے ہیں ان کے لئے یہ بڑی عبرت والی روایت ہے۔ غور کیجئے کہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جن کو اللہ تعالیٰ نے منصبِ نبوت پر فائز کیا کسی نبی سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے منصبِ نبوت کے فرائض کو ادا نہ کرے، وہ تو پوری تن دہی اور اخلاص واستقامت سے اپنے فرضِ نبوت کو ادا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان پر ایمان لانے والے ایک یا دو آدمی ہیں۔ آج اس گئے گذرے دور میں بھی آپ اور ہم دین کا کام لے کر اگر چلتے ہیں اور محنت کرتے ہیں تو ہمارا ساتھ دینے والی ایک بڑی جماعت ہو جاتی ہے۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں یہ منظر دیکھتا جا رہا تھا کہ اسی دوران میرے سامنے ایک بہت بڑی جماعت پیش کی گئی۔ مَیں یہ سمجھا کہ یہ میری امت ہے۔ مَیں نے پوچھا کہ کیا یہ میری امت ہے؟ تو مجھے بتلایا گیا کہ یہ تو حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کی قوم ہے۔ لیکن پھر کہا گیا کہ آپ آسمان کے کناروں کی طرف دیکھئے۔ وہاں دیکھا تو بہت بڑی جماعت تھی۔ پھر کہا کہ دوسرے کنارے کو دیکھو۔ چنانچہ وہاں بھی بہت بڑی جماعت تھی۔ گویا آسمان کے سارے کنارے بھرے ہوئے تھے۔ پھر مجھے بتلایا گیا کہ یہ آپ کی امت ہے۔ اور ان کے ساتھ ستر ہزار تو وہ ہیں جو جنت میں بلا حساب اور بغیر عذاب کے داخل ہوں گے۔

راوی حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ اتنی بات ارشاد فرما کر نبی کریم ﷺ اپنی مجلس سے اٹھے اور گھر میں تشریف لے گئے۔ وہ ستر ہزار کون ہیں اس کی تفصیل آپ نے ارشاد نہیں فرمائی۔ آپ کے گھر میں تشریف لے جانے کے بعد اس مجلس میں جو صحابہ بیٹھے ہوئے تھے ان میں بحث چل پڑی، چرچا ہونے لگا کہ یہ ستر ہزار لوگ جو بغیر حساب اور

بغیرعذاب کے جنت میں جائیں گے وہ کون ہیں؟ ان کے کیا اوصاف ہوں گے؟ ہر ایک اپنی اپنی سمجھ لڑا رہا تھا۔ بعضوں نے کہا کہ شاید یہ وہ لوگ ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی صحبت کی سعادت سے نوازا۔ بعضوں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ کی صحبت تو ملی لیکن انہوں نے کفر کا زمانہ بھی پایا اور ان کی زندگی کا کچھ حصہ کفروشرک کی حالت میں بھی گذرا، اگرچہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے لیکن کسی زمانہ میں کفروشرک سے بھی کچھ ناتہ تو رہا، اس لئے شاید یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی ولادت اور پیدائش ہی اسلام میں ہوئی، گویا مسلمان ماں باپ کے یہاں ہی پیدا ہوئے اور انہوں نے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کا ارتکاب نہیں کیا۔ بہرحال! یہ چیزیں آپس میں زیرِ بحث تھیں۔

نبی کریم ﷺ تک ان کی بحث اور چرچا کی آوازیں پہنچیں تو آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ کاہے کا یہ شور ہے؟ کس چیز کا چرچا ہو رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے ابھی بتلایا تھا کہ ستر ہزار وہ ہیں جو بغیر حساب اور بلا عذاب کے جنت میں جائیں گے تو ہم آپس میں یہ چرچا کر رہے ہیں کہ وہ خوش نصیب کون ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو جھاڑ پھونک نہ خود کرتے ہیں اور نہ کسی سے کرواتے ہیں اور نہ بدشگونی لیتے ہیں۔ یہ تین اوصاف ذکر کئے۔

﴿لَا یَرْقُوْنَ وَلَا یَسْتَرْقُوْنَ﴾ کے سلسلے میں حضراتِ شراح فرماتے ہیں کہ چونکہ نبی کریم ﷺ سے بھی جھاڑنا ثابت ہے، اس لئے ایسا رقیہ اور جھاڑنا تو جائز ہے کہ جس میں قرآنِ پاک کی آیات یا ایسے کلمات کے ذریعہ سے ہو کہ جس میں شرک نہیں ہے، یا وہ کلمات کہ جن کا مفہوم ہمارے سامنے ہے اور اس میں ایمان کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے۔

اور اگر ایسے کلمات ہیں کہ جن کا مطلب ومفہوم ہم نہیں جانتے، کسی دوسری زبان کے کلمات ہیں اور پتہ بھی نہیں کہ اندر کیا کہا گیا ہے، ہوسکتا ہے کہ کوئی شرکیہ مفہوم ہو؛ ایسی جھاڑ اور رقیہ کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

اور بعضوں نے کہا کہ مطلق جھاڑنا اور جھڑوانا مراد ہے چاہے اجازت والا ہو؛ اس سے بھی جو لوگ بچتے ہیں۔ اب اشکال ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے بھی جھاڑنا ثابت ہے۔ تو اس کے متعلق وہ حضرات فرماتے ہیں کہ چونکہ آپ ﷺ پر شریعت کے احکام کو بیان کرنا بھی تھا، اس لئے آپ نے جو جھاڑا ہے، وہ جواز کو بتلانے کے لئے ہے۔ آپ تو متوکلین کے سردار ہیں، آپ کے لئے تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ لیکن آپ کے علاوہ دوسروں کے لئے نفس جھاڑنا، چاہے جواز کی حد میں رہ کر ہی کیوں نہ ہو؛ اس کا چھوڑنا ہی توکل کا اعلیٰ درجہ ہے۔

﴿وَلَا یَتَطَیَّرُوْنَ﴾ اور بدشگونی نہیں لیتے۔ عرب میں بدشگونی کا بھی عام رواج تھا کوئی آدمی کسی مقصد کے لئے باہر نکلا اور کوئی پرندہ بائیں طرف سے آکر دائیں طرف کو نکل گیا تو سمجھتے تھے کہ کامیابی ہوگی۔ اور اگر دائیں طرف سے بائیں طرف کو گیا، تو سمجھتے تھے کہ ناکامی ہوگی۔ بلکہ بعض مرتبہ کوئی پرندہ اس طرح جاتا ہوا نہ ملتا، تو کسی بیٹھے ہوئے پرندے کو اُڑا کر شگون لیا کرتے تھے۔ شریعت نے کہا کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

بعض روایتوں میں ﴿لَا یَرْقُوْنَ﴾ کی جگہ پر ﴿لَا یَکْتَوُوْنَ﴾ ہے۔ ﴿لَا یَکْتَوُوْنَ وَلَا یَسْتَرْقُوْنَ وَلَا یَتَطَیَّرُوْنَ﴾ لوہا گرم کرکے داغ لگا کر علاج نہیں کرتے۔ زمانۂ جاہلیت میں علاج کا ایک طریقہ یہ بھی تھا، بعد میں بھی جاری رہا۔ بعض روایتوں میں اس کی ممانعت بھی آئی۔ لیکن ساری روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ بوقتِ ضرورت اس کی اجازت ہے۔ تو جو داغ

والا علاج نہیں کراتے اور جھڑواتے نہیں ہیں اور بدشگونی نہیں لیتے ۔﴿وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ بلکہ وہ لوگ اپنے تمام کاموں میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا کرتے ہیں۔

عام طور پر کسی بڑی بیماری سے جب واسطہ پڑتا ہے اور آدمی اس بیماری سے تنگ ہو جاتا ہے، اور مصائب میں گھر جاتا ہے، تو ایسے موقعہ پر وہ جھاڑ پھونک کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس لئے ایسے مواقع پر کامل توکل یہ ہے کہ اس سے اپنے آپ کو بچایا جائے، لیکن اگر شریعت کے حدود وقیود کے مطابق کرتا ہے؛ تو جواز میں کوئی کلام بھی نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ کی یہ بات سن کر حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ اٹھے اور کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان ستر ہزار میں سے بنادے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ آپ ان میں سے ہیں۔ پھر دوسرے آدمی کھڑے ہوئے اور انہوں نے بھی درخواست کی: دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان ستر ہزار میں سے بنادے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس بات میں عکاشہ تم سے سبقت لے گئے۔

اب یہ جواب حضور اکرم ﷺ نے کیوں دیا؟ اس پر بھی حضراتِ علماء اور حدیث کے شارحین نے تفصیلی کلام کیا ہے۔ بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ جن صفات پر بغیر حساب و بلا عذاب کے جنت میں جانے کے لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا، آپ نے حضرت عکاشہ میں وہ صفات دیکھیں، اس لئے آپ نے ان کے لئے دعا فرمادی۔ اور دوسرے جو اٹھے تھے ان میں وہ چیز نہیں دیکھی اس لئے ان کے متعلق یہ فرمادیا﴿سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ﴾

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو اختیار دیا گیا ہو کہ اس مجلس میں سے کسی ایک کے حق میں آپ یہ فرمادیں گے وہ اس زمرہ میں

شامل ہو جائے گا۔ جب حضرت عکاشہ نے پہلے درخواست کی اور ان کے متعلق فرمادیا تو جس چیز کا اختیار دیا گیا تھا اس کو وہ لے اُڑے۔ اب دوسرے کے لئے اس کی گنجائش ہی نہیں تھی، اس لئے آپ نے ﴿سَبَقَکَ بِهَا عُکَّاشَةُ﴾ فرمادیا۔

بعضوں نے یہ بھی کہا کہ اگر اس کے متعلق فرمادیتے تو تیسرا اٹھتا، پھر چوتھا اٹھتا، اور یہ سلسلہ چل پڑتا اور آخر میں اس سلسلے کو منقطع کرنا ہی پڑتا؛ اس لئے آپ نے پہلے ہی روک دیا۔

''یقین وتوکل''

مجلس ﴿۴﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. امابعد.

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ أن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول: اَللّٰھُمَّ لَکَ أَسْلَمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْکَ أَنَبْتُ وَبِکَ خَاصَمْتُ: أَللّٰھُمَّ أَعُوْذُ بِعِزَّتِکَ لَااِلٰہَ اِلَّاأَنْتَ أَنْ تُضِلَّنِیْ أَنْتَ الْحَیُّ الَّذِیْ لَاتَمُوْتُ وَالْجِنُّ وَالْاِنْسُ یَمُوْتُوْنَ.

ماثور دعائیں......نبوی تعلیمات کا نچوڑ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب یقین وتوکل کا قائم کیا ہے اس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا نقل فرماتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں کے ذریعہ سے بھی اپنی امت کو تعلیم دیا کرتے تھے، آپ کی مانگی ہوئی دعاؤں میں اگر کوئی غور کرے تو ان کے ذریعہ سے امت کو اللہ تعالیٰ سے جوڑنے کا ایک خاص نظام بنا کر دیا گیا ہے۔

مثلاً رمضان المبارک کا مہینہ ہے اس کے جو خصوصی فضائل ہیں اور اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو خصوصی انعامات اپنے بندوں پر کئے جاتے ہیں اور جو خصوصی رحمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہیں ان خصوصی انعامات اور رحمتوں کو حاصل کرنے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں خاص طور پر تاکید فرمائی اور اس مہینے کو

وصول کرنے کی خاص تاکید کی ہے، اس اہتمام کو ظاہر کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے دعاؤں میں کیسا اہتمام فرمایا کہ جب کوئی شخص رجب کا چاند دیکھے تو حضور ﷺ نے تاکید فرمائی کہ یہ دعا پڑھو: ﴿أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَافِیْ رَجَبَ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَااِلیٰ رَمَضَانَ﴾ اے اللہ! تو ہمارے لئے رجب اور شعبان کے مہینے میں برکت عطا فرما اور ہم کو رمضان تک پہنچادے یعنی جب رمضان کے مہینے کو زیادہ زمانہ باقی نہیں رہا، صرف دو مہینے آڑے رہ گئے ہیں، ایسا مبارک مہینہ آرہا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس مبارک مہینے کی برکتوں کو حاصل کرنے سے پہلے موت آجائے۔ گویا حضور ﷺ نے رمضان المبارک کی طلب اور اس کو وصول کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کا اہتمام رجب کے چاند کو دیکھ کر شروع فرمایا۔ جو لوگ اس دعا کو سمجھ کر اور اس کے معانی کو سامنے رکھ کر پڑھیں گے، تو ظاہر ہے کہ ان کے دلوں میں کیا کچھ اہتمام رمضان المبارک کی وصول یابی کے لئے پیدا ہوگا۔

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم نے سنایا تھا کہ ان کے یہاں سے ایک جماعت کیرالہ کے علاقے میں گئی تھی، وہ بتلا رہے تھے کہ رجب کے مہینے سے وہاں روزانہ ہر نماز کے بعد پوری مسجد ایک ساتھ یہ دعا پڑھتی ہے: ﴿أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَافِیْ رَجَبَ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَااِلیٰ رَمَضَانَ﴾ گویا کسی نے ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کر پوری مسجد کو اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ دیکھو! رمضان کا برکت والا مہینہ آرہا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بھی رمضان المبارک کا اتنا زیادہ اہتمام ہے کہ ایک سال سے لے کر دوسرے سال تک جنت کو اس کے لئے مزین کیا جاتا ہے۔ گویا رمضان المبارک کے آنے سے دو مہینے پہلے سے نبی کریم ﷺ نے امت کو یہ دعا سکھلا کر اس کے وصول کرنے

کی طرف متوجہ فرمایا۔تو یہ دعا صرف دعا نہیں ہے؛ بلکہ ایک تعلیم ہے۔

﴿ایک اور نمونہ﴾

اسی طرح ہم کسی بستی میں جاتے ہیں تو اس بستی میں پہنچنے پر نبی کریم ﷺ نے ایک دعا سکھلائی ﴿اَللّٰھُمَّ حَبِّبْنَا اِلیٰ اَھْلِھَا وَحَبِّبْ صَالِحِیْ اَھْلِھَا اِلَیْنَا﴾ اے اللہ! تو اس بستی والوں کے دل میں ہماری محبت ڈال دے اور اس بستی کے جو نیک لوگ ہیں ان کی محبت ہمارے دل میں ڈال دے۔

دیکھئے! یہاں دو چیزیں غور کرنے کی ہیں کہ جہاں ہماری محبت ان کے دل میں ڈالنے کی دعا کی گئی، وہاں کوئی فرق نہیں کیا گیا کہ نیک لوگوں کے دلوں میں ہی ہماری محبت آئے، بلکہ تمام بستی والوں کے دلوں میں ہماری محبت ڈال دے۔ایک نئی بستی ہے ہم وہاں پہنچے ہیں، معلوم نہیں ہم کو کسی سے کیا گزند اور تکلیف پہنچ جائے۔لہٰذا اس بستی کے تمام لوگوں کے دل میں، چاہے وہ نیک ہوں یا بد ہوں، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لئے محبت کے جذبات ڈال دئے جائیں گے؛ تو ہم ان شاء اللہ ان کے شر سے محفوظ رہیں گے، اور ان کا خیر ہم کو پہنچتا رہے گا۔تو اس دعا کے پہلے جز میں تو یوں کہا گیا ﴿اَللّٰھُمَّ حَبِّبْنَا اِلیٰ اَھْلِھَا﴾ اے اللہ! ہماری محبت اس بستی والوں کے دلوں میں ڈال دے۔اور دوسرے جز میں یہ کہا گیا ﴿وَحَبِّبْ صَالِحِیْ أَھْلِھَا اِلَیْنَا﴾ اس بستی کے جو نیک لوگ ہیں ان کی محبت ہمارے دل میں ڈال دے۔اس دوسرے جز میں یہ نہیں کہا گیا کہ تمام بستی والوں کی محبت ہمارے دل میں ڈالی جائے، بلکہ اس بستی کے جو حضرات نیک اور صالح ہیں، ان کی محبت ہمارے دل میں ڈالی جائے۔اس لئے کہ اگر کسی برے آدمی کی طرف ہم مائل ہو گئے اور اس کی صحبت میں

بیٹھ گئے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی صحبت ہمارے ایمان کو لے اڑے اور اس سے ہم کو دینی نقصان پہنچ جائے۔ تو گویا دعا کروائی جارہی ہے کہ اس بستی کے جو نیک لوگ ہوں انہیں کی طرف ہمارا دل مائل ہو؛ تاکہ ان کے ذریعہ سے ہم کو نیکی اور بھلائی ہی پہنچے اور ان سے ہم فائدہ ہی اٹھائیں۔

اسی لئے اسلاف کا معمول تھا کہ جب وہ کسی بستی میں جاتے تھے تو خاص طور پر دعا کا اہتمام کرتے تھے کہ اے اللہ! کسی صالح ہم نشین اور نیک شخص کی صحبت میسر ہو۔ کسی نئی مسجد میں بھی پہنچتے تھے تو ان حضرات کا ایسی دعاؤں کا اہتمام رہتا تھا۔

﴿ بروں کی طرف میلان مت رکھو ﴾

بہر حال! اس دعا میں نبی کریم ﷺ نے جہاں ایک دعا بتلائی ہے وہاں ایک تعلیم بھی دی ہے کہ آپ نئی بستی میں جارہے ہیں تو وہاں آپ کو کیسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنی ہے۔ برے لوگوں کی صحبت سے اپنے آپ کو بچانا ہے اور اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا ہے، ان کی طرف مائل ہونا ہے، برے لوگوں کی طرف تمہارا میلان نہ ہو ﴿وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو نافرمان لوگ ہیں اور جنہوں نے نافرمانی کے ذریعہ اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، ایسوں کی طرف تم مائل نہ ہونا، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی طرف ہونے والا یہ میلان اور کشش تم کو جہنم کی آگ تک پہنچادے۔ اسی لئے اعمال میں، افعال میں، لباس میں اور طور طریقوں میں برے لوگوں کی مشابہت اختیار کرنے کی حدیث شریف میں ممانعت فرمائی گئی۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ﴿مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ﴾

بہرحال! مَیں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی دعاؤں میں جہاں امت کے لئے ساری خوبیاں مانگی؛ وہاں ان دعاؤں کے ذریعہ امت کو خاص تعلیم بھی دی اب اس دعا میں بھی جو آدمی غور کرے گا اس کے ذہن میں فوراً یہ بات آئے گی کہ برے لوگوں کی صحبت سے مجھے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔

اسی لئے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: احادیث کا خلاصہ اور نچوڑ نبی کریم ﷺ کی دعائیں ہیں، جو آدمی حضور ﷺ کی دعاؤں میں غور وفکر کرے گا، تو اس کو احادیث کی تعلیمات کا خلاصہ اپنی نگاہوں کے سامنے محسوس ہوگا۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کی ایک دعا نقل کی ہے۔ چونکہ انھوں نے باب ''یقین وتوکل'' کا قائم کیا ہے، اور اس دعا میں بھی توکل کی تعلیم دی گئی ہے، اس لئے اس دعا کو خاص طور پر نقل کیا۔

حضور اکرم ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: ﴿أَللّٰهُمَّ لَكَ أَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ﴾ اے اللہ! مَیں نے تیری ہی اطاعت اختیار کی، اپنے آپ کو تیرے ہی سپرد کردیا اور تیرے ہی اوپر میں ایمان لایا۔

﴿وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ﴾ اور تجھ ہی پر میں نے بھروسہ کیا۔ گویا اس دعا میں نبی کریم ﷺ نے امت کو یہ تعلیم دی کہ جہاں امت توکل حاصل کرنے کے لئے عملی طور پر کوشش کرے؛ وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کا بھی اہتمام کرے۔

﴿ایک عام کوتاہی﴾

یہ بھی عجیب وغریب چیز ہے۔ ہم لوگوں کا مزاج ہے کہ ہم دنیوی امور میں تو دعاؤں

کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ اگر کوئی دکان شروع کی ہے تو خوب دعائیں کریں گے کہ برکت ہو اور تجارت میں نفع ہو، لیکن دین کے معاملہ میں اگر کسی کو کوشش کرنے کی توفیق ہوئی بھی، تو دعاؤں کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہیے، دینے والی ذات تو وہی ہے، ہماری کوشش وتدبیر تو ایک آلہ وذریعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اصل تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لئے آدمی کو اس کا اہتمام ہو۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اولاد کی تربیت کے سلسلے میں جہاں آدمی کو توجہ ومحنت سے کام لینا چاہیے؛ وہاں دعاؤں کا خاص اہتمام ہونا چاہیے، بلکہ دعاؤں کا اہتمام زیادہ مفید ہے۔ اولاد کے دنیوی امور میں تو ہم کچھ نہ کچھ دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن ان کے دینی معاملہ میں اتنا اہتمام نہیں ہوتا۔ بہر حال! اصل ملتا تو اللہ تعالیٰ کے خزانے اور دربار سے ہے، اس لئے حضور اکرم ﷺ ہمیں یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

﴿ بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر ہو ﴾

﴿وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ﴾ اور تجھ ہی پر مَیں نے بھروسہ کیا۔ گویا اس دعا کے ذریعہ سے نبی کریم ﷺ نے ہم کو یہ تعلیم دی کہ ہمارا توکل، اعتماد اور بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر ہونا چاہیے۔

یہاں ''عَلَيْكَ'' کو پہلے لائے، عربی داں جانتے ہیں کہ اس سے حصر مراد ہے کہ تجھ ہی پر توکل وبھروسہ کیا، گویا اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی ایسی ذات دنیا میں ہے ہی نہیں جس پر اعتماد وبھروسہ کیا جاوے۔

﴿وَاِلَیۡکَ اَنَبۡتُ﴾ اور تیری ہی طرف مَیں نے رجوع کیا، ہر معاملے میں رجوع اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہونا چاہیے۔

﴿وَبِکَ خَاصَمۡتُ﴾ اور اے اللہ! تیری ہی مدد سے مَیں نے دشمن کا مقابلہ کیا۔

﴿اَللّٰھُمَّ اَعُوۡذُبِعِزَّتِکَ لَااِلٰہَ اِلَّااَنۡتَ اَنۡ تُضِلَّنِیۡ﴾ اے اللہ! تیری ہی عزت کے واسطے سے مَیں پناہ حاصل کرتا ہوں (تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں) اس بات سے کہ تو مجھے گمراہ کرے۔

﴿اَنۡتَ الۡحَیُّ الَّذِیۡ لَاتَمُوۡتُ﴾ تو وہ زندہ رہنے والی ذات ہے کہ جس کو کبھی موت آنے والی نہیں ہے۔

﴿وَالۡجِنُّ وَالۡاِنۡسُ یَمُوۡتُوۡنَ﴾ اور باقی تمام مخلوقات کو موت آنے والی ہے۔ خاص کر جو بڑی مخلوقات ہیں جن وانس، ان کا ذکر یہاں کیا۔ ورنہ تمام مخلوقات کو موت آنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو موت آنے والی نہیں ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہاں اس دعا میں خاص طور پر ﴿وَعَلَیۡکَ تَوَکَّلۡتُ﴾ کے جملے سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہر معاملہ میں بندے کا توکل، اعتماد اور بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر ہونا چاہیے۔

﴿تدبیر ضرور اختیار کرے﴾

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: حَسۡبُنَااللّٰہُ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ قَالَھَااِبۡرَاھِیۡمُ علیہ السلام حِیۡنَ اُلۡقِیَ فِی النَّارِ. وَقَالَ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وسلم حِیۡنَ قَالُوۡا: اِنَّ النَّاسَ قَدۡجَمَعُوۡا لَکُمۡ فَاخۡشَوۡھُمۡ فَزَادَھُمۡ اِیۡمَانًا، وَّقَالُوۡاحَسۡبُنَااللّٰہُ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ.

وفی روایۃ لہٗ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قَالَ: کَانَ آخِرُقَوْلِ اِبْرَاھِیمَ علیہ السلام حِیْنَ اُلْقِیَ فِی النَّارِحَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ.

دوسری روایت بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی کے حوالے سے لائے ہیں کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ﴾ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ یعنی آدمی کو باری تعالیٰ کی کارسازی پر ہی بھروسہ و اعتماد ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا کارساز سمجھنا؛ یہی توکل ہے۔ آدمی کا اعتماد کسی اور چیز پر نہ ہو۔ تدبیر ضرور اختیار کرے۔ تدبیر کو انجام دینا توکل کے منافی نہیں ہے۔

بلکہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تدبیر کی تعلیم بھی دی ہے۔ ایک صحابی نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ مَیں اپنی اونٹنی کا پاؤں باندھ کر توکل کروں یا کھلا چھوڑ کر؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: باندھو اور پھر توکل کرو۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی تدبیر اختیار کرے لیکن اعتماد و بھروسہ تدبیر پر نہ ہو۔ دکان ضرور کھولے، تجارت اور کاروبار کرے لیکن یہ نہ سمجھے کہ میری روزی یہ دکان دے گی، بلکہ اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو کہ روزی دینے والی ذات اللہ کی ہے۔

﴿حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مثالی توکل﴾

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جملہ اس وقت کہا تھا جب وہ آگ میں ڈالے گئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے بتوں کو (جبکہ ان کی قوم اپنا تہوار عید اور جشن منانے کے لئے بستی سے باہر گئی ہوئی تھی اور یہ تنہا رہ گئے تھے، موقعہ دیکھ کر ان کے بت خانے میں جتنے بھی بت رکھے ہوئے تھے ان سب کو) توڑ دیا۔

خیر! واقعہ مشہور ہے۔ بعد میں جب قوم کو معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ حرکت کی ہے تو ان لوگوں نے یہ کہا کہ ان کو آگ میں ڈال دو، چنانچہ انھوں نے بہت بڑا رقبہ (AREA) کھودا اور اس میں چالیس دن تک لکڑیاں جمع کرتے رہے، بہت بڑی مقدار میں لکڑیاں جمع کر کے اس میں آگ لگائی، اس آگ کی شدت اور تیزی اتنی زیادہ تھی کہ فضا میں کوئی پرندہ اگر اُڑ کر اس کے اوپر آجاتا تھا، تو جل بھن کر اندر گر جاتا تھا۔ اب ان کو آگ میں ڈالنے کا معاملہ آیا۔ اس لئے کہ ڈالنے والے بھی اگر قریب جائیں تو وہ بھی اس آگ کی شدت و تیزی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اب کیا کریں؟ تو شیطان نے ان کو ایک تدبیر سُجھائی کہ گوپھن میں ان کو رکھ کر پھینکو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گوپھن کے اندر رکھا اور اس کے ذریعہ سے پھینکا، جس وقت گوپھن کے ذریعہ ان کو پھینکا گیا، تو روایتوں میں آتا ہے کہ زمین و آسمان کے فرشتے اور ساری مخلوق چیخ پڑی اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنے لگی کہ اس وقت روئے زمین پر آپ کا نام لینے والی شخصیت یہی ایک تو ہے، اور ان کو اس طرح آگ میں ڈالا جا رہا ہے؟ ہم ان کو مدد نہ پہنچائیں؟ باری تعالیٰ نے فرمایا: اگر وہ تمہاری مدد قبول کریں تو ٹھیک ہے، ہماری طرف سے اجازت ہے۔ چنانچہ پانی کا فرشتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا اور عرض کیا: اگر آپ اجازت دیں تو میں پانی کے ذریعہ اس آگ کو بجھا دوں۔ انھوں نے کہا: مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ پھر ہوا کا فرشتہ آیا اور عرض کیا: اگر آپ اجازت دیں تو میں اس آگ کو اُڑا کر دوسری جگہ لے جاؤں۔ آپ نے فرمایا: مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی آئے، انھوں نے کہا تو ان کو بھی کہا: مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آگ کو حکم دیا: تو وہ باغ بن گئی۔

﴿اٹکے ہوئے کاموں کے لئے ایک قرآنی وظیفہ﴾

بہرحال! عین اس موقعہ پر جبکہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا، تمام نے اپنی مدد پیش کرنے کی درخواست کی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں یہ جملہ فرمایا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ﴾ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ اسی لئے آدمی کا کوئی خاص کام اٹکا ہوا ہو، اس وقت بھی یہ دعا پڑھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اپنے اساتذہ سے سنا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے کثرت سے یہ جملہ پڑھا کرتے تھے: ﴿حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ﴾

حضرت مولانا مفتی عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے استاذ تھے، ان کو بھی دیکھا کہ وہ کثرت سے یہ پڑھا کرتے تھے۔ کوئی ضرورت مند آتا تو اس کو بھی یہی بتلایا کرتے تھے۔ اسی لئے لکھا ہے کہ کوئی بہت اہم کام ہو تو ہر نماز کے بعد سو مرتبہ پڑھنا مفید ہے۔

یہ جملہ اللہ تعالیٰ پر بڑا اعتماد وتوکل ظاہر کرنے والا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خاص آزمائش کے موقعہ پر فرمایا تھا۔ لیکن اس کا بھی خاص اہتمام ہو کہ صرف الفاظ ہی الفاظ نہ ہوں بلکہ اس کی حقیقت کو بھی اپنے دل میں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ جملہ بولتے ہوئے اس بات کی کوشش ہو کہ ہمارا اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو؛ پھر تو ان شاء اللہ وہ مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔

﴿خوف کی خبر کے وقت پڑھنے کا وظیفہ﴾

وَقَالَ مُحَمَّدٌ ﷺ حِیْنَ قَالُوْا: اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ جملہ اس وقت

ارشاد فرمایا جب لوگوں نے (نعیم بن مسعود اشجعی نے) آکر آپ کو ڈرایا کہ ان لوگوں نے (مشرکین مکہ نے) آپ کے مقابلے کے واسطے بڑا لشکر اور بڑی فوجیں جمع کر رکھی ہیں، ان سے ڈرو اور ان کے مقابلے کے لئے جانے کا اپنا ارادہ ملتوی کردو۔ ان کا یہ جملہ سن کر بجائے ڈر کر اپنا ارادہ ملتوی کرنے کے نبی کریم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان میں اور زیادہ قوت آگئی اور کہنے لگے: ﴿حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾

یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پیش آیا تھا اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور اس واقعہ کو پہلے تفصیل سے بتلا چکا ہوں۔

﴿توکل پرندے سے سیکھے﴾

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: يَدْخُلُ الْجَنَّةَ أَقْوَامٌ أَفْئِدَتُهُمْ مِثْلُ أَفْئِدَةِ الطَّيْرِ قِيْلَ: مَعْنَاهُ مُتَوَكِّلُوْنَ. وَقِيْلَ: قُلُوْبُهُمْ رَقِيْقَةٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایسے لوگ داخل ہوں گے جن کے دل پرندوں کے دلوں کی طرح ہوں گے۔ پرندوں کے دلوں کی طرح ہونے کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ جیسے پرندے متوکل ہوتے ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل رکھتے تھے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس طرح پرندے نرم دل ہوتے ہیں، اسی طرح یہ بھی نرم دل لوگ تھے۔

پہلے مطلب کے اعتبار سے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو یہاں اس باب میں ذکر کیا ہے۔ چونکہ توکل کا تذکرہ ہے اور پرندوں کے دلوں کے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات

کے اوپر توکل ہوتا ہے، وہ کوئی زیادہ تدبیریں سوچتے نہیں ہیں۔ اور ہمارا حال یہ ہوتا ہے کہ بہت سارے لمبے چوڑے پلان بناتے ہیں، تدبیریں کرتے ہیں، اور اس کے لئے بہت کچھ سوچتے ہیں کہ یہ کریں گے، وہ کریں گے، معلوم نہیں پہلے سے اس کے لئے کیا کیا تیاریاں کی جاتی ہیں، پرندے ایسی کوئی تیاری نہیں کرتے ہیں، جس موقعہ پر جو چیز سامنے آگئی اور اس کے مطابق جو صورت حال ہوتی ہے، اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔

آگے ایک روایت آنے والی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر جیسا توکل کرنے کا حق ہے ویسا توکل کرو تو اللہ تعالیٰ تم کو اس طرح روزی دیں گے جس طرح پرندوں کو دیتے ہیں کہ وہ صبح کو خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس لوٹتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جیسا سوچتے ہیں کہ کل یوں کروں گا اور یہ کروں گا، پرندے کے دل میں ایسا تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ کل فلاں بازار میں جا کر یوں کروں گا، بلکہ وہ صبح کو جس وقت اپنے گھر سے نکل رہا ہوتا ہے تو پہلے سے کوئی بنا بنایا پروگرام تیار نہیں ہوتا۔ ویسے ہمارے بنائے ہوئے پروگرام سے بھی کچھ ہوتا نہیں ہے، ہوتا تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہو۔ اس لئے اصل تعلیم جو ہم کو دی جارہی ہے وہ یہی ہے۔ پروگرام بنانے کی مخالفت نہیں ہے۔ لیکن تعلیم یہ دی جارہی ہے کہ اعتماد پروگراموں اور اپنی تدبیروں پر نہیں ہونا چاہیے؛ بلکہ اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے۔

ہماری ایک غلطی

ہمارا مزاج اس نوع کا بنا ہوا ہے کہ ہم جب کوئی تدبیر اختیار کرتے ہیں یا کوئی پروگرام بناتے ہیں تو ہمارا ذہن ادھر ایسا مائل ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھول کر سارا اعتماد اسی پروگرام پر ہوجاتا ہے۔ اور جہاں جہاں جس قسم کا پروگرام ہوتا ہے وہاں اعتماد بھی اللہ تعالیٰ کی

ذات سے اتنا ہی ہٹا ہوا ہوتا ہے، اور پھر اسی کی مناسبت سے اتنی ہی ناکامی بھی آتی ہے اور جہاں تدبیر پر اعتماد جتنا کم ہوتا ہے؛ وہاں کامیابی بھی اسی مناسبت سے آتی ہے، اس لئے پرندوں کے ساتھ مشابہت دے کر جو تعلق بتلایا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے، جس طرح پرندے متوکل ہوتے ہیں کہ وہ پہلے سے کوئی تدبیریں اور بوجھ اپنے دل پر نہیں رکھتے۔

اور بعضوں نے کہا: جس طرح پرندوں کے دل نرم ہوتے ہیں اسی طرح ان کے دل بھی نرم ہوں گے۔ لیکن پہلے مفہوم ہی کے اعتبار سے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو یہاں پیش کیا ہے۔

﴿حضور ﷺ کے توکل کا ایک واقعہ﴾

عن جابر رضی اللہ عنہ أَنَّهُ غَزَامَعَ النَّبِيِّ ﷺ قِبَلَ نَجْدٍ. فَلَمَّاقَفَلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قَفَلَ مَعَهُمْ فَأَدْرَكَتْهُمُ الْقَائِلَةُ فِيْ وَادٍ كَثِيْرِ الْعِضَاهِ، فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ، وَتَفَرَّقَ النَّاسُ يَسْتَظِلُّوْنَ بِالشَّجَرِ وَنَزَلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ تَحْتَ سَمُرَةٍ، فَعَلَّقَ بِهَا سَيْفَهُ، وَنِمْنَا نَوْمَةً، فَإِذَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَدْعُوْنَا، وَإِذَا عِنْدَهُ أَعْرَابِيٌّ، فَقَالَ: إِنَّ هٰذَا اخْتَرَطَ عَلَيَّ سَيْفِيْ وَأَنَانَائِمٌ، فَاسْتَيْقَظْتُ وَهُوَ فِيْ يَدِهِ صَلْتاً، وَقَالَ مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّيْ؟ قُلْتُ: اَللهُ- ثَلَاثًا. وَلَمْ يُعَاقِبْهُ وَجَلَسَ.

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نبی کریم ﷺ کے توکل واعتماد کو بتلانے کے لئے یہ روایت پیش کی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نجد کے علاقہ کے ایک غزوہ میں شریک تھا، جب آپ ﷺ غزوہ سے واپس تشریف لارہے تھے، تو ایک ایسی وادی میں دوپہر کے آرام کا وقت آیا؛ جہاں بکثرت کانٹے دار درخت موجود تھے۔

نبی کریم ﷺ وہاں اترے اور لوگ مختلف درختوں کے سایوں کے نیچے آرام کرنے کی غرض سے صحراء میں منتشر ہوئے۔ نبی کریم ﷺ بھی کیکر کے ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کیلئے تشریف فرما ہوئے، اور آپ نے اس درخت پر اپنی تلوار لٹکائی اور لیٹ گئے ﴿وَنِمْنَا نَوْمَةً﴾ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ مختلف درختوں کے سایوں میں پھیلے ہوئے تھے، ہم نے بھی ایک آدھ نیند لی کہ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم کو آواز دے رہے ہیں، اور آپ کے پاس ایک دیہاتی بیٹھا ہوا ہے چنانچہ جب ہم حضور کے پاس پہنچے تو آپ نے پوری تفصیل بتلائی: کہ میں سویا ہوا تھا، اس نے آکر میری تلوار۔ جو میں نے درخت پر لٹکا رکھی تھی۔ کھینچی، اور تلوار سونت کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا، جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں تلوار سونتی ہوئی موجود ہے، اور وہ مجھ سے پوچھ رہا ہے: ﴿مَن يَّمْنَعُكَ مِنِّیْ ؟﴾ کون ہے جو میرے ہاتھ سے آپ کو بچا سکتا ہے؟ یعنی گویا میرے ہاتھ میں تلوار کھلی ہوئی موجود ہے اور میں آپ کو قتل کرنے کے لئے تیار ہوں، اب کون سی طاقت ہے جو آپ کو میرے ہاتھ سے بچا سکتی ہے؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں: میں نے اس کے جواب میں کہا: اللہ اس نے تین مرتبہ آپ سے یہی سوال کیا آپ نے یہی جواب دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ کے جواب کا اثر یہ ہوا کہ وہ آپ ﷺ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکا۔

دوسری روایت میں ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ واقعہ غزوۂ ذات الرقاع میں پیش آیا (غزوۂ ذات الرقاع ایک غزوہ ہے جو نبی کریم ﷺ کو علاقۂ نجد میں پیش آیا تھا) ہم حضور ﷺ کے ساتھ تھے اور ہم لوگوں کی عادت یہ تھی کہ جب سفر میں بہت زیادہ سایہ دار درخت دیکھتے اور وہاں آرام کا موقعہ آتا تو ہم وہ درخت نبی کریم ﷺ کے لئے چھوڑ دیتے یعنی

ہم میں سے کوئی بھی اس درخت کے نیچے فروکش نہیں ہوتا بلکہ اس ارادے سے اس کو خالی چھوڑ دیتے کہ حضور ﷺ اپنے آرام کے لئے اس کو پسند فرمائیں۔ چنانچہ مشرکین میں سے ایک آدمی آیا اور نبی کریم ﷺ کی تلوار - جو ایک درخت سے لٹکی ہوئی تھی - اپنے ہاتھ میں لے کر سونتی اور آپ ﷺ سے سوال کرنے لگا: آپ مجھ سے ڈرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ اس نے پھر سوال کیا: کون آپ کو میرے ہاتھ سے بچائے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ۔

یہاں یہ روایت اس بات کو بتلانے کے لئے لائے کہ جو صورتِ حال پیش آئی کہ دشمن کے ہاتھ میں کھلی ہوئی تلوار موجود تھی اور وہ انتقام لینے کے ارادے سے ہی آیا تھا، اور نبی کریم ﷺ کو تکلیف پہنچانا چاہتا تھا، عین اس حالت میں نبی کریم ﷺ کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر توکل واعتماد ایک خاص اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری حفاظت فرمائیں گے۔ چنانچہ اس توکل واعتماد کا ثمرہ ونتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ اس کے ہاتھ لرز گئے اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اب نبی کریم ﷺ نے وہ تلوار اٹھالی پھر آپ ﷺ نے اس سے سوال کیا: اب تو بتا کہ تجھ کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ چونکہ اس کو تو وہ کیفیت حاصل تھی نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان ہی نہیں تھا، تو توکل اور اعتماد تو کیا ہوتا؟ اس لئے اس نے جواب میں کہا: ﴿كُنْ خَيْرَ آخِذٍ﴾ آپ بہترین تلوار اٹھانے والے بن جائیے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی شرافت کو دیکھتے ہوئے امید وتوقع یہ ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔

خیر! حضور ﷺ نے اس کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے کہا: کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں اور مَیں اللہ کا نبی ورسول ہوں؟

اس نے کہا: نہیں۔ لیکن ہاں! آپ سے اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ اب مَیں آپ کے ساتھ قتال وجنگ نہیں کروں گا اور جو لوگ آپ کے ساتھ جنگ کررہے ہیں؛ ان کا ساتھ بھی نہیں دوں گا۔ حضور ﷺ نے اس وعدے پر اس کو چھوڑ دیا۔ بعد میں وہ اپنے قبیلے والوں کے پاس آیا اور ان کے سامنے نبی کریم ﷺ کے اخلاق کی تعریف کی کہ مَیں ایک ایسی شخصیت کے پاس سے واپس آرہا ہوں؛ جو بہترین اخلاق والے ہیں۔ پھر اس نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی، تو وہ سب مسلمان ہوگئے۔

بہرحال! یہاں نبی کریم ﷺ کے اعتماد وبھروسہ ہی کو بتلانے کے لئے لائے ہیں۔ توکل کا اعلیٰ مقام یہی ہے کہ ایسے مواقع میں بھی آدمی کی نگاہ کسی اور طرف نہیں جانی چاہیے، اگر کسی کو حقیقی معنٰی میں توکل کی کیفیت حاصل ہے؛ تو ایسے مواقع پر بھی اس کی نظریں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف اٹھیں گی۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے اِس موقع پر جواب میں کوئی اور بات فرمانے کے بجائے یہی ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بچائیں گے۔

......مگر غلو نہ کرے

عن عمر رضی اللہ عنہ قال: سمعتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ: لَوْ أَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ، تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اگر تم اللہ تبارک وتعالیٰ پر اس طرح توکل وبھروسہ کرنے لگو جیسا کہ اس پر بھروسہ کرنے کا حق ہے؛ تو پھر اللہ تعالیٰ تمہیں اسی طرح روزی دیں گے جس طرح پرندوں کو روزی دیتے ہیں۔ پرندوں کا حال یہ ہے صبح کو اپنے گھونسلوں سے خالی پیٹ باہر نکلتے ہیں اور شام کو جب وہ واپس

آتے ہیں تو شکم سیر لوٹتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ پرندے پہلے سے کوئی تدبیر اور لمبے چوڑے پروگرام نہیں بناتے کہ کل صبح فلاں بازار میں جائیں گے اور یوں سودا سلف لائیں گے اور فلاں کاروبار کریں گے، باقی تدبیر کے درجہ میں اتنا ضرور کرتے ہیں کہ گھونسلوں سے باہر نکلتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرتے ہیں، گھونسلوں میں بیٹھے نہیں رہتے۔

بتلانا یہ ہے کہ آدمی اتنا ضرور کرے کہ کوئی تدبیر اختیار کرے، ہاتھ پاؤں چلائے، لیکن اعتماد و بھروسہ اپنی تدبیر پر نہ ہو، اور تدبیر کے معاملہ میں بہت زیادہ غلو بھی نہ کرے۔ بعض لوگ تدبیریں سوچتے ہیں اور بڑی بڑی اسکیمیں تیار کرتے ہیں کہ اس طرح کریں گے اس میں اس طرح کا سودا ہوگا، اس میں اتنا فائدہ ہوگا، پھر یوں کریں گے۔ حالانکہ بعض دفعہ وہ سارا پلان ایسا بکھرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے شیخ چلّی کا خواب تھا اور کچھ نہیں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے جتنے بھی معاملات ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہیں، اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔

یہاں نبی کریم ﷺ بھی یہی تعلیم دیتے ہیں کہ تدبیر کو تدبیر کی حیثیت سے ضرور اختیار کرنی چاہیے لیکن اتنی ہی جتنی پرندے اختیار کرتے ہیں کہ وہ اپنے گھونسلوں سے ضرور نکلتے ہیں لیکن تدبیر کے سلسلے میں بہت زیادہ غلو سے کام نہیں لیتے، بلکہ تدبیر کی حیثیت سے نکلتے ہیں۔ اور جس وقت نکل رہے ہوتے ہیں، اس وقت ان کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ ہم فلاں جگہ جائیں گے۔ بس باہر نکل پڑے اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق پہنچانے کی جو شکل پیش آئی، اس کے مطابق ان کو روزی میسر ہوئی۔ ایسے ہی انسانوں کو بھی چاہیے کہ

تدبیر کے معاملہ میں بہت زیادہ غلو اختیار نہ کریں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کریں۔ اگر یہ صورت پیدا ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا؛ جو پرندوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور ان کو بھی اسی طرح آسانی سے روزی پہنچ جائے گی؛ جس طرح پرندوں کو پہنچ جاتی ہے۔

اور یہ بھی ہے کہ آدمی جب اپنے آپ کو تدبیروں میں ہوشیار سمجھنے لگتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اس کو اس کی ذات کے حوالے کر دیتے ہیں کہ اب اپنی تدبیریں آزما کر دیکھ لے کہ کیا ہوتا ہے؟

﴿سونے سے پہلے سارے معاملات خدا تعالیٰ کو سونپ دے﴾

عن أبی عمارة البراء بن عازب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: یَافُلَانُ! اِذَا أَوَیْتَ اِلٰی فِرَاشِکَ فَقُلْ: ﴿أَللّٰهُمَّ أَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْکَ، وَوَجَّهْتُ وَجْهِیْ اِلَیْکَ وَفَوَّضْتُ أَمْرِیْ اِلَیْکَ، وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِیْ اِلَیْکَ، رَغْبَةً وَّرَهْبَةً اِلَیْکَ، لَامَلْجَأَ وَلَا مَنْجٰی مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ، اٰمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ أَنْزَلْتَ، وَنَبِیِّکَ الَّذِیْ أَرْسَلْتَ﴾ فَاِنَّکَ اِنْ مِتَّ مِنْ لَیْلَتِکَ مِتَّ عَلَی الْفِطْرَةِ وَاِنْ أَصْبَحْتَ أَصَبْتَ خَیْرًا.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک صحابی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید کو اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت براء کو فرمایا: اے فلاں! جب تم اپنے بستر کی طرف آرام کے واسطے پہنچو؛ تو اس وقت یہ دعا پڑھ لیا کرو: ﴿أَللّٰهُمَّ أَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْکَ﴾ اے اللہ! میں نے اپنی ذات کو تیرے حوالے کیا، اپنی ذات کے تمام معاملہ میں میں نے تیرے اوپر بھروسہ کر لیا

﴿وَوَجَّهْتُ وَجْهِیَ اِلَیْکَ﴾ اورمَیں نے اپنا رخ تیری طرف پھیرلیا﴿وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْکَ﴾ اورمَیں نے اپنا معاملہ تیرے حوالے کردیا﴿وَاَلْجَأْتُ ظَهْرِیْ اِلَیْکَ﴾ اورمَیں اپنی پشت کے لئے تیری پناہ حاصل کرتا ہوں﴿رَغْبَةً وَّرَهْبَةً اِلَیْکَ﴾ تجھ ہی سے امید رکھ کر اور تجھ ہی سے ڈر کر﴿لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجیٰ مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ﴾ تیرے عذاب سے بچنے کے لئے پناہ نہیں حاصل ہوسکتی مگر تیری ہی طرف۔یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی پکڑ سے اگر کوئی بچنا چاہے تو اللہ تعالیٰ ہی بچا سکتے ہیں اورکوئی نہیں بچا سکتا﴿اٰمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ أَنْزَلْتَ وَنَبِیِّکَ الَّذِیْ أَرْسَلْتَ﴾ اے اللہ!مَیں تیری اس کتاب پر ایمان لے آیا جو تو نے اپنے نبی پر اتاری اور تیرے نبی پر بھی ایمان لایا جن کو تو نے نبی بنا کر بھیجا۔

فرماتے ہیں کہ اس دعا کو پڑھنے کے بعد اگر آپ سو گئے اور اسی میں انتقال ہوگیا تو ایمان کے اوپر مروگے۔اور اگر صبح کروگے تو بھلائی کو پہنچ جاؤ گے۔چونکہ اس دعا میں بھی توکل کا سبق دیا گیا ہے اس لئے یہاں لائے ہیں۔

دیکھئے!مختلف مقامات پر مختلف انداز سے نبی کریم ﷺ اپنی امت کو یہ بتلاتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر اعتماد کس طرح کرنا چاہیے،اورآدمی کس طرح اپنے ہر معاملہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حوالے کرسکتا ہے۔

﴿سفر ہجرت کا ایک واقعہ﴾

عن أبی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ عبداللہ بن عثمان بن عامر بن عمر بن کعب بن سعد بن تیم بن مرۃ بن کعب بن لؤی بن غالب القرشی التیمی وھو وأبوہ وأمہ صحابة رضی اللہ عنہم قال: نَظَرْتُ اِلیٰ أَقْدَامِ الْمُشْرِکِیْنَ وَنَحْنُ فِی الْغَارِ وَهُمْ عَلیٰ رُءُوْسِنَا،فَقُلْتُ:یَارَسُوْلَ اللهِ لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ نَظَرَ تَحْتَ قَدَمَیْهِ لَأَبْصَرَنَا. فقال:مَاظَنُّکَ یَاأَبَابَکْرٍ بِاثْنَیْنِ،اللهُ ثَالِثُهُمَا.

یہ روایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ ہے،اوران کے والد بزرگوار کا نام عثمان ہے،کنیت ابوقحافہ تھی،اور بنوتیم سے ان کا تعلق ہے، جو قریش ہی کی ایک شاخ ہے،اس لئے ان کو تیمی کہتے ہیں۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ بھی،ان کے والد بھی،ان کی والدہ بھی اوران کی اولاد بھی سب مسلمان تھے،اللہ تعالیٰ نے سب کو اسلام کی دولت سے مالا مال فرمایا تھا اور سب صحابی تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سفر ہجرت کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے لئے جب مکہ مکرمہ سے روانہ ہونے والے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ہجرت کی اجازت ملی،حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچادیا کہ آپ ہجرت کے لئے نکل سکتے ہیں لہٰذا روانہ ہوجایئے،تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے ہجرت کی اجازت دے دی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے درخواست کی: یارسول اللہ! مَیں اس سفر ہجرت میں آپ کی رفاقت کی تمنا رکھتا ہوں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی لئے تو مَیں نے آپ کو اطلاع بھی کی پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مَیں نے پہلے سے اس سفر کیلئے دو اونٹنیاں خرید کر پال پوس کر تیار کررکھی ہیں؛ ان میں سے ایک آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ مفت میں نہیں بلکہ قیمتاً لیتا ہوں۔اس کے بعد یہ دونوں وہاں سے روانہ ہوئے۔

چونکہ یہ بات تو یقینی تھی کہ جب مشرکین کو پتہ چلے گا کہ یہ حضرات مکہ مکرمہ سے روانہ ہوچکے ہیں تو وہ ان کا پیچھا کریں گے،ان کو ڈھونڈیں گے،ان کے درپئے آزار ہوں

گے، اس لئے ضروری تھا کہ روانگی کے فوراً بعد سفر جاری نہ رکھا جائے، بلکہ کچھ زمانہ تک روپوش رہیں؛ یہاں تک کہ مشرکین کی طلب وجستجو کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ اور وہ لوگ تھک ہار کر مایوس ہو کر جب بیٹھ جائیں اس کے بعد پھر یہ حضرات اپنا سفر شروع کریں۔ چنانچہ اسی کے پیشِ نظر یہ حضرات مکان سے نکلنے کے بعد مکہ مکرمہ سے باہر ''ثور'' نامی ایک پہاڑ کے غار میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: آپ ٹھہریئے، پہلے مَیں اندر داخل ہوتا ہوں؛ تاکہ جگہ ٹھیک اور صاف کرلوں۔ چنانچہ اندر جا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کو صاف کیا، اور زہریلے جانوروں کے جو سوراخ تھے ان کو بھی بند کر دیا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوراخ باقی رہ گیا اور اس کو بند کرنے کے لئے کوئی کپڑا نہیں تھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے پاؤں کا انگوٹھا اس کے اوپر رکھ دیا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دی کہ آپ تشریف لایئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لائے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ران پر سر رکھ کر سو گئے۔ چونکہ چل کر آئے تھے، تھکے ہوئے تھے، اس لئے آنکھ لگ گئی۔

اِدھر مشرکین کو جب پتہ چلا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہو گئے ہیں تو وہ آپ کی جستجو اور تلاش میں نکلے، انہوں نے اپنے ساتھ ایک آدمی بھی لیا کہ جو نشانِ قدم دیکھ کر پہچان لے کہ یہ لوگ کہاں گئے ہیں، جس کو عرّاف کہا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ نشانِ قدم دیکھتے دیکھتے آگے بڑھے اور اسی پہاڑ کے پاس پہنچے۔ اس عرّاف نے وہاں نشانِ قدم دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قدموں کو بتلا دیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے متعلق بتلایا کہ یہ نشان وہی ہیں جو مقامِ ابراہیم کے اوپر ہیں۔

مقامِ ابراہیم پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقشِ قدم ہیں، گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشِ پا

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے نقشِ پا سے ملتا جلتا تھا۔ ویسے نبی کریم ﷺ کی شکل وشباہت بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملتی جلتی تھی۔

وہ اور آگے بڑھے لیکن پھر قدموں کے نشان نظر نہیں آئے۔ اِدھر ان حضرات کے غار میں تشریف لے جانے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت کا یہ انتظام ہوا کہ اس غار کے منہ پر ایک کبوتری نے آکر اپنا گھونسلہ بنالیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک مکڑی نے بھی اس کے اوپر ایک جالا تان دیا۔ جب یہ لوگ وہاں آئے اور دیکھا کہ ایک پرندے کا گھونسلہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ مکڑی نے جالا بھی باندھ رکھا ہے، اگر کچھ لوگ اندر گئے ہوئے ہوتے تو یہ صورت نہ ہوتی اور غار کا منہ اس طرح بند نہ ہوتا۔ اب وہ لوگ وہیں غار کے منہ پر کھڑے ہوکر یہ باتیں کررہے ہیں اور غار نیچا تھا یعنی اس طرح سے کہ آدمی کھڑا ہو تو اندر جانے کے لئے سیدھا راستہ نہیں تھا بلکہ نیچے اترنا پڑتا تھا۔ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں غار میں سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے، وہ لوگ اِن حضرات کو غار میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے نہیں دیکھ پاتے تھے، وہ تو صرف غار کے منہ پر کبوتری نے جو گھونسلہ بنا رکھا تھا اور مکڑی نے جالا تان رکھا تھا اس پر بحث کررہے تھے۔ اندر کیا ہے وہ ان کو اندھیرے کی وجہ سے معلوم نہیں تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے مشرکین کے قدم اور پاؤں غار کے اندر سے دیکھے اور ہم لوگ غار میں تھے اور وہ لوگ بالکل ہمارے سروں پر غار کے دروازہ پر کھڑے تھے، اس لئے مَیں نے اس موقعہ پر اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ سے یہ عرض کیا: ﴿لَوْ اَنَّ اَحَدَهُمْ نَظَرَ تَحْتَ قَدَمَيْهِ لَاَبْصَرَنَا﴾ یارسول اللہ! یہ لوگ اس انداز سے کھڑے ہیں کہ ان میں کا کوئی بھی اگر اپنے پاؤں کی طرف دیکھے گا تو ہم اس کو نظر آجائیں

گے۔ گویا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ہم ان کی نگاہوں میں نہ آجائیں اور پکڑے نہ جائیں۔

اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطمینان دلاتے ہوئے جو ارشاد فرمایا؛ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ عالی پر توکل واعتماد کو ظاہر کرتا ہے اسی لئے اس روایت کو یہاں لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿مَاظَنُّکَ یَاأَبَابَکْرٍ بِاثْنَیْنِ، اللهُ ثَالِثُهُمَا﴾ اے ابوبکر! تمہارا ان دو آدمیوں کے متعلق کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ تعالیٰ ہو؟ یعنی جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت ومدد شاملِ حال ہو، ان کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے؟ کیا وہ دشمن کے ہاتھوں پکڑے جائیں گے؟ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے وثوق واعتماد اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے اوپر پورے توکل کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا۔ اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے توکل کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

﴿ایک معجزہ﴾

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کہیں یہ لوگ یہاں سے داخل ہوگئے تو؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم اِدھر سے نکل جائیں گے، آپ نے ایک طرف اشارہ فرمایا، اس وقت وہاں کچھ نہیں تھا، آپ کے اشارہ کرتے ہی اس دوسری طرف سے پہاڑ کا پورا حصہ ایک دم اس طرح کھل گیا کہ اگر آدمی وہاں سے نکلنا چاہے تو آسانی سے نکل جائے۔

﴿جب ساری تدابیر بے کار نظر آنے لگیں﴾

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جب آدمی اپنی ساری تدبیروں کی طرف سے مایوس

ہوجائے ایسے موقعہ پر بھی آدمی کو چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے اوپر اعتماد وتوکل کا سلسلہ قائم رکھے۔ اگر یہ سلسلہ قائم رہے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے راہیں کھولی جائیں گی ﴿وَمَن يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُه﴾ جو آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوپر بھروسہ کرتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہوجاتا ہے اور ہر مشکل دور کردیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ موقعہ ایسا ہی تھا کہ یہاں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی تھی۔

﴿ گھر سے باہر نکلتے وقت حضور ﷺ کیا دعا مانگتے تھے ﴾

عن أم المؤمنين أم سلمة واسمها هند بنت أبی أمية حذيفة المخزومية رضی اللہ عنها ان النبی ﷺ كَانَ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ قَالَ: بِسْمِ اللهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ. اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُبِکَ أَنْ أَضِلَّ أَوْأُضَلَّ أَوْأَزِلَّ أَوْأُزَلَّ أَوْأَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ أَوْأَجْهَلَ أَوْيُجْهَلَ عَلَیَّ.

حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا اسم گرامی ہند بنت ابی امیہ تھا، ان کے والد کا نام حذیفہ اور کنیت ابوامیہ تھی، اور خود ان کی کنیت ام سلمہ تھی، قبیلۂ بنومخزوم سے تعلق رکھتی ہیں وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب اپنے گھر سے باہر نکلتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔ اس دعا میں بھی نبی کریم ﷺ نے امت کو توکل کا سبق سکھایا ہے جیسا کہ مَیں نے عرض کیا تھا کہ ہر موقعہ پر نبی کریم ﷺ اپنی دعاؤں میں بھی اور دوسری تعلیمات میں بھی وہ ساری چیزیں بتلاتے ہیں؛ جو مطلوب ہیں اور جن صفات سے امتیوں کو اور بندوں کو آراستہ کرنا پیشِ نظر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ پڑھتے تھے: ﴿بِسْمِ اللهِ﴾ اللہ کے نام سے مَیں نکل رہا ہوں ﴿تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوپر مَیں نے بھروسہ کیا۔

اس دعا میں بھی نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کا اظہار کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عام طور پر آدمی اپنے آپ کو اپنے گھر میں محفوظ سمجھتا ہے، لیکن گھر سے باہر نکلنے

کے بعد کیا حالات پیش آنے والے ہیں؛ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ ان حالات کے اندر اگر آدمی کے لئے کوئی سہارا ہوسکتا ہے تو وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہی پر توکل واعتماد ہے، جو کارآمد ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے یہ سکھایا۔ اس لئے کم سے کم اتنا تو ضرور پڑھ لے۔ آگے مزید دعا تو آ ہی رہی ہے۔

بعض روایتوں میں اتنی مختصر دعا بھی آئی ہے اس لئے جب بھی گھر سے نکلے ﴿بِسْمِ اللهِ تَوَكَّلْتُ عَلىٰ اللهِ، لاَحَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ اِلَّابِاللهِ﴾ پڑھ لیا کرے، ان شاء اللہ تمام چیزوں سے حفاظت ہوجائے گی۔

آگے حضور ﷺ یہ دعا پڑھتے تھے: ﴿أَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُبِکَ أَنْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ﴾ اے اللہ! مَیں تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ مَیں گمراہی میں مبتلا ہوؤں، یا گمراہ کیا جاؤں یعنی مَیں خود گمراہ ہوؤں یا کوئی مجھے گمراہ کرے ان دونوں باتوں سے مَیں تیری پناہ چاہتا ہوں ﴿اَوْاَزِلَّ اَوْاُزَلَّ﴾ یا مَیں لغزش کروں یا مجھے لغزش میں ڈالا جائے ﴿أَوْأَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ﴾ یا مَیں کسی پر ظلم وزیادتی کروں یا میرے اوپر ظلم وزیادتی کی جائے ﴿أَوْأَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ﴾ یا مَیں کسی کے ساتھ جہالت اور بدتمیزی سے پیش آؤں، یا میرے ساتھ جہالت اور بدتمیزی کا سلوک کیا جائے۔

چونکہ عام طور پر گھر سے نکلنے کے بعد یہ صورتیں پیش آسکتی تھیں اس لئے خاص طور پر ان چار چیزوں کا تذکرہ کیا گیا۔ ویسے باقی تمام امور کے سلسلے میں جامع چیز فرمائی تھی ﴿تَوَكَّلْتُ عَلىٰ اللهِ﴾

یہ روایت لاکر بھی یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ نے اپنی اس مبارک دعا کے ذریعہ سے بھی امت کو توکل کی تعلیم دی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر توکل کرو۔

﴿توکل کی بدولت ہدایت کفایت اور حفاظت کا وعدہ﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ قَالَ یَعْنِیْ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَیْتِہٖ: بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ لاحَوْلَ وَلاَ قُوَّۃَ اِلاَّ بِاللّٰہِ یُقَالُ لَہٗ: ھُدِیْتَ وَکُفِیْتَ وَوُقِیْتَ وَتَنَحّٰی عَنْہُ الشَّیْطَان. وزادابوداؤد. فیقول یعنی اَلشَّیْطَانُ لِشَّیْطَانٍ آخَرَ: کَیْفَ لَکَ بِرَجُلٍ قَدْ ھُدِیَ وَکُفِیَ وَوُقِیَ؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کوئی آدمی اپنے گھر سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھے: ﴿بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ لاحَوْلَ وَلاَ قُوَّۃَ اِلاَّ بِاللّٰہِ﴾ تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جاتا ہے ﴿ھُدِیْتَ﴾ تجھے راہِ راست دکھا دی گئی ﴿وَکُفِیْتَ﴾ اور تیرے کام میں تیری کفایت کردی گئی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرے کاموں کی ذمہ داری لے لی گئی ﴿وَوُقِیْتَ﴾ اور تیری حفاظت کردی گئی۔ گویا تین چیزوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو وعدہ اور بشارت سنائی گئی کہ راہِ راست بھی تجھے دکھا دیا گیا، تیرے تمام کاموں میں تیرے لئے کفایت بھی کردی گئی، اور تیری حفاظت بھی کی گئی ﴿وَتَنَحّٰی عَنْہُ الشَّیْطَان﴾ اور یہ دعا جب پڑھ لیتا ہے تو اب شیطان بھی اس کے گمراہ کرنے کی تدبیر نہیں کرتا وہ بھی بھاگ جاتا ہے کہ اب میرا کوئی داؤ اس کے اوپر چلنے والا نہیں ہے۔

چنانچہ ابوداؤد شریف کی ایک روایت میں یہ زیادتی موجود ہے کہ جب یہ دعا پڑھ لیتا ہے تو چونکہ ہر آدمی کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے جو گمراہ کرنے کی تدبیریں اور کوششیں کرتا رہتا ہے، لہٰذا ایک شیطان اس دوسرے شیطان سے جو اس کے پیچھے لگا ہوا ہے؛ اس کی تسلی کے طور پر یہ کہتا ہے: ﴿کَیْفَ لَکَ بِرَجُلٍ قَدْ ھُدِیَ وَکُفِیَ وَوُقِیَ؟﴾ تو کیسے راہِ راست

سے ہٹا سکتا ہے اس آدمی کو جس کی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رہنمائی کردی گئی اور اس کے کاموں کی کفالت لے لی گئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا وعدہ دے دیا گیا۔ یعنی اب تیرا داؤ اس پر نہیں چل سکتا ہے، لہٰذا اگر تیری تدبیر ناکام ہوجائے؛ تو اس پر پریشان مت ہونا۔ اس دعا میں بھی نبی کریم ﷺ نے امت کو توکل کی تعلیم دی ہے، لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس دعا کا اہتمام کریں۔

﴿ہم خرما وہم ثواب﴾

اور دیکھو! اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے تین تین وعدے کئے گئے ہیں۔ ویسے بھی ہم جن ارادوں اور عزائم اور جن کاموں کو لے کر نکلتے ہیں، ان کے متعلق ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں کوئی اطمینان مل جائے کہ ہم جس کام کے لئے نکل رہے ہیں؛ وہ ہوجائے گا۔ لہٰذا ﴿کُفِیْتَ﴾ کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی کفالت وذمہ داری لے لی گئی ہے، اس لئے جس مقصد کے لئے نکل رہے ہو، وہ ان شاء اللہ پورا کردیا جائے گا۔ تو یہ دعا پڑھنے کی وجہ سے جہاں حفاظت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہِ راست دکھلائی جاتی ہے؛ وہیں تمام کاموں کی ذمہ داری بھی لے لی جاتی ہے۔ یہ تو گویا ''ہم خرما وہم ثواب'' جیسا معاملہ ہوجائے گا۔ نبی کریم ﷺ کی تعلیم پر عمل بھی ہوجائے گا دعا کی دعا بھی ہوجائے گی اور ساتھ ہی ساتھ تمام کام بھی بن جائیں گے۔

﴿دو بھائیوں کا قصہ﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ اَخَوَانِ عَلٰى عَهْدِالنَّبِيِّ ﷺ، وَكَانَ أَحَدُهُمَا يَأْتِى النَّبِيَّ ﷺ، وَالْاٰخَرُ يَحْتَرِفُ. فَشَكَا الْمُحْتَرِفُ أَخَاهُ لِلنَّبِيِّ ﷺ. فَقَالَ: لَعَلَّكَ تُرْزَقُ بِهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں دو بھائی تھے، ان میں سے ایک نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آتا تھا اور دوسرا کاروبار کرتا تھا۔ پہلا کاروبار میں نہیں لگا تھا، بلکہ علم کی تحصیل میں مشغول رہنے کی وجہ سے اس کو کاروبار کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جو آدمی کاروبار کرتا ہے اس کو یہ غرہ وزعم ہوتا ہے کہ مَیں کما کر اس کو کھلا پلا رہا ہوں، یہاں پر بھی کاروبار کرنے والے بھائی نے نبی کریم ﷺ سے دوسرے بھائی کی شکایت کی کہ یارسول اللہ! یہ تو بالکل مفت خورہ ہے، مفت کی روٹیاں توڑتا رہتا ہے، مَیں کاروبار اور سب کام کرتا ہوں، یہ تو بس آپ کے پاس ہی بیٹھا رہتا ہے۔ حالانکہ اس اللہ کے بندے کو یہ خیال نہیں آیا کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری دینا اور علم حاصل کرنا؛ یہ بھی تو ایک وہ کام ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے امت کو مکلّف ومأمور بنایا ہے یہ بھی ضروری ہے۔ بلکہ اپنی روزی روٹی کی فکر کرنا اتنا ضروری نہیں؛ جتنا یہ ضروری ہے۔ اس لئے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد اور امت کی ذمہ داری ہی یہ ہے۔

وہ بھائی جو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتا تھا اور آپ سے تعلیمات حاصل کرتا تھا وہ تو گویا اپنے مقصدِ تخلیق میں آگے بڑھ رہا تھا، اور اس ذمہ داری کو پورا کر رہا تھا، اور فرضِ کفایہ ادا کر رہا تھا، لیکن کاروبار کرنے والا یہ سمجھ رہا تھا کہ مَیں اس کو پال رہا ہوں اور یہ کچھ نہیں کر رہا ہے۔

حضور ﷺ نے اس کاروبار والے بھائی سے کہا: ﴿لَعَلَّکَ تُرْزَقُ بِہٖ﴾ آپ اس غرے میں نہ رہیے کہ آپ کما کر اِس کو کھلا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تم کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس کی وجہ سے روزی دی جارہی ہو۔ دیکھنے کو تو آپ یوں سمجھ رہے ہیں کہ آپ کما رہے

ہیں اور آپ کھلا رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں معاملہ اُلٹا ہے۔

دیکھئے! یہ شریعت کی تعلیم ہے۔ دنیا والوں کی نگاہ کیا دیکھتی ہے، اور شریعت کیا تعلیم دیتی ہے۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ کما رہا ہے اور وہ مفت میں کھا رہا ہے۔ اور شریعت یہ بتلاتی ہے اور نبی کریم ﷺ ہم کو یہ خبر دے رہے ہیں کہ نہیں! وہ اِس کو کھلا رہا ہے، اُس کی وجہ سے اِس کو بھی روزی مل رہی ہے۔ گویا جو کاروبار کر رہا ہے، اور اس کے کاروبار میں جو برکت ہوئی اور منافع حاصل ہوا؛ وہ اس لئے کہ یہ اُس کی ذمہ داری لئے ہوئے ہے۔ اگر اس سے ہٹ جائے گا، تو اس کا کام بھی فیل ہو جائے گا۔

روزی میں پریشانی آنے کا ایک گہرا سبب

آج کل عام طور پر لوگ اپنی پریشانیوں کی شکایتیں کرنے آتے ہیں اور روزی کے معاملہ میں تو بہت ہی زیادہ شکایتیں ہوتی ہیں۔ تو روزی کے معاملہ میں جو پریشانیاں ہوتی ہیں؛ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب ایک بھائی کاروبار میں لگا ہوا ہو، اور دوسرا بھائی پڑھنے پڑھانے میں لگا ہوا ہو، تو ہمارے سماج میں یہ ہوتا ہے کہ کاروبار والے بھائی کی بیوی یہ سمجھتی ہے کہ ہمارے میاں ہی سب بوجھ اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں۔ اب اس کی بیوی اس کا ذہن بگاڑتی ہے کہ آپ ہی سب کرتے ہیں، فلاں بھائی تو بیٹھے بیٹھے کھاتا ہے، صرف تبلیغ ہی میں جاتا رہتا ہے، وہ تو مدرسہ میں بیٹھ کر پڑھاتا ہے، اور امامت کراتا ہے، کمانے کا کام تو آپ ہی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی یوں سمجھنے لگتا ہے کہ اچھا! مَیں اکیلا ہی کیوں کام کروں، مَیں ہی علیٰحدہ ہو جاتا ہوں، پھر ذرا دیکھیں، یہ کیسے کما لیتا ہے؟ لہٰذا وہ تو یہ دکھلانے کیلئے – کہ یہ

کیسے کھاتے ہیں- الگ ہوجاتا ہے، لیکن بعد میں جب اس کو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں، تو پھر باتیں ہوتی ہیں کہ پہلے کاروبار میں جو برکت تھی؛ وہ نہیں رہی۔ کاروبار خراب ہوتا جارہا ہے، گاہکی ٹوٹ رہی ہے، حالات بدل رہے ہیں۔ اب اس کی نظر تو اِدھر ہے، لیکن اصل جو خرابی اس نے اختیار کی تھی، اور جس کی وجہ سے یہ گڑبڑ ہے؛ اُدھر تو دھیان ہی نہیں جاتا ہے۔

﴿تاجروں کی خدمت میں ایک قیمتی مشورہ﴾

ابھی مَیں ایک مدرسہ کے جلسہ میں ساؤتھ افریقہ گیا تھا، چونکہ وہاں کاروبار اور تجارت کا سلسلہ ہے، تو جو طلبہ فارغ ہوئے، ان کے اولیاء ماں باپ وغیرہ سے مَیں نے ایک بات کہی کہ آپ نے اپنے بچے کو دین کا علم پڑھنے کے واسطے فارغ کردیا تھا، گویا آپ نے اس کو اللہ کے واسطے الگ کردیا۔ لہٰذا اب یہ تعلیم حاصل کرکے جب فارغ ہوا، تو اس کو آپ اپنے کاروبار میں جوئنٹ (Joint) نہ کیجیے، بلکہ آپ اس کو فارغ ہی رکھیے تاکہ اس کا یہ پڑھنے پڑھانے کا، تعلیم وتبلیغ کا سلسلہ جاری رہے۔ اب رہا اس کے کھانے پینے کا انتظام؟ تو مَیں نے کہا: ویسے بھی آج کل تجارت کے اندر سلیپنگ پارٹنر (Sleeping Partner) ہوتا ہے کہ وہ کام نہیں کرتا لیکن اس کا حصہ ہوتا ہے۔ آپ بھی اپنے اس بیٹے کو اپنی تجارت میں سلیپنگ پارٹنر کے طور پر رکھ لیجیے، کہ آپ کمائیں گے اور یہ کھاتا پیتا رہے گا اور چونکہ اس کے دینی مشاغل میں لگنے میں آپ کی محنت کو بھی دخل ہے، آپ کو بھی ان مشاغل کا پورا پورا اجر ملے گا۔ لیکن یوں نہ سمجھنا کہ آپ لوگ اس کو کھلا رہے ہیں، بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ کے اس فیصلہ کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ آپ کی تجارت میں برکت دے، اور پھر اس کی وجہ سے آپ کو روزی ملے، جیسا کہ یہاں حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿لَعَلَّکَ تُرْزَقُ بِهٖ﴾

یہاں تو "لَعَلَّکَ" فرمایا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ شاید تم کو اس کی وجہ سے روزی مل رہی ہو۔ ایک دوسری روایت میں "لعل" نہیں ہے بلکہ یقین کے ساتھ آپ نے فرمایا: ﴿اِنَّکُمْ تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَآئِکُمْ﴾ کہ تم لوگوں کو روزی تمہارے کمزوروں کی وجہ سے ملتی ہے۔

﴿ آپ کے پاس اوروں کی روزی بھی ہے ﴾

آج کل ہمارے سماج ومعاشرے میں ایک زہر ہے کہ کمزوروں کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مفت خورے ہیں، بیٹھے بیٹھے کھاتے ہیں، ہمارے خاندان اور گھر والوں کے اوپر بوجھ ہیں۔ لیکن یہاں نبی کریم ﷺ ہمیں یہ فرما رہے ہیں کہ یہ بوجھ نہیں ہیں، بلکہ ان کی وجہ سے تمہیں روزی مل رہی ہے۔ آدمی کو جو کچھ مل رہا ہے، وہ یہ نہ سمجھے کہ میری ہی روزی مجھے مل رہی ہے، بلکہ اور لوگوں کی بھی مل رہی ہے۔ آپ کو تو دس لاکھ مل رہے ہیں، اور آپ کی ضرورت ایک لاکھ میں پوری ہو رہی ہے، تو یہ نو لاکھ کا ہے کے ملے؟ یہ نو لاکھ کے بارے میں یوں نہ سمجھنا کہ آپ کے ملے ہیں۔ یہ نو لاکھ جو زائد ملے ہیں، وہ دوسروں کے ملے ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان نو لاکھ کو اُن ہی لوگوں پر خرچ کئے جائیں؛ جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے دئے ہیں۔

اللّٰہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق نصیب فرمائے

استقامت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً.أمابعد:—

فأعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

فَاسْتَقِمْ کَمَااُمِرْتَ (ھود.۱۱۲)

وقال تعالیٰ:اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْارَبُّنَااللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْاتَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَن لَّاتَخَافُوْاوَلَاتَحْزَنُوْاوَاَبْشِرُوْابِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیَآؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَاوَفِی الْاٰخِرَۃِوَلَکُمْ فِیْھَامَاتَشْتَھِیْ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَامَاتَدَّعُوْنَ.نُزُلاًمِنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ.

(فصلت.۳۰،۳۱،۳۲)

وقال تعالیٰ:اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْارَبُّنَااللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ اُوْلٰئِکَ اَصْحَابُ الْجَنَّۃِ خَالِدِیْنَ فِیْھَا جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ. (الأحقاف.۱۳،۱۴)

استقامت کی وضاحت

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ باب قائم فرمارہے ہیں ’’باب الاستقامۃ ‘‘استقامت عربی لفظ ہے، جو قیام سے بنا ہے، جس کا ہم اردو میں ترجمہ کرتے ہیں: کسی چیز پر قائم ہونا اور مضبوطی کے ساتھ اس پر جم جانا۔

شریعت کی اصطلاح میں استقامت اس کو کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جس دین اسلام کو لے کر آئے ہیں؛ اس دین پر عقیدے، عمل اور قول کے اعتبار سے پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا۔

اور کبھی کبھار استقامت کا لفظ میانہ روی یعنی درمیانی راہ اختیار کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے یعنی ایسا طریقہ اختیار کرنا کہ جس میں نہ تو افراط ہو کہ آدمی حد سے آگے بڑھے، اور نہ تفریط ہو کہ اس میں کوتاہی کرے؛ بلکہ میانہ روی سے کام لے۔

صراطِ مستقیم کو صراطِ مستقیم اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ درمیانی راستہ ہے۔ نہ اس میں افراط ہے، نہ تفریط۔ نہ حد سے آگے بڑھنا ہے، نہ کمی کوتاہی ہے۔

﴿استقامت بنیاد اور اصل ہے﴾

استقامت کی خاص اہمیت بتلانے کے لئے انہوں نے قرآنِ پاک کی تین آیتیں پیش فرمائی ہیں اور بھی آیتوں میں استقامت کا تذکرہ موجود ہے۔ استقامت ہی سارے دین کی بنیاد اور اصل ہے، اس لئے کہ کوئی دنیوی معاملہ ہو یا اخروی، جب تک کہ آدمی استقامت سے کام نہ لے؛ تب تک وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

ایک آدمی دنیا میں اگر کوئی ذریعۂ معاش اختیار کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً اس نے نجاری اور ستھاری کا پیشہ اختیار کیا، لیکن شروع کرنے کے بعد ابھی تو چند ہی روز ہوئے تھے، مہینہ دو مہینہ ہوئے تھے، نہ تو پورے طور پر اس کو تجربہ ہوا، نہ مہارت ہوئی اور نہ تو اس راہ کے نشیب وفراز سے کوئی واقفیت ہوئی، اس سے پہلے ہی یہ سوچ کر کہ اس میں تو کوئی زیادہ آمدنی معلوم نہیں ہوتی، کچھ کامیابی نہیں ملتی؛ اس نے اس پیشے کو چھوڑ دیا۔ اور آہن گری اور لوہاری کا پیشہ اختیار کرلیا اور اس کو ذریعۂ معاش کے طور پر شروع کیا، وہاں بھی یہی حال ہوا دو چار مہینے ہوئے تھے، نہ تو اس کو کوئی تجربہ ہوا، اور نہ مہارت کی نوبت آئی، اور نہ اس کے پورے حالات سے واقفیت ہوئی، اور اس میں بھی یہ سوچ کر کہ اس میں بھی کوئی زیادہ دم خم نظر نہیں آتا، کچھ

آمدنی بھی نہیں ہے، اس پیشے کو بھی چھوڑ دیا، اور کوئی تیسرا پیشہ اختیار کرلیا۔

مطلب یہ ہے کہ وہ دو چار مہینے تک کسی ایک پیشے کو اختیار کر کے اس میں کامیابی نظر نہ آنے پر اس کو چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار کرتا ہے۔ تو آپ ہی بتایئے کہ یہ آدمی پوری زندگی اس طرح کسی بھی ذریعۂ معاش میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے؟ نہیں کرسکتا۔ اور وہ جو چاہتا ہے کہ اچھے طریقہ سے ذریعۂ معاش پر اس کو قابو حاصل ہو اور ایسا ذریعۂ معاش اس کو میسر ہو، جس سے ساری ضروریات کی کفالت ہو جائے، اور اس کے نتیجہ میں اس کو اطمینان وسکون حاصل ہو، اگر ساری زندگی بھی اس طرح پیشے ادلتا بدلتا رہے گا؛ تو یہ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک ہی پیشے کو ایک طویل زمانے تک کرتا رہے تاکہ اس پیشے کے نشیب وفراز سے واقفیت ہو، تجربہ ہو، مہارت ہو، اور لوگوں کو بھی ان کے اس تجربے اور مہارت سے کچھ اطمینان حاصل ہو۔ پھر لوگ بھی اس سے اس پیشے کے سلسلے میں کچھ مدد حاصل کریں گے، اور اس سے اپنے کام کروائیں گے، اور کئی سالوں کے بعد ایک وقت آئے گا کہ وہ اس پیشے پر قابو پا کر اور اس کو اپنے ذریعۂ معاش کے طور پر طے کر کے ایسی کامیابی حاصل کرے گا کہ وہ اس لائن کا ماہر سمجھا جائے گا، اور پھر کہا جائے گا اور لوگوں میں بھی یہ بات معروف ومشہور ہو جائے گی کہ اس کام کے سلسلے میں اگر آپ کو رابطہ قائم کرنا ہے تو فلاں صاحب سے، فلاں کمپنی سے رابطہ قائم کیجئے؛ ان کا سالہا سال کا تجربہ ہے، اور اس سلسلے میں ان کا کام سو فیصد ایسا ہے کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔

ایک ساکھ قائم ہوگئی

دیکھو! یہ چیز کاہے سے حاصل ہوئی؟ مضبوطی کے ساتھ، پورے عزم وارادے اور

قوت کے ساتھ ایک پیشے کے اوپر جمنے سے یہ بات حاصل ہوئی۔اس میں جوں جوں زمانہ گذرتا ہے،تو ظاہر ہے کہ حالات آتے ہیں، ناکامیابی بھی آتی ہے؛لیکن اس ناکامی سے ڈر کراُس نے اس کو چھوڑا نہیں، بلکہ اس راستہ کی جتنی بھی مشکلات اور دشواریاں تھیں،ان سب کو خوب اچھی طرح برداشت کرتا رہا اور اس سلسلے میں جو مختلف تجربے حاصل ہو سکتے تھے ان تجربوں کو عملی جامہ پہناتا رہا،تب جا کر سالہا سال کے بعد اس کو یہ مقام حاصل ہوا اور اس لائن میں اس کو وہ حیثیت حاصل ہوئی،جس کو آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ساکھ قائم ہوگئی۔ یہ کاہے سے ہوا؟ استقامت کے نتیجہ میں ہوا۔وہ ایک چیز پر جم گیا،اور ڈر کر،گھبرا کر اور مایوس ہوکر اس نے اس کو چھوڑا نہیں۔

معلوم ہوا کہ دنیوی اعتبار سے بھی آدمی اگر کسی چیز میں کامیابی حاصل کرنا چاہے؛تو استقامت ضروری ہے۔یعنی کسی چیز کے اوپر بہت پختگی سے جمنا،اور مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم ہونا؛ یہ لازم ہے۔جب تک کہ یہ بات حاصل نہیں ہوگی؛تب تک کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔یہی حال دین کے امور کا بھی ہے۔

پہلے بہت ساری روایات گذریں۔اخلاص کے متعلق کچھ باتیں،توبہ اور صبر سے متعلق کچھ چیزیں،صدق،مراقبہ،تقویٰ اور یقین وتوکل سے متعلق بھی بہت ساری تفصیلات بتلائیں؛ یہ جتنے بھی اوصاف اور کمالات کا پچھلے ابواب میں تذکرہ ہوا اور آئندہ جن کا ذکر آئے گا؛ان تمام چیزوں میں جب تک کہ آدمی کو استقامت حاصل نہ ہو،مضبوطی،اولوالعزمی اور ارادے کی پختگی کے ساتھ ان چیزوں پر جما نہ رہے گا؛تب تک وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

استقامت کی کرامت

ایک آدمی ہے دو چار دن، مہینے دو مہینے کے واسطے بہت بڑا بزرگ بن گیا، تقویٰ حاصل کرلیا، بہت کچھ عبادات کرنے لگا، اپنے آپ کو گناہوں سے بہت زیادہ بچانے لگا، ہر چیز میں بہت زیادہ پابندی کرنے لگا؛ لیکن دو تین مہینہ کے بعد پھر وہی پرانی ڈگر پر چلنے لگا تو کیا یہ تقویٰ، بزرگی اور عبادات اس کو کام دے گی؟ نہیں! بالکل کام نہیں دے گی۔

دیکھئے! آپ اور ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ ندی میں ریت ہوتی ہے، چھوٹے چھوٹے پتھر بھی ہوتے ہیں۔ یہ کہاں سے آتے ہیں؟ پہاڑ پر سے بہہ کر آتے ہیں۔ یہ پانی ہی ہے جو ایک زمانہ تک مسلسل بہہ بہہ کر پہاڑ کی ان چٹانوں کو توڑ توڑ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی اور ریت کی شکل میں بدل دیا کرتا ہے۔ تو پانی جیسی نرم چیز جب ایک طویل زمانہ تک پہاڑ کی چٹانوں پر مسلسل گرتی رہتی ہے، تو اس کے نتیجہ میں پہاڑ کی چٹان بھی ٹوٹ کر پتھر کے ٹکڑوں کی اور ریت کی شکل میں بدل جاتی ہے۔ آخر یہ کاہے سے ہوتا ہے؟ ایک زمانہ تک کی استقامت یعنی ایک چیز اور ایک نہج پر قائم رہنے سے ہوتا ہے۔ دینی معاملہ میں بھی استقامت اسے ہی کہتے ہیں کہ آدمی اپنے ایمان پر اور عقائد سے تعلق رکھنے والی تمام چیزوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔

خدائی امتحان میں کامیابی کا راز

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایمان کی بھی آزمائش ہوتی ہے۔ ایک آدمی جب دعویٰ کرتا ہے کہ میں ایمان لایا اور ایمانیات کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان ساری چیزوں کو وہ تسلیم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کو اکیلا و یکتا مانتا ہے، ساری صفات میں بھی اس کو

تنہا مانتا ہے، اور جتنی چیزیں وجود میں آتی ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرتا ہے، ایمانیات سے متعلق جتنے بھی امور ہیں، اس سب پر دل سے راضی ہے؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی آزمائش بھی ہوگی۔ اس لئے کہ جب تک آزمائش نہ ہو، اس وقت تک کون مخلص ہے اور کون منافق ہے؛ اس کا کہاں پتہ چلتا ہے؟ اگر خالی دعوے ہی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نواز دیا جاتا، تو اس صورت میں معاملہ آسان تھا۔

انبیاء کرام علیہم السلام اور ان میں بھی سید الانبیاء حضور اکرم ﷺ کو کتنا ستایا گیا۔ خود نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: مجھے ایسا آزمایا گیا اور ایسا مصائب میں ڈالا گیا کہ کسی اور کو ایسے مصائب میں آزمایا نہیں گیا: ﴿أَشَدُّ النَّاسِ بَلَآءً الأنبياءُ ثُمَّ الأمثلُ فالأمثلُ (الترمذی، ۲۳۹۸)﴾ سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کرام علیہم السلام کی ہوتی ہے، اور اس کے بعد جو شخص جتنا زیادہ ان سے قریب اور جتنا زیادہ ان کے راستہ پر چلنے والا اور جتنی زیادہ ان کی مشابہت اختیار کرنے والا ہوتا ہے؛ اسی مناسبت سے اس کی آزمائش بھی ہوا کرتی ہے۔ آخر یہ کیوں؟

اس لئے کہ آدمی جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوپر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمایا جاتا ہے۔ جب مختلف حالات پیش آئیں تو ان حالات و مصائب، تکالیف و آزمائشوں کے باوجود اپنے عقائد میں ذرّہ برابر بھی کوئی تبدیلی پیدا نہ کرنا اور اپنے ایمان پر شروع سے لے کر موت کی آخری گھڑی تک مضبوطی کے ساتھ جم جانا، یہاں تک کہ آدمی کا خاتمہ بھی ایمان کے اوپر ہو جائے؛ یہی اس امتحان کی کامیابی ہے۔

﴿اسی کا نام استقامت ہے﴾

اسی طرح بیماریاں آئیں اور ان میں مختلف طریقوں سے آزمایا گیا، اس کے باوجود

اس کا یقین اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی رہا کہ بیماری دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے، اور شفا دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، ان حالات کے باوجود اس کے اندر کوئی فرق نہیں آیا۔ نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے دین اسلام کے اوپر- چاہے اس دین کا تعلق عقیدے سے ہو، اعمال سے ہو یا زبان سے کہی جانے والی باتوں سے ہو، ہر چیز میں- مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا؛ اسی کا نام استقامت ہے۔

﴿عقیدہ میں استقامت﴾

استقامت کا تعلق عقیدے سے بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ آدمی کا اپنی زندگی میں مختلف حالات سے جب گذر ہوتا ہے، تو ان حالات میں اس کے عقیدے کی بھی آزمائش ہوتی ہے پھر دیکھا جاتا ہے کہ وہ مضبوطی کے ساتھ اس پر جما ہوا ہے یا نہیں۔ اگر اس میں کچھ فرق آیا تو سمجھ لو کہ ایمان سے اس کو جو فائدہ پہنچنا چاہیے؛ وہ نہیں پہنچا۔ یقین کی جو مضبوطی حاصل ہونی چاہیے؛ وہ حاصل نہیں ہوئی۔ اسی کمزوری کا نتیجہ ہے کہ معلوم نہیں؛ دنیا میں کیسی کیسی خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر ایمان ویقین کی مضبوطی حاصل ہوتی؛ تو پھر ان ساری بد اخلاقیوں اور برائیوں کی نوبت ہی نہ آتی۔

﴿اعمال میں استقامت﴾

اسی طریقہ سے عملی اعتبار سے دیکھا جائے۔ اعمال میں ایک تو ہے عبادات، اور دوسرے ہیں معاملات، اور پھر سارے احکامات۔ پھر عبادات میں بھی فرائض ہیں مثلاً پانچ وقت کی نماز ہے، اس میں استقامت کا مطلب یہ ہے کہ پانچوں وقت کی نماز اپنے اپنے وقت پر سنت کے مطابق جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا زندگی بھر اہتمام کرے۔ ایسا نہیں کہ

ایک مہینے دو مہینے کے لئے حالت ٹھیک کرلی، پھر حالت میں تبدیلی آگئی۔ بلکہ استقامت کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی کو زندگی میں مختلف حالات پیش آتے ہیں، بیماری آتی ہے، تندرستی آتی ہے، تونگری آتی ہے، غربت آتی ہے، اور سفر میں ہوتا ہے، حضر میں ہوتا ہے، غم ہے، خوشی ہے؛ ان سب حالات میں اس کے عمل میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے۔ بیمار ہے تب بھی، تندرست ہے تب بھی، مالداری ہے تو بھی، غریبی ہے تو بھی، سفر میں ہے تب بھی اور حضر میں ہے تب بھی؛ کسی بھی حال میں -شریعت کی طرف سے پانچ وقت کی نماز کا جو حکم دیا گیا اور اس کی ادائیگی جو اس پر فرض کی گئی ہے اس میں- اس کی طرف سے کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔

﴿سرِ مو فرق نہ آنا چاہیے﴾

اسی طرح عبادات میں جتنے بھی فرائض ہیں، ان میں استقامت کا مطلب یہ ہوا کہ مکمل طریقہ سے ان کو انجام دینا۔ رمضان شریف کے روزے ہیں، یا صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ ہے تو چالیسواں حصہ نکالنا۔ زکوٰۃ نکالنے میں ذرّہ برابر بھی تأمل نہ ہو۔ ایسا نہیں کہ اس کے پاس دس بیس ہزار روپے ہیں، تب تو زکوٰۃ آسانی کے ساتھ نکال رہا ہے، دس بیس ہزار کا چالیسواں حصہ نکالنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن جب دس بیس کروڑ روپے آگئے، تو سوچتا ہے کہ بیس کروڑ روپے کی زکوٰۃ یعنی پچاس لاکھ روپے نکالنا پڑے گی، اب وہ سوچ رہا ہے کہ ابھی تھوڑے نکال لوں، بعد میں تھوڑے نکال لوں گا۔ یہ تھوڑے سے نکال لینا کافی سمجھ لے، اور پورا حساب نہ کرے؛ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ استقامت کا مطلب تو یہ ہے کہ بیس کروڑ تو کیا، اگر ہزار کروڑ بھی اس کے پاس آجائیں؛ تو زکوٰۃ کی ادائیگی کا اس کو جو حکم دیا گیا ہے، اس کے اندر سرِ مو فرق نہیں آنا چاہیے۔

حج اس پر فرض ہوگیا ہے، تو اس کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، یہ عبادات ہیں، ان کی ادائیگی میں کیسے ہی حالات آجائیں؛ کوئی فرق نہیں آنا چاہیے۔

رات کو نیند نہیں آئی تو فجر کی نماز پڑھنے چلے گئے، اور نیند آرہی ہے تو کہا کہ بعد میں پڑھ لیں گے؛ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ کیسی ہی کیفیت کیوں نہ ہو، نماز کی ادائیگی میں اس کی طرف سے کمی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ استقامت ہے۔

﴿استقامت کیسے حاصل ہو؟﴾

یہ تو فرائض کا معاملہ ہوا۔ عبادات میں نوافل کا معاملہ بھی ہے۔ ہر فرض نماز کے ساتھ کچھ نوافل بھی ہیں، اور آگے پیچھے سنتیں لگی ہوئی ہیں، ان کے علاوہ باقی نوافل اور بھی ہیں، تہجد اشراق چاشت اور اوّابین ہیں۔ ان نمازوں میں استقامت کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی بھی ادائیگی کا جب ارادہ کیا اور شروع کر دیا؛ تو ان میں کبھی بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَىٰ اللهِ مَادَامَ وَإِنْ قَلَّ (البخاری، کتاب اللباس، ۵۸۶۱)﴾ اللہ تعالیٰ کے یہاں بہترین عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جائے۔ اسی لئے مَیں نے کہا تھا کہ آدمی میانہ روی اختیار کرے۔ جب کسی بھی کام میں درمیانی راہ اختیار کرے گا اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض نہیں کی گئیں، ان میں بھی میانہ روی سے کام لے گا؛ تو اس کو آپ ہی آپ استقامت اور جماؤ نصیب ہو جائے گا۔ اور اگر افراط سے کام لے رہا ہے؛ تو ممکن ہے کہ وہ پابندی نہ کر سکے۔ مثلاً ایک آدمی رات بھر جاگتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ کسی روز سو بھی جائے۔

﴿ ...... یہ مجھے زیادہ پسند ہے ﴾

ایک صحابی حضرت سلیمان بن ابی حثمہ نامی تھے، ایک روز فجر کی نماز میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو نہیں دیکھا، جب دن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے گھر کے پاس سے گذرے، تو ان کی والدہ شفا سے پوچھا: آج صبح کی نماز میں سلیمان نہیں تھے، کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا بات دراصل یہ ہوئی کہ وہ رات بھر عبادت میں مشغول رہے، صبح صادق کے قریب ان کی آنکھ لگ گئی؛ اس لئے وہ جماعت میں شریک نہیں ہو سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مَیں فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھوں، یہ مجھے اس کے مقابلہ میں زیادہ پسند ہے کہ رات بھر عبادت کروں اور فجر کی نماز غائب ہو جائے۔ (مؤطا للامام مالک، حدیث نمبر ۲۷۰)

﴿ اس کو پسند نہیں کیا گیا ہے ﴾

دیکھئے! نوافل کا مطلب کیا ہے؟ نفل اس کو کہتے ہیں کہ اگر آپ کریں گے؛ تو ثواب ملے گا، اور نہیں کریں گے؛ تو اس پر کوئی گناہ یا پکڑ ہونے والی نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں فرض کا معاملہ ایسا ہے کہ اگر آپ نہیں کر رہے ہیں؛ تو وہ بہت بڑا گناہ ہے۔ فرض نماز اگر آپ چھوڑیں گے، تو فرض نماز کا چھوڑنا کبیرہ گناہ ہے۔

نفل میں استقامت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نفل کے لئے جو شرائط ہیں ان کا خیال رکھے۔ ایک تو یہ ہے کہ اس میں اعتدال و میانہ روی سے کام لیتے ہوئے پابندی کا اہتمام کرے، اور اس کی وجہ سے فرائض کی ادائیگی میں اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ فرائض بھی اپنے اپنے وقت پر پورے طریقے سے ادا کرنے کے ساتھ جن جن نوافل کا وہ اہتمام کر رہا ہے، ان کو بھی پابندی سے ادا کرے

مثلاً آپ نے کوئی لمبا چوڑا عمل شروع کر دیا، لیکن وہ ایسا ہے کہ جس کے متعلق یہ اندیشہ وخطرہ ہے کہ آپ اس کی پابندی نہیں کر سکیں گے؛ تو اس کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔

﴿یہ میرا طریقہ ہے﴾

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ تین صحابی رضوان اللہ علیہم اجمعین ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نبی کریم ﷺ کے معمولات کے متعلق سوال کیا۔ ام المؤمنین نے بتلایا کہ آپ ﷺ رات کے ایک حصہ میں آرام کرتے ہیں اور کچھ حصہ میں آپ عبادت کرتے ہیں۔

روزوں کے متعلق پوچھا تو بتلایا کہ مہینے میں تین دن آپ روزہ رکھتے ہیں، باقی دنوں میں افطار کرتے ہیں۔ یہ ساری تفصیل بتلائی۔ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یوں سوچا کہ یہ تو نبی کریم ﷺ کا معاملہ ہے، آپ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشے بخشائے ہیں، ہم لوگ ہلاکت کی کگار پر کھڑے ہوئے ہیں، اس لئے ہمیں زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے تو یہ طے کیا کہ مَیں رات بھر جاگوں گا؛ کبھی نہیں سوؤں گا۔ دوسرے نے یہ طے کیا کہ مَیں ہمیشہ روزہ رکھوں گا؛ کبھی افطار نہیں کروں گا۔ اور تیسرے نے یہ طے کیا کہ مَیں کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو ام المؤمنین نے آپ کو بتلایا کہ ابھی ایسا ہوا۔ آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو جمع کر کے فرمایا:

﴿وَاللهِ اِنِّیْ أَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهٗ وَلٰكِنِّیْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّیْ وَأَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَيْسَ مِنِّیْ (البخاری، کتاب النکاح، ۵۰۶۳)﴾ اللہ کی قسم! مَیں تم لوگوں میں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اللہ کا تقویٰ رکھنے والا ہوں، اس کے باوجود مَیں

رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔مَیں مہینہ کے کچھ دنوں میں روزے بھی رکھتا ہوں اور بقیہ دنوں میں افطار بھی کرتا ہوں۔اور عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کرتا ہوں۔یہ میرا طریقہ ہے،اور جو میرے طریقے سے منھ موڑے گا؛ وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔

یہاں نبی کریم ﷺ نے امت کو اعتدال والا راستہ بتلایا کہ آدمی اپنے مزاج کی بھی رعایت کرے،نوافل کا اہتمام ضروری اور اچھا ہے،لیکن نوافل کے اندر آدمی اگر اپنے مزاج کی رعایت نہیں کرے گا؛ تو اس پر پابندی نہیں کر سکے گا اور جم بھی نہیں سکے گا۔

﴿......اور سفر بھی مکمل نہیں ہوا﴾

حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿فَإِنَّ السَّائِرَ الْمُنبَتَّ لَا أَرْضًا قَطَعَ وَلَا ظَهْرًا أَبْقَىٰ﴾ (کنز العمال بروایت امام بزار،۳/۳۶۔کشف الخفا ۲۸۴۲) ایک آدمی سفر میں اپنی سواری کے جانور کو خوب دوڑاتا ہے،تاکہ جلدی سے سفر پورا ہو جائے۔اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ وہ جانور زیادہ دوڑنے کے نتیجے میں مرجائے گا ﴿لَا أَرْضًا قَطَعَ وَلَا ظَهْرًا أَبْقَىٰ﴾ اب نہ تو وہ اپنا سفر پورا کر سکا،نہ اپنی سواری کا جانور باقی رکھ سکا۔سواری کا جانور بھی ہاتھ سے گیا اور سفر بھی مکمل نہیں ہوا۔اپنا جسم بھی ایک سواری کی حیثیت رکھتا ہے،اور ہم کو اسی سے کام لینا ہے،اگر آدمی نوافل میں غلو سے کام لے گا اور حد سے آگے بڑھے گا؛ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جسم کی حفاظت نہیں کر سکے گا،اپنے مزاج کی،اپنی طبیعت کی اور اپنی صحت کی رعایت کرنا بھی لازم ہے۔ایسی نفل عبادت کہ جس کے نتیجہ میں صحت خراب ہو جائے؛ شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

﴿استقامت روح ہے﴾

بہر حال! نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل سے اور اپنے ارشادات کے ذریعہ سے امت

کوخاص طور پراس بات کی طرف متوجہ فرمایا کہ نوافل بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں مطلوب اور پسندیدہ ہیں، اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہیں؛ لیکن اس میں بھی آدمی میانہ روی اختیار کرے نہ افراط سے کام لے، نہ تفریط سے۔غلو کی ہرگز اجازت نہیں ہے، بلکہ ایسا طریقہ اختیار کرے جس میں استقامت کے ساتھ پابندی کا اہتمام ہو سکے۔

تو عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ استقامت یعنی شریعت کے اوپر جم جانا اور شریعت کے احکام پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانا بہت بڑی چیز ہے۔یوں سمجھئے کہ ساری شریعت کی روح ہے۔جب تک استقامت نہ ہو، کسی بھی چیز میں کمال پیدا نہیں ہوسکتا۔

معاملات میں استقامت

معاملات کے اندر استقامت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے، ان کے ساتھ حلال والا معاملہ کرنا۔اور جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان سے بچنے کا اہتمام کرنا۔ایک آدمی کاروبار کرتا ہے تو اس میں دونوں صورتیں پیش آئیں گی۔لہٰذا کاروبار میں حرام سے مکمل پرہیز کرتا ہے۔کیونکہ حرام اللہ تعالیٰ سے دوری کا ذریعہ ہے۔اگر حرام کی نوبت آتی ہے، تو اس سے دور بھاگتا ہے، اس کے ایک ذرّے کو بھی اپنے لئے پسند نہیں کرتا، بلکہ جہاں حرام کا شبہ بھی ہو، اس سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

اتنا زیادہ اہتمام کیا

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے، آپ کی کپڑوں کی تجارت تھی، آپ کہیں تشریف لے گئے تھے، آپ کا تجارت میں جو شریک تھا اس کو بتلا دیا تھا کہ فلاں تھان میں یہ عیب ہے، کوئی خریدار آوے تو اس کو بتلا کر معاملہ کرنا۔جب آپ واپس تشریف لائے تو

معلوم ہوا کہ آپ کے شریک نے ایک بہت بڑا سودا کرلیا تھا اور اس سودے کے اندر وہ تھان بھی تھا؛ لیکن یہ بتانا بھول گیا تھا۔ تو آپ نے اس پورے سودے میں جتنی رقم آئی تھی؛ وہ ساری صرف اس وجہ سے صدقہ کردی کہ آپ کا وکیل یہ بتانا بھول گیا تھا کہ اس میں عیب ہے

(مناقب أبي حنيفه للذهبي، ص ۴۱)

حالانکہ شریعت نے تو خیارِ عیب کی بھی اجازت دی ہے۔ خیارِ عیب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی خریدار نے کوئی چیز خریدی اور اس خریدی ہوئی چیز میں کوئی عیب ہے، جب خریدار کو اس عیب کا پتہ چلے تو اس کو شریعت نے اجازت دی ہے کہ اس عیب کی وجہ سے وہ واپس کرے، چاہے ایسی کوئی شرط نہ لگائی گئی ہو۔ لیکن اس کے باوجود امام صاحب نے صرف اتنا ہی نہیں کہ اس سودے سے حاصل ہونے والے منافع کو صدقہ کردیا، بلکہ پوری رقم کو صدقہ کردینا ضروری سمجھا۔ حرام سے اپنے آپ کو بچانے کا اتنا زیادہ اہتمام کیا۔

ہمارے اکابر کے ایسے حالات ہم پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ حرام سے بچنے کا کتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قصہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہے۔ آپ نے حکایاتِ صحابہ میں پڑھا اور سنا ہوگا۔ آپ کا ایک غلام تھا جس کو آپ نے خراج کے اوپر چھوڑ رکھا تھا۔

خراج کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ غلام کو کوئی ہنر یا فن آتا ہو؛ تو اس کو اجازت دی جائے کہ تم اپنے ہنر سے کما لو اور روزانہ اپنی کمائی میں سے اتنی رقم مجھے دے دینا۔

اسی طرح اس کو بھی آپ نے خراج پر لگا دیا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ دودھ لایا،

ویسے تو حضرت کی عادت تھی کہ روزانہ پوچھا کرتے تھے کہ کہاں سے لائے۔ اتفاق سے اس روز ہی نہیں پوچھا اور وہ دودھ پی لیا۔ اس غلام نے کہا: آقا! آپ تو روزانہ پوچھتے ہیں کہ یہ چیز کہاں سے لائے، آج آپ نے نہیں پوچھا؟ آپ نے کہا: ہاں بھئی بتادو۔ اس نے کہا: بات دراصل یہ ہوئی کہ زمانۂ جاہلیت میں مَیں کہانت یعنی غیب کی خبریں دینے کا کام کیا کرتا تھا، چونکہ اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، اس لئے اسلام لانے کے بعد چھوڑ دیا، لیکن زمانۂ جاہلیت میں مَیں نے ایک آدمی کو اس طرح کی کچھ باتیں بتائی تھیں، آج اس سے ملاقات ہوئی، تو اس نے اسی بتائی ہوئی سابقہ باتوں کی بنیاد پر؛ بدلے میں یہ دودھ مجھے دیا تھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ اکبر! اسی وقت حلق میں انگلی ڈالی اور وہ سارا دودھ -جو پی گئے تھے- قے کر دیا۔ (بخاری شریف، کتاب مناقب الانصار)

بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ معاملات کے اندر شریعت کے احکام میں جائز اور ناجائز، حرام اور حلال کا پورا اہتمام ہو۔ پوری شریعت پر مضبوطی سے جم جانا؛ اسی کا نام استقامت ہے۔

﴿لیکن اس میں ہماری ہمت نہیں ہوتی﴾

آج ہم لوگوں کو عبادتوں اور معمولات سے فائدہ کیوں نہیں پہنچتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دکان میں تو اس چیز کا بڑا اہتمام کرتے ہیں کہ دس بجے دکان کھولنی ہے؛ تو دس بجے کھل جائے گی۔ فیکٹری کی پہلی پالی اگر دس بجے شروع ہوتی ہے؛ تو شروع ہو ہی جائے گی کبھی ایسا ہوا کہ فیکٹری کے ٹائم میں کوئی فرق آیا ہو، دکان کے وقت میں کوئی فرق آیا ہو؟

آپ جس کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، اس میں آپ کی طرف سے جو اوقات مقرر کئے گئے ہیں، اس میں تو ذرّہ برابر فرق نہ آئے۔ اور آپ کی قرآنِ پاک کی تلاوت، نماز کی

جماعت اور تسبیحات وغیرہ چیزوں میں آپ یوں کہیں کہ آج چھوٹ گیا، فلاں روز ایسا ہوا۔

حضرت ہردوئی دامت برکاتہم (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک مرتبہ فرمایا: ایک صاحب نے لکھا کہ اتنے دنوں سے تسبیحات چھوٹ گئیں ہیں۔ مَیں نے کہا: کبھی کھانا چھوٹا؟ دوپہر کا کھانا چھوٹا؟ شام کا کھانا چھوٹا؟ یا کبھی آپ کا ناشتہ چھوٹا؟ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر آج تسبیح چھوٹ گئی، تو ناشتہ مت کرو، کیونکہ آج تسبیح چھوٹ گئی۔ دیکھ لو پھر کیسی پابندی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں ہماری ہمت نہیں ہوتی۔

کھانے پینے وغیرہ کے جو ہمارے طبعی معمولات ہیں، ان میں ہم کبھی کوتاہی نہیں کرتے، اس میں ہمیں استقامت کا مقام حاصل ہے۔ اگر استقامت حاصل نہیں ہے تو شریعت کے معمولات میں نہیں ہے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم ان چیزوں میں بڑی مضبوطی کے ساتھ ایسے جمے رہتے کہ ذرّہ برابر فرق آنے نہ دیتے۔ اصل چیز یہی ہے۔

﴿یہ کرامت سے بڑھ کر ہے﴾

بزرگوں نے لکھا ہے: ﴿الاستِقَامَةُ فَوقَ الكَرَامَةِ﴾ استقامت: کرامت سے بڑھ کر ہے۔ یعنی کسی کو اگر ہَوا میں اڑنے کی، پانی پر چلنے کی کرامت حاصل ہے، لیکن شریعت کے احکام پر مضبوطی سے جمنے میں کمی کوتاہی ہے؛ تو وہ کرامت کسی کام کی نہیں۔ اور اگر آدمی شریعت کے اوپر پابندی سے عمل کر رہا ہے، اس میں ذرّہ برابر کوتاہی سے کام نہیں لیتا؛ تو یہ بڑی سے بڑی کرامتوں سے بڑھ کر ہے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت امامِ ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مہینے دو مہینے تک رہے۔ جب جانے لگے تو حضرت سے کہنے لگے:

اب تک تو یہاں کوئی کرامت نظر نہیں آئی۔ حضرت نے کہا: اچھا بھائی! ایک بات بتاؤ! کبھی کوئی چیز شریعت اور سنت کے خلاف دیکھی، جو ہم سے صادر ہوئی ہو؟ انہوں نے کہا: شریعت اور سنت کے خلاف تو کوئی کام نہیں دیکھا۔ حضرت نے فرمایا: اور کیا کرامت دیکھنی ہے؟ سب سے بڑی کرامت تو یہی ہے، اور یہی اصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ استقامت پورے دین کی روح اور جان ہے۔ اسی لئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا ہے: ”باب الاستقامة“ یعنی آدمی کا دین پر مضبوطی کے ساتھ جمنا اور چلنا۔

﴿موجودہ دور کا سب سے بڑا پروبلم (المیہ)﴾

آج ہمارے اس دورِ حاضر کا سب سے بڑا پروبلم (Problem) اور المیہ یہی ہے۔ جو دین دار نہیں ہیں ان کو تو چھوڑیے، جو دین دار ہیں، اور جن سے دینی نسبت سے کوئی تعلق و رابطہ قائم ہوتا ہے، کچھ پڑھنے پڑھانے کی بات ہوتی ہے؛ وہاں بھی یہی بات آتی ہے کہ معمولات کی پابندی نہیں ہوتی اور معمولات چھوٹ جاتے ہیں۔

اور ہمارے پڑھنے والے بعض طلبہ اور اہل علم جو ہوتے ہیں ان کے یہاں تو تاویل کا دروازہ بھی خوب کھلا ہوا رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پابندی نہیں ہوتی، کچھ نہ کچھ کوتاہی ہو جاتی ہے۔ جب ان سے پوچھیں کہ کچھ کوتاہی کی آپ وضاحت کیجیے، تو وضاحت سننے پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن ہوتا ہے، چھ دن نہیں ہوتا۔

﴿معمولات یا متروکات﴾

ایک دفعہ مَیں نے ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ حضرت! معمولات چھوٹ رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جب چھوٹ رہے ہیں تو وہ معمولات کہاں رہے؟ وہ

تو متروکات ہوگئے۔ معمول کا مطلب یہ ہے کہ جس پر آدمی کا عمل ہو، اور متروک کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز چھوڑی جائے۔ تو حضرت نے فرمایا: جب آپ یوں کہہ رہے ہیں کہ یہ چھوٹ رہے ہیں، اور پھر لکھ رہے ہیں کہ معمولات؟ یہ معمول تھوڑے رہے، یہ تو متروک ہوگئے۔ حضرت نے ایسا عجیب ایک جملہ لکھا کہ دل پر چوٹ لگی کہ واقعتاً اب ہم اس کو معمول سے کیسے تعبیر کر سکتے ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو دین دار طبقہ ہے، اور جو یہ چاہتا ہے کہ کچھ کریں، ان میں سب سے بڑا مرض؛ یہی عدمِ استقامت ہے۔ اور جب تک استقامت نہیں ہوگی، اور معمولات کی ادائیگی کا مضبوطی کے ساتھ اہتمام نہیں ہوگا، اور عبادات اور دین کے جتنے بھی شعبے ہیں، ان پر جمنے کی کوشش نہیں کرے گا؛ تب تک کبھی بھی دین پر عمل کا فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

مَیں آپ کو دنیا کی مثال پہلے بھی دے چکا ہوں کہ جو آدمی مہینے دو مہینے میں اپنا کاروبار بدلتا رہے، تو وہ آدمی کبھی بھی کاروباری لائن میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ وہاں کاروبار چھوڑا نہیں ہے، بلکہ بدلا ہے۔ اور یہاں تو یہ حال ہے کہ ہم چھوڑ دیتے ہیں۔

﴿شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَاَخَوَاتُهَا﴾

اسی لئے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ﴾ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ آپ جم جایئے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ یہ سورۂ ھود کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: ﴿شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَاَخَوَاتُهَا﴾ سورۂ ھود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ (الترمذی، ۳۲۹۸)

اس سے کیا مراد ہے؟

دلیل الفالحین کے مصنف نے ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے یہ جو ارشاد فرمایا کہ مجھے سورۂ ھود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کردیا۔ تو سورۂ ھود میں پچھلی امتوں کے قصے، ان کی نافرمانیاں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر جو عذاب آیا؛ اس کا تذکرہ مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! بلکہ یہ آیت مراد ہے ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جیسا حکم دیا گیا؛ ویسا آپ دین پر جم جائیے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بہت بڑا اور عظیم حکم ہے، اس حکم پر پورا اترنا معمولی بات نہیں ہے۔

﴿استقامت پر وعدے﴾

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے، اور پھر اس پر جم گئے، یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے جو تقاضے ہیں وہ پورے کئے، مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم رہے ﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایسے لوگوں کے اوپر فرشتے نازل ہوتے ہیں، جو ان کو اطمینان دلاتے ہیں اور ان کی تسکین کرتے ہیں ﴿اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ کہ نہ تو تم ڈرو اور نہ غمگین ہو ﴿وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ اور اس جنت کی بشارت سن لو جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو وعدہ کیا جاتا تھا۔

پھر باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو کہا جاتا ہے ﴿نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ ہم تمہارے دوست اور کارساز ہیں دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَاتَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُمْ﴾ اور تمہارے لئے وہ چیزیں اور نعمتیں ہیں جو تمہارے جی چاہیں گے ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَاتَدَّعُوْنَ﴾ اور تم کو جنت کی وہ ساری چیزیں ملیں گی جو تم چاہو گے ﴿نُزُلاً مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيمٍ﴾ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے- جو معاف کرنے والا اور مہربان ہے- استقامت اور دین پر جمنے کے نتیجہ میں مہمانی کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے۔

باری تعالیٰ کا ایک اور ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ جنہوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا اور پھر اس پر جم گئے ، تو نہ تو ان کو کوئی خوف ہے، اور نہ وہ کسی غم میں ہوں گے ﴿اُوْلٰئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ وہ جنت والے ہیں، ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ ان کے اعمال کے بدلے میں ہے۔

﴿جامع نبوی نصیحت﴾

عن أبی عمرو وقیل أبی عمرة سفیان بن عبدالله رضی اللہ عنہ قال قلتُ: یَارَسُوْلَ اللهِ! قُلْ لِیْ فِی الْاِسْلَامِ قَوْلاً، لاَ أَسْئَلُ عَنْهُ أَحَدًا غَیْرَکَ. قَالَ: قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ.

حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے دین اسلام کے بارے میں کوئی ایسی نصیحت کر دیجیے کہ آپ کے بعد کسی اور سے اس کے سوا کچھ نصیحت پوچھنی نہ پڑے۔ میری زندگی بھر کے لئے وہ نصیحت کافی ہو جائے۔ یعنی کوئی دوٹوک ایسی بات کہ اگر مَیں اس کو پلّے باندھ لوں، تو زندگی بھر میری کامیابی کے واسطے کافی ہو جائے؛ ایسی ایک آدھ بات بتا دیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک مرتبہ کہہ لو کہ اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر جم جاؤ۔ ایمان کے جو تقاضے ہیں ان کو مضبوطی کے

ساتھ پورے کرو، اوراس پر قائم رہو۔ یہ اصل ہے اوراس میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

﴿غلو کیسے پیدا ہوتا ہے؟﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: قَارِبُوا وَسَدِّدُوا، وَاعْلَمُوا أَنَّهُ لَنْ يَّنْجُوَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ بِعَمَلِهٖ. قَالُوْا: وَلاَ أَنْتَ يَارَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: وَلاَ أَنَا إِلَّا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللهُ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ میانہ روی سے کام لو، جیسا کہ پہلے بھی بتلا چکا کہ اعمال میں میانہ روی ہونی چاہیے، غلو نہیں برتنا چاہیے، افراط و تفریط نہیں ہونی چاہیے۔ اس لئے کہ آدمی اگر غلو سے کام لے گا تو کبھی جم نہیں سکے گا۔ ایک آدمی رات رات بھر عبادت کرتا ہے تو کب تک اس کو برداشت کرے گا؟ ہوسکتا ہے کہ مہینہ دو مہینہ، چار پانچ مہینے کے بعد وہ اس کو چھوڑ دے گا اور کسی قابل نہیں رہے گا۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ اس طرح کی چیزوں کو پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ آپ اعتدال پر عمل فرماتے تھے ﴿وَسَدِّدُوا﴾ اور مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّهُ لَنْ يَّنْجُوَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ بِعَمَلِهٖ﴾ اور یہ جان لو کہ تم میں سے کوئی بھی شخص اپنے عمل کی وجہ سے نجات نہیں پائے گا۔ نجات تو اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے ملے گی۔ عمل تو صرف ایک ذریعہ وآلہ ہے۔ اصل نجات دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے، اوراس کے حکم کے بغیر عمل کی توفیق بھی نہیں ہوسکتی، اگر اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق نہ دے تو آدمی کہاں عمل کرسکتا ہے۔

صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ بھی عمل سے نجات نہیں پائیں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: مَیں بھی نہیں؛ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت اور فضل سے ڈھانپ لیں مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل ہی کام آنے والا ہے، عمل سے آدمی نجات پانے والا نہیں ہے۔

جب بنیاد یہ ہے تو غلو اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آدمی عمل میں جو غلو کرتا ہے اور حد سے آگے بڑھتا ہے؛ وہ اسی لئے کہ اس کے ذہن میں یہ چیز بیٹھ جاتی ہے کہ عمل ہی سے یہ چیز حاصل ہونے والی ہے۔ حالانکہ وہ چیز اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے حاصل ہوتی ہے۔

اللّٰہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے

﴿دعا﴾

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتبارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَامُحَمَّدٍ وَّعَلیٰٓ اٰلِ سَیِّدِنَاوَمَوْلٰنَامُحَمَّدٍصَلٰوۃً تُنَجِّیْنَابِھَامِنْ جَمِیْعِ الْاَھْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِیْ لَنَابِھَاجَمِیْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَھِّرُنَابِھَامِنْ جَمِیْعِ السَّیِّئاٰتِ وَتَرْفَعُنَا بِھَاعِنْدَکَ اَعْلیٰ الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَابِھَآاَقْصیٰ الْغَایَاتِ مِنْ جَمِیْعِ الْخَیْرَاتِ فِی الْحَیٰوۃِوَبَعْدَالْمَمَاتِ اِنَّکَ عَلیٰ کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ دینی امور کے اندر ہمیں استقامت عطا فرما، استقامت کی دولت سے ہمیں مالا مال فرما۔ اے اللہ! ہر طرح کی غیر مستقل مزاجی سے اور تلون مزاجی سے ہماری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! اپنی مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلا کر نامرضیات سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما اے اللہ! ہمارے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشانیوں کو دور فرما۔ مرحومین کی مغفرت فرما۔ حاجتمندوں کی حاجتیں پوری فرما۔ اے اللہ! جو بے روزگار ہیں ان کو روزگار عطا فرما اور جو روزگار کی پریشانیوں میں مبتلا ہیں؛ ان کی پریشانیوں کو دور فرما کر سب کے روزگار میں خیر و

برکت اور وسعت مقدر فرما۔ ہماری تمام ضروریات کی خزانۂ غیب سے کفالت فرما، ہمیں کسی کا محتاج اور دست نگر نہ فرما۔ اے اللہ! ایمان کی سلامتی کے ساتھ ہمیں دنیا سے اٹھا۔ اے اللہ! قبر کے عذاب سے ہماری حفاظت فرما۔ حشر کی ہولناکیوں سے ہماری حفاظت فرما۔ اپنے عرشِ عظیم کا سایہ نصیب فرما۔ نبی کریم ﷺ کی شفاعت مرحمت فرما، حضور ﷺ کے مبارک ہاتھوں حوضِ کوثر کا جام نصیب فرما۔ جہنم کے عذاب سے پوری پوری حفاظت فرما کر جنت کے اندر دخولِ اوّلین نصیب فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ نے اور تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اور تیرے مقبول بندوں نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگیں؛ وہ سب ہم کو عطا فرما۔ انہوں نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہیں؛ ان سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ،
وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ
بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ

التفکر فی عظیم

مخلوقات اللّٰہ تعالیٰ

خدا کی مخلوقات میں غور وفکر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً.أمابعد:

﴿خدا کی مخلوقات میں غوروفکر﴾

اوپر استقامت کے باب کوذکرکیا تھا،اب باب قائم کررہے ہیں کہ آدمی کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی جو بڑی بڑی مخلوقات ہیں، زمین وآسمان، چاند وسورج اورعرش وکرسی؛ان کے سلسلے میں آدمی غوروفکر کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی بڑی بڑی مخلوقات کیسے پیدا فرمائیں،اس سے آدمی کواللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔اس لئے کہ ان ساری مخلوقات کواللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لئے مسخر کردیا ہے،اوروہ اسی لئے بنائی گئی ہیں کہ انسانوں کی ضرورتیں پوری کریں۔اورساتھ ہی ساتھ آدمی یہ بھی تصور کرے کہ یہ دنیا ختم ہونے والی ہے،اورآخرت میں جومختلف اہوال وپریشانیاں پیش آنے والی ہیں،اس کے متعلق بھی آدمی سوچتا رہے۔گویا دنیاوآخرت کی تمام چیزوں کے متعلق غوروفکر کرتا رہے،اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی انجام دہی میں اب تک جوکوتاہیاں ہوتی رہیں،ان کوبھی سوچتا رہے، اورساتھ ہی ساتھ ان احکام کی انجام دہی کے لئے نفس کوابھارتا رہے،اوران احکام کو بجالانے میں ثبات قدمی اورمضبوطی سے جمارہے۔یہ باب اسی مقصد کے لئے لائے ہیں۔ اس باب میں کوئی روایت تونہیں لائے ہیں،صرف تین چار آیتوں کی طرف اشارہ کردیا ہے

﴿صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں﴾

﴿اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں جگہ جگہ پر انسانوں کو غور وفکر کی دعوت دی، گویا انسان کو سوچنے اور سمجھنے کی جو صلاحیت عطا فرمائی، عقل وفہم عطا فرمائی، اس سے کام لیتے ہوئے اور اس کو استعمال کرتے ہوئے آدمی کو غور وفکر کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم مخلوقات بنائی ہیں، اور پھر سوچے کہ ان ساری مخلوقات کا مقصد کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو ارشاد فرمایا: آپ ان لوگوں کو کہہ دیجیے کہ میں تم کو ایک بات کی نصیحت وتاکید کرتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے سامنے دو دو اور ایک ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور میں تنہائی میں کھڑے رہ کر غور وفکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو تمہاری ہدایت کے واسطے بھیجا اور پھر تم کو اپنے احکام پر عمل کرنے کے واسطے قبول فرمایا۔

﴿...... بڑی نشانیاں ہیں﴾

باری تعالیٰ کا دوسرا ارشاد نقل فرمایا: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيَاتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں، رات اور دن کے آنے اور جانے میں (یہ پورا نظام اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے اس میں) سوچنے والوں اور عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

قرآنِ پاک نے عقل مند کن لوگوں کو بتلایا؟ ﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ جو اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے رہتے ہیں، کھڑے کھڑے اور بیٹھے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر یعنی لیٹے لیٹے۔ یعنی جو لوگ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں اور ذکر میں مشغول رہتے

ہیں، انہیں کو قرآنِ پاک نے عقل مند بتلایا ہے۔

حقیقت تو یہی ہے کہ جو آدمی اپنی زندگی کے اہم مقصد کو صحیح طریقے سے حاصل کرلے؛ وہی عقل مند سمجھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی زندگی کو جو لوگ ضائع کردیتے ہیں، اور مقصدِ زندگی کو پیشِ نظر نہیں رکھتے؛ ان کو کون عقل مند کہے گا؟

﴿وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اور وہ زمین وآسمان کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں۔ اور جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی مخلوقات کی عظمت آتی ہے تو وہ پکار اُٹھتے ہیں: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ اے ہمارے رب! تونے یہ ساری مخلوق ایسے ہی بے کار پیدا نہیں فرمائی۔ تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے۔ پس ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا۔ مطلب یہ ہے کہ ان مخلوقات میں غور وفکر کے نتیجہ میں ان کو اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف ان کا دھیان جاتا ہے۔

﴿غور وفکر کا طریقہ﴾

آگے غور وفکر کا ایک طریقہ بھی بتلادیا: ﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ﴾ یہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسے پیدا کیا؟ اس کے سر اور اعضاء کو دیکھو وہ کیسی عظیم مخلوق ہے، لیکن انسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسخر کردیا اور تابع بنادیا کہ وہ انسانوں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔

﴿وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ﴾ اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ اس کے لئے کوئی ستون نہیں ہے۔

﴿وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ﴾ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ زمین پر کیسے

بچھائے گئے۔ یعنی زمین پر کھڑے کر دئے گئے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کو حرکت سے محفوظ کر دیا ﴿وَاِلیٰ الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ﴾ اور زمین کو اللہ تعالیٰ نے کیسے پھیلایا۔

﴿فَذَکِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَکِّرْ﴾ آپ لوگوں کو نصیحت کرتے رہیے، آپ کا کام ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت کرنا ہے۔

﴿یہ انصاف کا طریقہ نہیں ہے﴾

بہر حال! علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح کی اور بھی بے شمار آیتیں قرآنِ پاک میں ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو غور وفکر کی دعوت دی ہے کہ آدمی ان ساری چیزوں کو سوچ کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ساری مخلوقات کو انسان کی خدمت اور ضرورت کے واسطے پیدا کیا ہے، اور انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے: ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند　❁　تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار　❁　شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

(گلستاں سعدی دیباچہ، صفحہ۲)

یہ بادل، ہوا اور سورج و چاند؛ سب کام میں لگے ہوئے ہیں، اور ان سب کو اللہ تعالیٰ نے خدمت کے اندر لگایا ہے، اس لئے کہ آپ اپنی روزی اور روٹی حاصل کر کے اس کو غفلت سے نہ کھائیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ساری مخلوق ہمارے لئے سرگرداں ہیں، ہماری اطاعت وفرمانبرداری میں، ہمارے کام میں اور ہماری خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ انصاف کا تقاضہ نہیں ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری نہ کرو، جب کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری مخلوقات کو تمہاری اطاعت و

فرمانبرداری اور خدمت کیلئے مقرر کردیا اور مسخر وتابع بنادیا، اور تم کو اپنی اطاعت وفرمانبرداری کے لئے پیدا کیا ہے۔ اب تمہیں اپنی ڈیوٹی بجانی ہے، اور اپنا فریضہ انجام دینا ہے۔

المبادرة الیٰ الخیرات

نیکی کی طرف لپکنا

مجلس ﴿۱﴾

یکم/صفر المظفر ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۷/ جون ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً ۔ اما بعد

﴿نیکی کے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے﴾

آدمی جب اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کو احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کیسی کیسی نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ تمام مخلوقات اور ساری کائنات اللہ تعالیٰ نے اسی لئے پیدا فرمائی کہ وہ ہماری خدمت انجام دے اور ہماری ضرورتوں کو پورا کرے، پھر اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار ہوتا ہے اور اس استحضار کے نتیجہ میں آدمی یوں سوچتا ہے کہ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنا چاہیے، اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرنی چاہیے۔ اسی کو اس باب میں بتلانا چاہتے ہیں کہ آدمی کو نیکی کے کاموں میں سبقت کرنی چاہیے، اور جلدی سے کام لینا چاہیے۔

یعنی آدمی کا جب کسی نیکی کے کام کا ارادہ ہو، تو اس کام کو انجام دینے میں تاخیر نہ کرے، بلکہ جہاں نیک کام کا ارادہ دل میں آیا، فوراً اس کام کو انجام دینے کے لئے آگے بڑھے اور جلدی سے اس کام کو انجام دے۔ اس لئے کہ جو زندگی اللہ تعالیٰ نے ہم کو عطا فرمائی ہے اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں اور نیکی کے کاموں میں زندگی کے اوقات کو خرچ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری زندگی کا کوئی لمحہ اللہ تعالیٰ کی

نافرمانی میں اور گناہوں ومعصیتوں میں خرچ ہو جائے، اس سے اپنے آپ کو بچا کر اطاعت میں لگانا ہے۔ اب اگر کسی آدمی کے دل میں نیکی کا کوئی ارادہ پیدا ہوا، تو اس کو عملی جامہ پہنانے میں اور اس پر عمل کرنے میں ذرّہ برابر تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے؛ بلکہ فوری طور پر اس پر عمل کر لینا چاہیے۔

﴿شیطان کے داؤ ہر انسان کے ساتھ الگ الگ﴾

اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے: ﴿اِنَّـهُ لَـكُـمْ عَـدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ اور جیسا جیسا آدمی ہوتا ہے، اس کے مطابق وہ اس کے ساتھ اپنے داؤ آزماتا ہے، اور اپنے حربے استعمال کرتا ہے۔ مثلاً ایک کافر ہے، اس کو وہ جس طریقہ سے گمراہ کر کے راہِ راست سے ہٹاتا ہے؛ مسلمان کو راہِ راست سے ہٹانے کے لئے وہ طریقہ اختیار نہیں کرتا، بلکہ اس کے لئے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی نیکی کا کام ہے تو مؤمن کو شیطان یہ وسوسہ نہیں ڈالے گا کہ یہ نیکی کا کام مت کرو۔ اس لئے کہ اس کو معلوم ہے کہ یہ ایک مؤمن ہے اور اس کو نیکی کا کام اچھا لگتا ہے، اس کے ایمان کا تقاضہ یہی ہے کہ اگر وہ ایسی بات اس کو کہہ دے گا؛ تو وہ اس پر عمل نہیں کرے گا اور اس کی طرف توجہ نہیں کرے گا، اس لئے شیطان کبھی بھی مؤمن کو گمراہ کرنے کے لئے یہ حربہ نہیں آزماتا کہ تم یہ کام مت کرو بلکہ جب کسی مؤمن کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ فلاں نیکی کا کام مجھے کرنا چاہیے، تو شیطان اس نیکی کے کام سے اس کو روکنے کے لئے ایک تیسرا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ یوں کہتا ہے کہ واقعتاً بہت اچھا کام ہے، کرنا ہی چاہیے؛ لیکن ابھی ہی کیا ضروری ہے؟ کل کر لیں گے، گویا اس کو ٹلانے کی کوشش کرتا ہے۔ دیکھئے! یہاں اس کو یہ وسوسہ نہیں ڈالا کہ یہ نیکی کا کام آپ

مت کیجئے۔اس لئے کہ اگر اس طرح کا وسوسہ ڈالتا، تو یقیناً وہ نا کام ہوتا۔ جو مؤمن ہے وہ اس کا مقابلہ کر کے اس پر غالب آجاتا، اس لئے یہاں دوسرا طریقہ اختیار کیا، اس کام کو مؤخر کرنے کے لئے اس کو آمادہ کیا کہ جلدی کیا ہے، آج نہیں ہوگا تو کل ہو جائے گا۔

﴿باز چوں فردا شود﴾

یا کبھی کسی اہل اللہ کی صحبت میں بیٹھنے کے نتیجہ میں اپنی گذشتہ زندگی پر اور گذشتہ کی کوتاہیوں پر اگر کسی کو پچھتاوا ہوا، اور خیال آیا کہ اب اس کی اصلاح کرنی چاہیے اور آئندہ مجھے اپنی اصلاح کے لئے آگے بڑھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی میں اور اطاعت وفرمانبرداری میں جو کوتاہیاں ہوئیں؛ ان سے باز رہ کر تلافی کرنی چاہیے، تو اب شیطان اس سے روکے گا نہیں۔ بلکہ یوں کہے گا کہ کل کریں گے، ابھی ذرا فرصت واطمینان سے فلاں کام سے فارغ ہو جائیں۔ کل جمعہ کا دن آرہا ہے، غسل کر کے شروع کریں گے۔ اس نے بدھ کے روز بات سن کر ارادہ کیا تھا تو اس کو یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ مت کرو، اس لئے کہا کہ جمعہ کا دن آرہا ہے، اس دن ذرا اطمینان سے غسل کر کے جمعہ کی نماز سے شروعات کریں گے، دو دن ٹھہر جاؤ۔ یوں کہہ کر وہ اس کو روک دیتا ہے۔ ایسا ہر کام میں کرواتا ہے کہ کل یہ کریں گے، کل وہ کریں گے۔

اسی طرح اگر آپ کسی گناہ میں مبتلا ہیں مثلاً ٹی وی کے عادی ہیں اور دل میں خیال آرہا ہے کہ اس کو چھوڑنا ہے تو شیطان یوں کہے گا کہ آج ایک دن دیکھ لو، کل سے چھوڑ یو۔ شبِ برأت آنے دو، اس دن سے چھوڑنا۔ اور جب شب برأت آئے گی تو کہے گا کہ پندرہ دن بعد رمضان آنے دونا، پھر تو چھوڑ ہی دیں گے۔ جیسا ایک شاعر نے کہا ہے:-

ہر شبے گویم کہ فردا ترکِ ایں سودا کنم ❁ باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

ہر رات مَیں یہ ارادہ کرتا ہوں کہ کل یہ ساری حرکتیں چھوڑ دوں گا، لیکن جب کل آتی ہے؛ تو وہ کل تو آج بن جاتی ہے، اور پھر آج کو کل پر ٹلا دیا کرتا ہوں اور روزانہ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے

﴿ کیا گارنٹی ہے؟ ﴾

تو حقیقت یہ ہے کہ شیطان اس طریقہ سے آدمی کو روکنے کی کوشش کرتا ہے، حالانکہ کل آنے والی ہے؛ اس کی کیا گارنٹی ہے؟ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔ آدمی کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کہ مَیں کل تک زندہ بھی رہوں گا یا نہیں۔ اور پھر یہ ہے کہ اگر زندہ رہا تو نیکی کرنے کا جو داعیہ اِس وقت میرے دل میں پیدا ہوا ہے؛ وہ باقی بھی رہے گا یا نہیں۔ اور پھر اگر یہ داعیہ باقی بھی رہا، تو کل ایسے مواقع میسر آئیں گے اور اسباب مہیا ہو جائیں گے کہ نیکی کا وہ کام انجام دے سکوں، جیسا آج دے سکتا ہوں۔

﴿ ''وارِدِ روحانی'' غیرت مند مہمان ﴾

اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ جب کسی کے دل میں نیکی کا کوئی داعیہ پیدا ہو، تو یہ وارِدِ روحانی ہے۔ ''وارِدِ روحانی'' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ کے دل میں آپ کی بھلائی کے واسطے ایک چیز ڈالی گئی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا مہمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اس مہمان کی قدر کرنی چاہیے۔ اور اس کی قدر یہ ہے کہ نیکی کے کام کا جو داعیہ ہمارے دل میں پیدا ہوا ہے، اس پر فوراً عمل کرتے ہوئے نیکی کا وہ کام کر لیا جائے، اس میں ذرّہ برابر تاخیر سے کام نہ لیا جائے۔ اگر ہم اس کی قدر نہیں کریں گے، اور دل میں نیک کام کرنے کا جو خیال آیا ہے، اس کو ہم ٹلا دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اس کی

ناقدری کی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا مہمان بڑا باغیرت اور شریف ہوتا ہے، اور باغیرت وشریف مہمان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ آپ کے گھر آجائے اور آپ اس کی طرف توجہ کرنے کے بجائے رخ پھیر لیں۔ مثلاً وہ تو آکر بیٹھا ہوا ہے، اور آپ زنانے میں چلے گئے، یا گھر سے باہر نکلے ہی نہیں؛ تو پھر وہ دوبارہ آپ کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔ اسی طریقہ سے آپ نے اس وارِدِ روحانی کی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے اس مہمان کی قدر نہیں کی؛ تو وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔ حالانکہ وہ تو اس لئے بھیجا گیا تھا کہ آپ کو نیکی کے کام کی طرف متوجہ کرے، اور نیک کام میں لگا کر آپ کی صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے استعمال کرے۔ ہماری خیر خواہی اور ہماری بھلائی ہی کے لئے اس کو بھیجا گیا تھا، اس کے باوجود ہم نے اس کی ناقدری کی؛ تو اب یہ مہمان ایسا جائے گا کہ دوبارہ نہیں آئے گا۔

﴿ایک خاص بات﴾

بہت سے لوگ رات کو نیت کر کے سوتے ہیں کہ تہجد کے لئے اٹھیں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورے طور پر مدد ہوتی ہے کہ جس وقت اس نے اٹھنے کی نیت کی تھی اس وقت آنکھ کھل ہی جاتی ہے۔ ایسا نہیں کہ نہیں کھلتی۔ یا مثلاً الارم لگا دیا تھا اور وہ بجا، اور اس سے واقعتاً اس کی آنکھ بھی کھل گئی، لیکن پھر شیطان نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ آنکھ کھلی تو گویا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لئے راستہ مہیا کر دیا گیا، آپ کی تو آنکھ کھول دی گئی اب آپ کو سُستی نہیں کرنا چاہیے۔

ہم لوگوں کا مزاج اور عادت یہ بنی ہوئی ہے کہ جب آنکھ کھلتی ہے تو سوچتے ہیں کہ

ذرا پانچ منٹ لیٹے رہیں، لیکن سو کر پھر جو آنکھ لگتی ہے، تو ایسی لگتی ہے کہ تہجد تو کیا؛ فجر کی نماز بھی قضاء ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لئے ایک راستہ کھول دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک مہمان ''وارِدِ روحانی''، ہمیں نیکی کے کام کی طرف متوجہ کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن ہم نے اس کی ناقدری کی۔ اب دوسرے دن اگر آپ یہ چاہیں گے کہ اس وقت آنکھ کھلے؛ تب بھی نہیں کھلے گی۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگلے روز جو آنکھ کھلی تھی، اس سے آپ نے کیا فائدہ اٹھایا؟ اور اس کی کیا قدر دانی کی؟ جو ناقدری کی تھی، اس کی سزا یہ مل رہی ہے کہ اب چاہنے کے باوجود بھی آنکھ نہیں کھل رہی ہے۔ اب جب تک توبہ نہیں کریں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے نہیں گڑگڑائیں گے: کہ اے اللہ! تیرے بھیجے ہوئے اس وارِدِ روحانی کی مَیں نے ناقدری کی ہے، میرے اس قصور کو معاف کر دے وہاں تک دوبارہ اٹھنا نصیب نہیں ہوگا۔ دوبارہ اگر اٹھنا ہے تو پہلے صلوٰۃ التوبہ پڑھ کر توبہ کیجیے، اور آئندہ کے لئے یہ عزم کیجیے کہ اب تو آنکھ کھلے گی تو کبھی بھی سُستی نہیں کریں گے، بلکہ آنکھ کھلتے ہی اٹھ کر بیٹھ جائیں گے۔ یہ خاص بات ہے۔

تو یہ وارِدِ روحانی جو ہوا کرتا ہے، اس کی قدر اسی لئے ہونی چاہیے کہ معلوم نہیں دوبارہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ چیز میسر ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر ہم نے ناقدری کر لی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ اسی لئے یہ باب قائم کرتے ہیں: -''باب فی المبادرة الیٰ الخیرات''، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نیکی کے کاموں کی طرف آگے بڑھنا چاہیے جلدی کرنی چاہیے، سبقت کرنی چاہیے۔

﴿بَادَرَ، يُبَادِرُ، مُبَادَرَةً﴾ کا معنٰی ہے آگے بڑھنا اور سبقت کرنا۔ چودھویں رات کے چاند کو ”بدر“ اسی لئے کہتے ہیں ﴿لِمُبَادَرَةِ طُلُوْعِهٖ غُرُوْبَ الشَّمْسِ﴾ اس کی وجہ تسمیہ بتلائی ہے کہ اس کو بدر نام اس لئے دیا گیا کہ چودھویں کا چاند سورج کے غروب ہونے سے پہلے طلوع ہوتا ہے۔ گویا اس کا طلوع سورج کے غروب سے سبقت کر جاتا ہے۔ پندرہویں کا چاند سورج کے غروب کے بعد طلوع ہوگا، وہ اس سے پہلے طلوع ہونے والا نہیں ہے۔ بہر حال! یہ باب قائم کیا ہے نیکی کے کاموں کی طرف آگے بڑھنا، لپکنا، جلدی کرنا اور سبقت کرنا۔

﴿……حاجتِ استخارہ نیست﴾

اور جو آدمی کسی نیکی کے کام کی طرف متوجہ ہو، اس کو بغیر کسی تردد اور پس و پیش کے اور بغیر کسی جھجھک کے نیکی کا وہ کام کر ڈالنا چاہیے، اس میں جھجھک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ در کارِ خیر حاجتِ استخارہ نیست۔ نیکی کے کام میں سوچنے کی اور استخارہ کی ضرورت نہیں ہے نیکی کا کام تو نیکی ہی کا ہے، اس کو تو کر ہی ڈالنا چاہیے۔

اسی لئے باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ نیکی کے کاموں میں آپس میں ریس کرو، مبادرت کرو، سبقت سے کام لو۔

دوسرا ارشاد لائے: ﴿وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ آگے بڑھو اور جلدی سے سبقت کرو اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف؛ جس کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی کے برابر ہے، اور وہ نیک لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

﴿ریس کرنے کی چیزیں یہ ہیں﴾

یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید کی جارہی ہے کہ آدمی کو نیکی کے کاموں میں مبادرت ومسارعت اور عجلت سے کام لینا چاہیے، اس میں دیر اور لیٹ نہیں ہونی چاہیے، اور ساتھ ہی ساتھ اس میں آپ مقابلہ کیجیے۔ ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ فرما کر اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا گیا کہ ریس کرنے کی چیزیں نیکی کے کام ہیں، نہ کہ دنیا۔

کوئی آدمی یوں چاہے کہ فلاں نے اتنی دولت کمالی ہے، تو مَیں بھی اس سے زیادہ کمالوں۔ فلاں نے ایسا بنگلہ بنایا ہے، تو مَیں اس سے اچھا بنالوں۔ فلاں فلانی قسم کی کار لیکر آیا ہے، تو میں اس سے عمدہ کار حاصل کرلوں۔ اس نے ایک فیکٹری قائم کی ہے، تو مَیں اس سے زیادہ قائم کرلوں۔ یہ ریس اور مقابلہ دنیا کی چیزوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دنیا کی چیزیں اس قابل نہیں کہ اس میں آدمی ریس اور مقابلہ کرے؛ بلکہ آخرت کے امور مقابلہ کے قابل ہیں۔

﴿دنیا کے لئے مقابلہ؛ اور آخرت کے لئے؟﴾

ہمارا معاملہ اُلٹ گیا ہے۔ آج کل ہم اگر مقابلہ کرتے بھی ہیں؛ تو دنیا کے امور میں کرتے ہیں۔ دولت کمانے میں، عزت ووجاہت حاصل کرنے میں، جاہ ومرتبہ حاصل کرنے میں، اور دنیا کے ساز وسامان کے لئے آپس میں مقابلہ ضرور کریں گے لیکن آخرت کے اور نیکی کے کاموں کے واسطے مقابلہ نہیں کریں گے۔ حالانکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج ایسا تھا کہ وہ دنیا کے کاموں کے اندر کبھی سبقت کا تصور بھی نہیں کرتے تھے، اور آخرت کے اور نیکی کے کاموں میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔

﴿غزوۂ تبوک کا پس منظر﴾

غزوۂ تبوک ۹ سنہ ھ میں پیش آیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ قیصرِ روم ایک لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ کر رہا ہے، جب آپ ﷺ کو یہ اطلاع ملی، اور جو لوگ شام سے تجارت کے لئے آیا کرتے تھے، انہوں نے بھی بتلایا، اور یہ بھی کہا کہ اس نے اپنے لشکر کو ایک سال کی پیشگی تنخواہ دے دی ہے، اور اس کا ایک حصہ روانہ بھی ہو چکا ہے۔ جب نبی کریم ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سے مقابلہ کے لئے تیاری کا حکم دیا اور آپ نے سوچا کہ وہ یہاں مدینہ تک آئے، اس سے پہلے ہم ہی آگے جا کر اس کا مقابلہ کر کے اس کا راستہ روکتے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ ہمیں اس کے مقابلہ کے لئے جانا ہے۔ حالانکہ آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ تو یہ تھی کہ آپ اگر کسی بھی جگہ حملے کا ارادہ کرتے تھے یا کسی دشمن کے مقابلہ کے لئے جانا چاہتے تھے تو بتلاتے نہیں تھے کہ کہاں جانا ہے۔ صحابہ کو صرف اتنا حکم دے دیا جاتا تھا کہ تیاری کرو اور وہ تیاری کرتے تھے، آپ ﷺ صاف صاف نہیں بتلاتے تھے کہ کہاں جانا ہے۔ اس لئے کہ جنگی مصلحتوں کا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ کہاں کا رخ کیا جانا ہے وہ معلوم نہ ہو؛ تاکہ دشمن اس حملے کے دفاع کی تدبیر نہ کر پائے لیکن غزوۂ تبوک کے موقعہ پر چونکہ دشمن بڑا مضبوط تھا، اور اس کی طرف سے بڑی تیاریاں تھیں؛ تو ضرورت تھی کہ اس سے مقابلہ کے لئے پورے طور پر تیاری کی جائے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے اشارہ و کنایہ سے کام لینے کے بجائے صحابۂ کرام کو صاف صاف بتلا دیا تھا کہ لشکرِ روم کا مقابلہ کرنے کے لئے علاقۂ تبوک کی طرف جانا ہے، اس لئے اس کے مطابق تیاری کی جائے۔

ادھر حال یہ تھا کہ پچھلے سال کھجور کی پیداوار کما حقہٗ ہوئی نہیں تھی اور یہ کھجوروں کے پکنے کا زمانہ تھا۔ یہ زمانہ وہاں شدید گرمی کا ہوتا ہے اور کھجوروں کے پکنے کا خاص موسم ہوتا ہے نیچے سے زمین آگ اگل رہی ہوتی ہے اور اوپر سے آسمان شعلے برسارہا ہوتا ہے۔ اور پھر سب لوگ کھجور کے اپنے باغات کی دیکھ بھال میں مشغول تھے۔ اس لئے کہ ان کی آمدنی کی ساری بنیاد اور دارومدار کھجوروں کے انہیں باغات کے اوپر تھا، اور اس کے پھلوں کے لینے کا وقت آیا؛ تو اِدھر نبی کریم ﷺ کی طرف سے حکم ہوا کہ دشمن کے مقابلہ کے لئے جانا ہے، گویا بڑا آزمائش کا وقت تھا، لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس آزمائش میں بھی پورے اترے۔

حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ریس

اس موقعہ پر سواریوں کی کمی تھی اور ساز و سامان کی بھی کمی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی۔ گویا چندے کا اعلان کیا کہ اللہ کے راستہ میں دو۔ آپ کے اس اعلان کو اور آپ کی طرف سے کی گئی اس اپیل کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں گھر آیا، اُس وقت میری حالت درست تھی، اس لئے گھر میں اپنے پاس جو کچھ بھی تھا؛ اس کے مَیں نے برابر دو حصے کئے، اور ایک حصہ لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ فرماتے ہیں: اس وقت مَیں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی موقعہ پر مَیں ابوبکر سے آگے بڑھ سکتا ہوں؛ تو یہی ایک موقعہ ہے۔ اور میرا خیال یہی تھا کہ آج مَیں اس معاملہ میں ابوبکر سے آگے بڑھ جاؤں گا۔ چنانچہ آدھا مال لاکر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

حالانکہ بہت سے واقعات پڑھے مگر ایسا یاد نہیں پڑتا کہ کسی اور موقعہ پر آپ ﷺ نے

پوچھا ہو کہ کتنا لائے۔لیکن اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نظام ہی تھا،اس لئے حضور ﷺ نے بھی پوچھا: اے عمر! اپنے گھر والوں کے واسطے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! جتنا لایا ہوں؛ اتنا ہی گھر والوں کے لئے چھوڑ کر آیا ہوں۔اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے،اور جو کچھ بھی تھا؛ وہ پیش کیا۔ان سے بھی حضور ﷺ نے پوچھا گھر والوں کے لئے کیا چھوڑ کر آئے؟ انہوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑ کر آیا ہوں، جو کچھ تھا؛ وہ سب لے کر آ گیا ہوں اور حاضرِ خدمت ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ مَیں کبھی بھی حضرت ابوبکر سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

(مغازی الواقدی ۳/۹۹۱۔ابوداؤد شریف، کتاب الزکوۃ، باب الرخصۃ فی الرجل یخرج من مالہ۔حدیث نمبر ۱۶۷۸)

﴿کس چیز میں آگے بڑھنے کی کوشش؟﴾

مَیں بتلانا چاہتا ہوں کہ دیکھئے! یہ حضرات دین کے کاموں میں آپس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے،اگر کبھی ان کا مقابلہ اور ریس ہوتی تھی؛ تو نیکی کے کاموں میں ہوتی تھی۔کبھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ مَیں دولت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے آگے بڑھ جاؤں، یا میرے تجارتی قافلے حضرت عثمان کے قافلوں سے زیادہ ہو جائیں۔کبھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ میرے پاس حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے زیادہ پیسے ہو جائیں۔حالانکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بڑے مالدار سمجھے جاتے تھے۔لیکن کسی صحابی کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ ان حضرات سے ہم دولت وثروت میں یا مال اور پیسوں میں یا ساز وسامان میں آگے بڑھ جائیں؛ ایسا آپ کسی روایت میں نہیں پائیں گے۔ہاں! یہ ضرور ملے گا کہ نیکی کے کاموں میں آگے بڑھنے کا ان حضرات میں جذبہ تھا۔

فقراءِ صحابہ کی ایک جماعت خدمتِ نبوی میں

آپ نے فضائلِ ذکر میں پڑھا ہوگا کہ ایک مرتبہ فقراء کی جماعت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں؛ یہ مالدار بھی نماز پڑھتے ہیں۔ جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں؛ یہ مالدار بھی روزہ رکھتے ہیں۔ اس طرح نیکی کے سارے کام بتلائے۔ پھر عرض کیا کہ یہ لوگ اپنے مال کی وجہ سے صدقات بھی کرتے ہیں اور ہم سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ آپ ہمیں کوئی ایسی تدبیر بتلائیے کہ ہم ان سے آگے بڑھ جائیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر نماز کے بعد ۳۳ رمرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ رمرتبہ الحمد للہ، اور ۳۴ رمرتبہ اللہ اکبر پڑھتے رہو۔ چنانچہ اس کے مطابق انہوں نے عمل شروع کیا۔ ادھر مالداروں کو معلوم ہوا کہ یہ حضرات ایک نسخہ لے کر آئے ہیں؛ تو انہوں نے بھی اس پر عمل شروع کردیا۔ اب وہ غرباء وفقراء پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے کہ یارسول اللہ! انہوں نے بھی اس پر عمل شروع کردیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء﴾ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ (بخاری شریف۔ کتاب الاذان، ۸۴۳)

بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ دیکھئے! ان کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ ہم کو مال مل جائے تو ہم بھی ان کی طرح صدقہ کریں، بلکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اپنی مشکل اور اپنا پیچیدہ مسئلہ پیش کیا تو یوں کہہ کر پیش کیا کہ یارسول اللہ! ثواب میں یہ ہم سے بڑھ جارہے ہیں۔ ان کے پاس مال ہے، اور اپنے مال کے ذریعہ سے صدقہ خیرات کرتے ہیں، اور ہم سے زیادہ ثواب حاصل کرتے ہیں۔ پھر یہ نہیں کہا کہ ایسی دعا کردیجئے کہ ہم کو مال مل جائے، بلکہ یوں کہا کہ یارسول اللہ! کوئی ایسی تدبیر بتلائیے کہ ہم نیکی میں ان سے آگے بڑھ جائیں

بتلانا یہی ہے کہ ان حضرات کا مقابلہ اگر کسی چیز میں تھا، تو وہ نیکی کے کاموں میں تھا۔ کبھی مال ودولت اور ثروت میں یا جاہ وحشمت میں یا ساز وسامان میں یا دنیا کی کسی چیز کے اندر اُن کا مقابلہ ہوا ہو؛ ایسا نہیں ملتا۔ حالانکہ انسانی مزاج ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: انسان کو اگر ایک وادی سونے کی دی جائے تو وہ تمنا کرتا ہے کہ دو ہو جائیں اور دو ہوں تو تین کی تمنا کرتا ہے۔ لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس معاملہ میں ایسے نہیں تھے۔ (بخاری شریف، ۵۹۵۶)

﴿ سبقت کرنے کی چیز اگر کچھ ہے تو...... ﴾

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں اس بات کی تعلیم دی گئی کہ سبقت کرنے کی چیز اگر کچھ ہے؛ تو وہ دنیا، دولت اور پیسہ یا ساز وسامان نہیں ہے، بلکہ سبقت کرنے کی چیز نیکی اور بھلائی کے کام ہیں، اسی کی طرف جلدی کرنے کی تاکید کی گئی ہے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ نیکی کے کاموں میں جلدی سے آگے بڑھو، اس میں ہماری طرف سے کبھی بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے

﴿ آپ زبردستی وقت نکال لیجیے ﴾

جیسا کہ مَیں نے عرض کیا کہ نفس اور شیطان ہمارے دشمن ہیں، وہ تو ہمیں کسی نہ کسی طریقہ سے مختلف تدبیروں کے ذریعہ نیکی کے کاموں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں، لہٰذا اگر کسی نیک کام کا خیال پیدا ہو جائے، تو یوں نہ سوچنا چاہیے کہ یہ کام پورے ہو جائیں، اس کے بعد کریں گے۔ اس لئے کہ اس کی نوبت تو آنے والی ہی نہیں۔ کیونکہ آپ کا تو ایک نظام الاوقات بنا ہوا ہے، اگر آپ یہ سوچیں گے کہ اس کے بعد وقت ملے گا؛ تو کریں گے، تو وقت تو ملنے والا ہی نہیں ہے۔ آپ زبردستی وقت نکال لیجیے، یعنی جو دو کام پہلے سے کر رہے ہیں، اس میں تیسرا کام گھسا دیجیے، خود بخود وہ بھی ہو جائے گا۔ اور اگر اس انتظار میں رہیں

گے کہ ہمیں وقت ملے گا؛ تو کریں گے، تو ایسا وقت تو کبھی ملنے والا ہے ہی نہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہیے کہ نیکی کے کام میں خوب عجلت سے کام لے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا ہوا زندگی کا یہ قیمتی سرمایہ دوبارہ ملنے والا نہیں ہے۔ اس لئے جتنے بھی زیادہ سے زیادہ نیکی کے کام کر سکتا ہو، اس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، اور ان کی انجام دہی میں عجلت سے کام لینا چاہیے

﴿نفس کو دھوکہ دو﴾

اگر نفس یا شیطان دھوکہ دے کر نیکی کے کام سے روکنے کی کوشش کرتے ہوں، تو حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جس طرح نفس ہمیں دھوکہ دیتا ہے ہمیں بھی نفس کو دھوکہ دینا چاہیے۔ وہ کس طرح؟ نفس ہمیں دھوکہ دیتا ہے کہ کریں گے، کریں گے؛ تو ہم نفس کو دھوکہ دے کر اس سے وہ کام کروالیں۔ پھر وہ اپنا قصہ بیان کرتے ہیں کہ:-

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ رات کو آنکھ کھلی، تہجد کا معمول تو تھا ہی، لیکن اس روز طبیعت بھی کچھ خراب تھی، اس کی وجہ سے جی میں یہ خیال آیا کہ آج طبیعت بھی خراب ہے اور اتنی مدت سے تو پڑھ ہی رہے ہیں اور تہجد کی نماز کوئی فرض اور واجب تو ہے نہیں، اگر کسی روز نہیں پڑھیں گے؛ تو کیا ہو جائے گا؟ گویا نفس یہ چاہتا تھا کہ آج سلائے رکھے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مَیں نے نفس سے یوں کہا کہ دیکھو! یہ بڑا قیمتی وقت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس وقت خاص اعلان ہوتا ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ رات کا آدھا حصہ جب گذر جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتیں دنیا والوں کی طرف متوجہ ہوتی ہیں، اور اعلان کیا جاتا ہے: ﴿هَلْ مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهُ﴾ ہے کوئی مغفرت چاہنے والا کہ مَیں اس کی مغفرت کروں؟ ہے کوئی عافیت طلب

کرنے والا کہ مَیں اس کو عافیت دوں؟ (بخاری شریف، کتاب التہجد، ۱۱۴۵) اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ یہ اعلان کیا جاتا ہے۔اس لئے کم سے کم بستر پر بیٹھ کر تھوڑی دیر دو چار منٹ دعا تو کرلیں۔ جب آنکھ کھلی ہے تو اس کو ضائع کیوں کیا جائے۔حضرت فرماتے ہیں کہ اس طرح سوچ کر مَیں بیٹھ گیا اور دعا کرنے لگا۔دعا کرتے کرتے پھر یوں سوچا کہ اب اٹھ ہی گئے ہیں اور نیند کھل ہی چکی ہے،تو ذرا استنجاء اور قضائے حاجت بھی کرلیں۔استنجاء کے لئے گئے۔استنجاء کرنے کے بعد کہا کہ اب استنجاء کے لئے آئے ہیں تو وضو بھی کرلو۔وضو کرنے کے بعد بستر پر آکر دعا کرنے کے لئے بیٹھے تو پھر یوں سوچا کہ جب وضو کر ہی لیا ہے؛ تو اب یہاں بستر پر بیٹھ کر دعا کرنے کے بجائے اپنی روزانہ کی جگہ مصلے پر جا کر دعا کیوں نہ کی جائے۔چنانچہ وہاں پہنچے تو کہا کہ دو رکعت پڑھ لیں۔جب دو پڑھ لی تو کہا کہ روزانہ جتنی پڑھتے ہیں؛ اتنی پوری ہی کرلیں۔

دیکھو! مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ ہمیں بہلا پھسلا کر نیکی کے کاموں سے روکنے کی کوشش کرتا ہے؛ ہم بھی بہلا پھسلا کر اور دھوکہ دے کر اس سے نیکی کے کام کروالیں،اس طرح معاملہ برعکس ہونا چاہیے۔

﴿ڈاکٹر صاحب نے اس طرح نفس کو آمادہ کیا﴾

حضرت ڈاکٹر صاحب نے اپنا ایک اور قصہ بیان کیا۔ان کا معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ڈیڑھ، دو گھنٹہ تسبیحات و تلاوت وغیرہ میں مشغول رہتے تھے،اس کے بعد دوسرے کاموں میں لگتے تھے۔ایک روز طبیعت میں کسل مندی ہونے کی وجہ سے جی چاہا اور نفس نے یوں کہا کہ نماز کے بعد تھوڑی تلاوت کرلی،اب آج تو سو ہی جائیں گے۔حضرت فرماتے ہیں

کہ مَیں نے نفس سے یوں کہا: دیکھو! ٹھیک ہے، سو جائیں گے، لیکن اگر اس وقت ہمارے پاس سربراہِ مملکت اور وزیر اعظم کی طرف سے یہ پیغام پہنچے کہ ابھی اسی وقت ہمارے یہاں آ جایئے، ہم آپ کو ایک انعام سے نوازنا چاہتے ہیں؛ تو کیا اس وقت بھی تو سُستی کرے گا؟ اور یوں کہے گا کہ ابھی تھوڑا سونا ہے، اور طبیعت آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ ایسا نہیں کہے گا بلکہ جب یہ معلوم ہوگا کہ سربراہِ مملکت اور وزیر اعظم کی طرف سے مجھے یہ پیغام دیا گیا ہے اور بلایا گیا ہے، تو اس وقت چاہے کتنی ہی سستی کیوں نہ ہو، سب کام چھوڑ چھاڑ کر فوراً اس کے پاس پہنچ جائے گا کہ جب وہ مجھے نوازنا چاہتا ہے تو مَیں ہی کیوں انکار کروں۔ جب دنیا کے کسی سربراہِ مملکت کی طرف سے پہنچنے والے پیغام پر تم ساری سُستی چھوڑ کر فوراً حاضری کی کوشش کروگے تو یہ جو اللہ تعالیٰ کی تسبیحات پڑھی جائیں گی، یہ بھی گویا اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری ہی ہے، اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات سے نوازا جائے گا۔ کیا تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے جانے والے انعامات؛ اس سربراہِ مملکت کے انعام جتنی بھی حیثیت نہیں رکھتے یوں کہہ کر اپنے آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ مجھے روزانہ کے معمولات میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے

﴿......اور آپ کو استقامت نصیب ہو جائے گی﴾

بتلانا یہ چاہتا تھا کہ جس طرح ہمارا نفس کسی نہ کسی طریقہ سے ہمیں روکنے کی کوشش کرتا ہے، ہم بھی بہلا پھسلا کر اس کو آمادہ کر کے اس سے نیکی کے کام کروالیں۔ اگر اس طرح کا مزاج بنالیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ آسانی ہو جائے گی، پھر آئندہ دھیرے دھیرے نفس و شیطان کی قوت کم ہوتی جائے گی اور ٹوٹتی جائے گی۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ آسانی کے ساتھ آپ نیک کام کرسکیں گے اور آپ کو استقامت نصیب ہو جائے گی۔

باقی اگر نفس وشیطان کے مقابلہ میں اسی طرح چت ہوتے رہے، اوران کی بات مان کرسب کام چھوڑتے رہے؛ تو کبھی بھی استقامت نصیب ہونے والی نہیں ہے۔اس لئے فرمایا کہ نیکی کی طرف سبقت کرنی چاہیے،اس میں سُستی نہیں کرنی چاہیے۔

﴿اندھیری رات کے ٹکڑے﴾

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ الصَّالِحَةِ، فَسَتَكُوْنُ فِتَنٌ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ، يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِی كَافِرًا، أَوْيُمْسِی مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا، يَبِيْعُ دِيْنَهُ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْيَا. (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا: نیک کام کرنے میں جلدی کرو،ان فتنوں کے آنے سے پہلے جواندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح ہوں گے۔ مثلاً رات جب شروع ہوئی اورآدمی کوئی کام کرنا چاہتا ہے،تواس وقت اگرکوئی یوں سوچے کہ ذرا اُجالا ہوجائے گا پھرکریں گے۔توظاہر ہے کہ رات کاایک حصہ پوراہونے کے بعددوسرا جو حصہ آنے والا ہے اس میں اجالاتو کیا ہوگا، پہلے سے جواندھیرا ہے اس میں اور بھی اضافہ ہوجائے گا،اس کی سیاہی اور بڑھ جائے گی۔توجیسے اندھیری رات کے ٹکڑے ہوتے ہیں کہ ہر بعدمیں آنے والاٹکڑااپنی سیاہی اوراندھیرے پن میں پہلے والے ٹکڑے کے مقابلہ میں بڑھا ہواہوتاہے،ایسے ہی بعدمیں آنے والاہرفتنہ پچھلے فتنے سے زیادہ خطرناک ہوتاہے،ایسے فتنوں کے آنے سے پہلے پہلے نیک اعمال کےاندرجلدی کرنی چاہیے۔

اوروہ فتنے ایسے ہوں گے کہ آدمی صبح ایمان والی حالت میں کرے گااورشام کے وقت وہی اپناایمان چھوڑکرکافرہوجائے گا﴿أَوْيُمْسِی مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا﴾ یاشام ایمان کی حالت میں کرے گااورصبح اٹھتے اٹھتے وہ کافرہوجائے گا۔

﴿صبح کو مؤمن، شام کو کافر﴾

صبح کو مؤمن تھا اور شام کو کافر اور شام کو مؤمن تھا اور صبح ہوتے ہوتے کافر ہو جائے گا۔ یہ کیسے بنے گا؟ اتنا بڑا انقلاب اور تبدیلی کیسے آ گئی؟ فرماتے ہیں: ﴿یَبِیۡعُ دِیۡنَہٗ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنۡیَا﴾ وہ اپنے دین کو دنیا کے کچھ سامان کی خاطر بیچ ڈالے گا۔

ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی کے مزاج میں ٹال مٹول والی کیفیت ہوتی ہے، اور نیکی کے کاموں میں تاخیر اور دیر کرنے لگتا ہے، ٹال مٹول کرتا ہے؛ تو وہی مزاج ایسے موقعہ پر غالب آتا ہے۔ پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں ایسا لگ جاتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں حلال وحرام کی تمیز نہیں رہتی۔ چونکہ جب وہ نیکی کے کاموں کے بجائے دنیا کے ساز وسامان کے لئے ریس اور مقابلہ کرتا ہے؛ تو یہ بھی نہیں دیکھتا کہ مَیں دنیا کا جو کچھ سامان یا دولت حاصل کرر ہا ہوں، وہ حلال طریقہ سے آ رہی ہے یا حرام طریقہ سے مل رہی ہے؟ اس لئے حلال وحرام کی تمیز کے بغیر اس میں لگ جاتا ہے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اگر آزمائش کا ایسا وقت آیا کہ اس کے سامنے دو راستے رکھے گئے کہ یہ چیز آپ کو دی جاتی ہے، بشرطیکہ آپ اپنے دین سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ یا اگر دین کے اوپر قائم رہنا چاہتے ہیں تو یہ چیز آپ کو نہیں ملے گی، اس صورت میں جو ٹال مٹول والا مزاج بنا رکھا ہے، اس کی وجہ سے وہ یوں سوچتا ہے کہ ابھی تو موت آنے والی نہیں ہے، اور زندہ کر کے دوبارہ اٹھایا نہیں جار ہا ہوں ابھی مَیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش نہیں کیا جار ہا ہوں، ابھی تو بہت مہلت ہے، اس وقت یہ چیز لے لو، اگر دین میں کوئی کوتاہی آ رہی ہے تو بعد میں پھر اس کی تلافی کر لیں گے۔ وہی کل والے مزاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وجہ سے جب ایمان پر بھی زد پڑی، تو وہ اس زد کو یوں سوچ

کر برداشت کرلیتا ہے کہ کل ہم اس کی تلافی کرلیں گے۔ابھی تک تو نیکی کے کام میں ٹال مٹول تھی؛اب ایمان پر آنے والی زد کو روکنے کی بھی اس میں ہمت نہیں ہے۔اور دنیا کا سامان دولت اور جو کچھ بھی حاصل کرنا چاہتا تھا،اس کی لالچ میں پڑ جاتا ہے،اوراس لالچ کے نتیجہ میں ایسا آگے بڑھتا ہے کہ اپنے دین کو ان چیزوں کے عوض میں فروخت کر دیتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔

دنیا کی طلب اورحرص اور دنیا کے حاصل کرنے کے لئے جو مقابلہ اور ریس کی تھی، اس کے نتیجہ میں وہ اپنے آپ کو ایمان سے محروم کرلیتا ہے۔اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خاص تاکید کی گئی کہ مقابلہ اور ریس کی چیز دنیا کی چیزیں نہیں ہیں؛ بلکہ آخرت کے اموراور نیکی کے کام ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے

المبادرة الیٰ الخیرات

نیکی کی طرف لپکنا

مجلس ﴿۲﴾

۸/صفر المظفر ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۴/ جون ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أما بعد:—

عن أبی سِرْوَعَۃَ عقبۃَ بْنِ الْحَارِثِ رضی اللہ عنہ قَالَ: صَلَّیْتُ وَرَآءَ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم بِالْمَدِیْنَۃِ الْعَصْرَ، فَسَلَّمَ ثُمَّ قَامَ مُسْرِعاً، فَتَخَطّٰی رِقَابَ النَّاسِ اِلٰی بَعْضِ حُجَرِ نِسَآئِہٖ، فَفَزِعَ النَّاسُ مِنْ سُرْعَتِہٖ، فَخَرَجَ عَلَیْھِمْ، فَرَأٰی أَنَّھُمْ قَدْ عَجِبُوْا مِنْ سُرْعَتِہٖ. قَالَ: ذَکَرْتُ شَیْئاً مِّنْ تِبْرٍ عِنْدَنَا، فَکَرِھْتُ أَنْ یَحْبِسَنِیْ، فَأَمَرْتُ بِقِسْمَتِہٖ. (رواہ البخاری)

وفی روایۃ لہ: کُنْتُ خَلَّفْتُ فِی الْبَیْتِ تِبْراً مِنَ الصَّدَقَۃِ، فَکَرِھْتُ أَنْ أُبَیِّتَہٗ.

نیکی میں جلدی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ

پچھلی مجلس میں بتلایا تھا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب اس بات کو بتلانے کے لئے قائم کیا ہے کہ آدمی کو نیکی کے کاموں میں سرعت اور جلدی سے آگے بڑھنا چاہیے، اور اس میں سبقت، مقابلہ اور ریس ہونی چاہیے۔ آدمی کو جب نیکی کے کام کا ارادہ وخیال آئے تو اس کو ٹلاوے نہیں، بلکہ جہاں ارادہ ہوا کہ فوری طور پر اس کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کرے، اور اس میں جتنی عجلت اور جلدی ہوسکے؛ کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ موقعہ ہاتھ سے نکل جائے اور جو ارادہ اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈالا ہے، وہ دل سے ہٹ جائے یا وہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت عطا فرمائے ہیں؛ وہ میسر نہ آویں۔

حضرت ابوسروعہ عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے مدینہ منورہ میں عصر کی نماز پڑھی، جب آپ نے سلام پھیرا تو آپ خلافِ عادت جلدی سے اٹھے اور لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتے ہوئے ازواجِ مطہرات میں سے کسی ایک کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ یعنی لوگوں کے اٹھنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ آپ ﷺ کی اس جلدی اور تیزی کو دیکھ کر صحابۂ کرام گھبرائے۔ اس لئے کہ جب کبھی ایسی کیفیت دیکھتے تھے تو ان کو خیال آتا تھا کہ معلوم نہیں کیا صورت پیش آئی؟ ایسا کیوں ہوا؟ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ان کو بہت زیادہ محبت تھی، شدتِ تعلق اور شدتِ محبت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد حضور ﷺ حجرۂ شریفہ سے باہر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ میرے اس طرح جلدی سے نکلنے کی وجہ سے صحابۂ کرام کو تعجب ہو رہا ہے کہ ایسا کیوں ہوا، اور کیا بات ہوئی؟ آپ ﷺ نے ان کی اس پریشانی اور تعجب کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ اصل میں نماز کے دوران مجھے یاد آیا کہ گھر کے اندر سونے کے کچھ ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں، تو میں نے اس بات کو ناپسند سمجھا کہ سونے کے یہ ٹکڑے مجھے روک لیں۔ یعنی کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے خرچ کرنے میں تاخیر ہو جائے، لہٰذا سلام پھیرتے ہی میں جلدی سے اٹھ کر گھر میں گیا اور یہ کہہ کر آیا کہ اس کو جلدی سے اللہ کے راستہ میں صدقہ کر دو۔

دیکھئے! یہاں نبی کریم ﷺ کو یاد آیا کہ گھر میں مال اور سونے کے ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں اور ایک خیال آیا کہ ان کو صدقہ کر دینا چاہیے، چونکہ اس وقت تو آپ نماز میں تھے، اس حالت میں تو آپ نہیں جاسکتے تھے، اس لئے سلام پھیرتے ہی بلا کسی تاخیر کے لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتے ہوئے آپ وہاں سے تشریف لے گئے۔ کتنی عجلت سے کام لیا۔ ویسے تو

لوگوں کی گردنوں کو پھلانگنے کو پسندیدہ قرار نہیں دیا ہے۔

روایتوں میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جمعہ کے دن اگر کوئی آدمی آگے جگہ نہ ہونے کے باوجود لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھے گا؛ تو کل قیامت میں اس کو جہنم کے اندر جانے کے واسطے پل بنایا جائے گا۔ (ترمذی شریف، کتاب الجمعۃ، ۵۱۳)

﴿ ......پھر اپنے دوسرے تقاضوں کو نہ دیکھے ﴾

یہاں نبی کریم ﷺ نے اس کا بڑا اہتمام فرمایا کہ باوجود اس کے کہ ابھی لوگ اٹھے نہیں تھے، آپ نے تیزی سے گھر میں جا کر مال اور سونے کو خرچ کرنے کا حکم دیا۔ معلوم ہوا کہ آدمی کے دل میں جب نیکی کے کام کا خیال وارادہ پیدا ہو؛ تو پھر اپنے دوسرے تقاضوں کو نہ دیکھے۔ یوں نہ سوچے کہ فلاں کام سے فارغ ہو جاؤں، ابھی یہ کام نمٹ جائے اس کے بعد یہ کروں گا۔ یا آج کا دن گذر جائے؛ کل یہ کریں گے، پرسوں کریں گے۔ اس کام سے فراغت ہو جائے، ذرا مہلت مل جائے، پھر کریں گے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں ایسی مہلت کو نہیں دیکھا جاتا۔ وہ حضرات تو اپنے طبعی تقاضوں کو بھی پورا کرنے کو گوارا نہیں کرتے تھے، بلکہ طبعی تقاضہ سے پہلے اس نیکی کے تقاضہ پر عمل کرتے تھے؛ تا کہ اس میں ذرہ برابر تاخیر نہ ہو۔

پچھلی مجلس میں روایت آئی تھی: ﴿بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ﴾ جس میں بتلایا تھا کہ آدمی کو اعمالِ خیر میں سبقت اور جلدی کرنی چاہیے۔ ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ اور ﴿وَسَارِعُوا إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ بھی آیا تھا۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے اس پر ایک عملی نمونہ بھی پیش فرما دیا۔

﴿ یہاں تک کہ شہید ہو گئے ﴾

عن جابر رضی اللہ عنہ قال: قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ أُحُدٍ: أَرَأَيْتَ إِنْ قُتِلْتُ، فَأَيْنَ أَنَا؟ قَالَ: فِي الْجَنَّةِ. فَأَلْقَىٰ تَمَرَاتٍ كُنَّ فِي يَدِهِ، ثُمَّ قَاتَلَ حَتّٰى قُتِلَ.

دوسری روایت لاتے ہیں اس میں ایک صحابی کا عمل بتلایا گیا ہے۔

یہ واقعہ غزوۂ احد کے موقعہ کا ہے۔ ۳ھ میں مسلمانوں اور کفارِ قریش کے درمیان ایک جنگ ہوئی ہے۔ کفارِ قریش ایک لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے کے لئے آئے تھے، نبی کریم ﷺ ان کے دفاع کے واسطے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر مدینہ منورہ سے باہر تشریف لائے، کفار کے لشکر کی تعداد تین ہزار تھی، تعداد کے لحاظ سے بھی یہ بڑھے ہوئے تھے، سازوسامان اور قوت وطاقت کے اعتبار سے بھی یہ بڑھے ہوئے تھے۔ جنگ کے موقعہ پر مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر مَیں اس جنگ میں حصہ لوں اور دشمن کے ہاتھوں مارا جاؤں؛ تو میرا انجام کیا ہوگا، مَیں کہاں جاؤں گا؟

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ وہ ایک سیاہ فام حبشی آدمی تھا اور اس نے آکر یہ بھی عرض کیا کہ میرا رنگ کالا ہے اور میرے جسم میں سے بدبو بھی آتی ہے، لیکن اگر مَیں اس جنگ کے اندر حصہ لوں، دشمنوں سے مقابلہ کروں اور مارا جاؤں؛ تو میرے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا بدلہ ہوگا؟ ﴿فَأَيْنَ أَنَا؟﴾ مَیں کہاں جاؤں گا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿فِي الْجَنَّةِ﴾ راوی کہتے ہیں: جب آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا اس وقت ان صحابی کے پاس کچھ کھجوریں تھیں جو کھا کر وہ اپنی بھوک مٹا رہے تھے، ایسا نہیں کہ شوقیہ کھا رہے تھے، بلکہ ان حضرات کو عام طور سے فقر وفاقہ کی وجہ سے کوئی چیز میسر نہیں ہوتی تھی، جب ایسی کوئی چیز ہاتھ میں آجاتی تو اسی کے ذریعہ سے اپنی بھوک کو دور کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس بھی اس وقت کھجوریں تھیں اور ان کے ذریعہ سے وہ اپنی بھوک کو مٹا رہے تھے لیکن جب حضور ﷺ سے یہ سنا کہ تم جنت میں جاؤ گے، تو وہ کھجوریں جو ہاتھ میں تھیں، وہیں پھینک دیں اور دشمن کے مقابلہ میں آگے بڑھے؛ یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ (مستدرک حاکم، ۲۴۱۹)

﴿اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کی﴾

یہاں صحابی کا یہ جذبہ دیکھنے کے قابل ہے کہ بھوک ایک طبعی تقاضہ ہے، آدمی اس کی خاطر بہت سارے کام مؤخر اور لیٹ کر دیا کرتا ہے، سوچتا ہے کہ پہلے کھالیں پھر بعد میں دیکھی جائے گی۔ لیکن یہاں نبی کریم ﷺ کے اس جواب پر- کہ اگر تم اس جنگ میں مارے گئے تو جنت میں جاؤ گے- ان کے دل میں ایک کارِ خیر کا ارادہ پیدا ہوا، تو انہوں نے اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کی کہ ہاتھ میں جو دو چار کھجوریں ہیں، وہ کھا کر بھوک کو دور کر لیں، اس کے بعد آگے بڑھیں گے اور دشمن کا مقابلہ کریں گے۔

بلکہ بعض روایتوں میں یوں آتا ہے کہ ان کھجوروں کو پھینکتے ہوئے انہوں نے کہا: اگر مَیں ان کھجوروں کے کھانے میں رہوں گا تو یہ بڑے انتظار کی بات ہے یعنی جب نبی کریم ﷺ فرما رہے ہیں کہ اگر مَیں شہید ہو گیا تو جنت میں جاؤں گا، اب جنت حاصل کرنے کے لئے اتنی تاخیر اور انتظار کیوں کروں کہ پہلے کھجوریں کھالوں۔ چنانچہ وہ کھجوریں پھینک دیں، آگے بڑھے اور شہید ہو گئے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کو بتلایا گیا تو آپ ان کی نعش کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ تیرا منھ سفید کر دے اور تیری بدبو کو خوشبو سے بدل دے۔ (مستدرک حاکم، ۲۴۱۹)

﴿تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ روایت اس بات کو بتلانے کے لئے لائے ہیں کہ دیکھئے! ان صحابی کے دل میں کارِ خیر کا اور اللہ کے راستہ میں جہاد کر کے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے کا ایک جذبہ پیدا ہوا؛ تو جان قربان کرنے کے لئے بھی ایک منٹ کی تاخیر کو انہوں نے گوارا

نہیں کیا۔ حضور ﷺ کا جواب سنتے ہی فوراً وہ کھجوریں بھی پھینک دیں اور آگے بڑھے۔

یہ ان کا ایک حال تھا اور ایک ہمارا حال ہے کہ ہمارے دل میں جب کبھی کارِ خیر کا کوئی خیال آتا ہے، جذبہ وداعیہ پیدا ہوتا ہے؛ تو کیا اس داعیہ پر ہم اتنی عجلت اور جلدی سے عمل کر ڈالتے ہیں؟ یا ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس داعیہ کو دور کیا جائے؟ ٹلانے کی کوشش ہوتی ہے:۔

تھے تو وہ آباء تمہارے ہی مگر تم کیا ہو ❁ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

دیکھئے! اوپر کی روایت میں نبی کریم ﷺ کا عمل بتلایا تھا۔ حالانکہ آپ کو تو کارِ خیر سے کوئی چیز نہیں روک سکتی تھی، آپ تو دنیا کے لئے نمونہ بنا کر ہی بھیجے گئے تھے، وہاں تو اس بات کا احتمال نہیں تھا کہ آپ جس کارِ خیر کا ارادہ کریں گے وہ رہ جائے گا اور آپ نہیں کر پائیں گے۔ اس کے باوجود حضور اکرم ﷺ نے اپنے عمل سے یہ بتلا دیا کہ نماز میں ایک چیز یاد آئی تو سلام پھیرتے ہی کسی اور چیز کا انتظار کئے بغیر فوراً تشریف لے گئے اور سونے کے ٹکڑوں کو خرچ کرنے کا حکم دے دیا۔ حضور ﷺ کا عملی نمونہ بھی ہمارے سامنے پیش کیا۔ اور اس کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عملی نمونہ بھی پیش کیا کہ ان حضرات کے دلوں میں جب کوئی نیکی کا داعیہ پیدا ہوتا تھا، کسی نیک کام کا جذبہ اور خیال آتا تھا تو اس پر عمل کرنے میں ذرہ برابر بھی تاخیر گوارا نہیں کرتے تھے، بلکہ جلدی کرتے تھے۔

جیسا کہ مَیں پہلے بتلا چکا ہوں کہ جلدی ہی کرنی چاہیے، اس لئے کہ معلوم نہیں کہ یہ خیال وداعیہ اور ارادہ جو دل میں آیا ہے، وہ باقی رہتا ہے یا نہیں رہتا۔ یا اگر باقی بھی رہا تو بعد میں ہمارے لئے اس کے اسباب بھی مہیا ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے۔ اس لئے نیکی کے کسی کام میں ذرہ برابر بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔

کون سے صدقہ کا ثواب زیادہ ہے؟

عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال: جَاءَ رَجُلٌ اِلیٰ النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! أَیُّ الصَّدَقَةِ أَعْظَمُ أَجْراً؟ قَالَ: أَنْ تَصَدَّقَ وَأَنْتَ صَحِیْحٌ شَحِیْحٌ، تَخْشَی الْفَقْرَ وَتَأْمُلُ الْغِنَی، وَلَا تُمْهِلُ، حَتّٰی اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ، قُلْتَ لِفُلَانٍ کَذَا وَلِفُلَانٍ کَذَا وَقَدْ کَانَ لِفُلَانٍ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک آدمی نے آکر نبی کریم ﷺ سے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! کون سا صدقہ ایسا ہے جس میں ثواب زیادہ ملتا ہے؟ یعنی اللہ کے راستہ میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے اس میں کون سا مال خرچ کرنا ایسا ہے جس میں ثواب زیادہ ملے گا حضور اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا: تم اللہ کے راستہ میں ایسی حالت میں مال خرچ کرو کہ تم تندرست ہو۔ یعنی تمہاری تندرستی برقرار ہے، صحت بحال ہے، جس کی وجہ سے آئندہ تمہیں امید ہے کہ میں ابھی جلدی سے مرنے والا نہیں ہوں۔ اس لئے کہ آدمی کی صحت اور تندرستی ٹھیک ٹھاک ہوتی ہے تو اس کو غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ میں اپنی عمرِ طبعی تک پہنچوں گا گویا ابھی کوئی ایسے آثار نظر نہیں آتے کہ میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں، تمہاری یہ تندرستی اس بات کی خبر دے رہی ہے اور تمہارے دل میں یہ خیال پیدا کر رہی ہے کہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ساٹھ ستّر سال کی ایک عمرِ طبعی مقرر کی گئی ہے، وہ پوری کر کے رہو گے ایک تو تندرستی کی وجہ سے آدمی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ میں آگے زندہ رہنے والا ہوں، اور جب آدمی کو یہ خیال ہو کہ میں آئندہ زندہ رہوں گا تو پھر ساتھ ہی اس کے دل میں بخل بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔

جیسے ایک آدمی سفر میں گیا ہو اور کچھ رقم ساتھ لے گیا ہو اور اس کو معلوم ہو کہ ابھی مجھے

کچھ دن سفر میں گذارنے ہیں تو اس رقم کو استعمال کرنے میں وہ بڑی احتیاط سے کام لے گا، ادھر اُدھر ضائع نہیں کرے گا۔ اسی طریقہ سے آدمی کو جب خیال ہے کہ ابھی مَیں تندرست ہوں، مجھے اور زندہ رہنا ہے، ابھی تو میری زندگی کے بیس، پچیس سال ہوئے ہیں، گویا ابھی تو مجھے زندگی کے اور تیس چالیس سال نکالنے ہیں، تو اس صورت میں اس کا نفس اس کو ترغیب دیتا ہے کہ جب تمہیں زندہ رہنا ہے تو پھر پیسوں میں بچت کرو، آڑے وقت میں کام آئیں گے۔ اگر ابھی خرچ کرتے رہو گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پیسہ ہاتھ سے نکل جائے، اور پھر اگر ضرورت پیش آ گئی تو اس وقت پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی و دشواری کا سامنا ہو۔

﴿ہماری کفایت شعاری﴾

حضور ﷺ فرماتے ہیں: ﴿أَنْ تَصَدَّقَ وَأَنْتَ صَحِيحٌ شَحِيحٌ﴾ تم ایسی حالت میں صدقہ کرو کہ تندرست ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارے دل میں اس تندرستی کی وجہ سے ایک داعیہ پیدا ہوا ہے کہ خرچ کرنے میں ذرا احتیاط اور کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے۔ ہم لوگ اس بخل کو کفایت شعاری سے تعبیر کرتے ہیں کہ اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کرتے ہوئے کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے۔

﴿تَخْشَى الْفَقْرَ﴾ تم کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر خرچ کردو گے: تو مال ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور جب ابھی ہاتھ سے مال نکل جائے گا تو جب ضرورت پیش آئے گی اس وقت کیا کریں گے۔ ﴿وَتَأْمُلُ الْغِنٰى﴾ اور تم کو آئندہ امید و تمنا ہے کہ کچھ پیسہ پاس میں جمع ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ آدمی کو جب یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھے اور زندہ رہنا ہے تو وہ اپنی آئندہ زندگی میں راحت و آرام حاصل کرنے کے لئے، عیش اور راحت کے اسباب مہیا کرنے کے

واسطے؛ زیادہ سے زیادہ پیسہ حاصل کرنے کی اور پیسہ جمع کر کے محفوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ ایسے زمانہ میں اگر تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو گے کہ تمہارا نفس تم کو خرچ کرنے سے روک رہا ہے؛ تو ثواب زیادہ ہے۔

جیسی ڈیمانڈ؛ ویسا بھاؤ

ہم دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ ہر چیز کے لئے ایک زمانہ ہوتا ہے۔اس خاص زمانہ میں اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے، دوسرے زمانہ میں اس کی قدر و قیمت اتنی نہیں رہتی۔ مثلاً ریفریجریٹر اور ایرکنڈیشنر ہے۔گرمی کے زمانہ میں اس کے بھاؤ بڑھ جاتے ہیں۔اس لئے کہ اس کی ضرورت اور تقاضہ ہے۔اور ایک موسم ایسا بھی آتا ہے کہ اس کی وہ قدر و قیمت نہیں رہتی جو گرمی کے زمانہ میں ہوتی ہے۔

اس کے برعکس گرم لباس ہے۔سردی میں اس کا بھاؤ بڑھ جائے گا، گرمی میں اگر کوئی آدمی گرم سوئٹر لے کر آئے گا تو آپ اس کی طرف کوئی دھیان وتوجہ نہیں دیں گے۔ معلوم ہوا کہ دنیا کا بھی ایک دستور ہے کہ ہر چیز کی اپنے اپنے وقت پر قدر و قیمت ہوتی ہے، اور ایک خاص زمانہ میں اس کی قیمت بڑھ جایا کرتی ہے۔تو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنا نیکی ہی کا کام ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔آپ جب بھی خرچ کریں گے اس پر ثواب مل کر رہے گا۔لیکن دیکھنا یہ ہے کہ بھاؤ کب زیادہ ملے گا۔

ویسے دنیا کے اندر ہمارا دستور تو یہ ہے کہ کوئی بھی چیز ہو، اس کو زیادہ بھاؤ کے لئے روکے رکھتے ہیں۔ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے پاس جو بھی چیز ہے اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت ملے۔اب اگر ہم اللہ کے راستہ میں خرچ کر کے اجر وثواب حاصل کرنا چاہتے

ہیں؛ تو پھر اس انداز سے خرچ کرنا پڑے گا کہ زیادہ سے زیادہ ثواب ملے۔ اور نبی کریم ﷺ نے اس کا طریقہ یہ بتلایا کہ اگر آپ اللہ کے راستہ میں خرچ کر کے زیادہ ثواب حاصل کرنا چاہتے ہیں؛ تو اس کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہے جبکہ تم تندرست ہو اور ساتھ ہی آئندہ زندہ رہنے کی تمنائیں تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہوں۔ ایسے موقعہ پر خرچ کرنے میں آدمی بخل سے کام لیتا ہے، حالانکہ ایسے وقت میں تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو گے؛ تو ثواب زیادہ ملے گا۔

﴿فلاں کو اتنا اور فلاں کو اتنا﴾

باقی خرچ کرنے کی ایک شکل وہ بھی ہے جو آگے بتلا رہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿وَلَا تُمْهِلْ﴾ ڈھیل مت کرنا اور ٹلانا مت۔ یعنی اس زمانہ میں خرچ کرنے کے لئے حضور ﷺ نے بتلایا کہ جب تندرستی ہے اور تمہارے قویٰ بحال ہیں اور آئندہ زندہ رہنے کی توقعات تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہیں؛ ایسے موقعہ پر خرچ کرنا چاہیے۔ اور خرچ کرنے میں ڈھیل مت کرنا اور ٹال مٹول مت کرنا؛ ورنہ آدمی کی روح نکلتے ہوئے جب گلے میں پہنچتی ہے تو پھر وہ وصیتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں کو اتنا دیجیو، مدرسہ میں اتنا، اور مسجد میں اتنا، اور فلاں جگہ اتنا، اور فلاں جگہ اتنا دینا۔ حالانکہ وہ جن کا حق تھا ان کے لئے ہو چکا۔

﴿ایک ضروری مسئلہ﴾

ایک بات یاد رہے کہ آدمی جب مرض الوفات میں مبتلا ہوتا ہے تو اس بیماری میں پہنچتے ہی اس کے مال میں ورثاء کا حق لگ جاتا ہے۔ اگرچہ ورثاء ابھی تقسیم نہیں کر سکتے، لیکن اب وہ آدمی اپنا مال ہوتے ہوئے بھی اس مال کے ایک تہائی سے زیادہ میں تصرف نہیں کر سکتا اگرچہ پورے مال کا مالک ہے لیکن ایک تہائی سے زیادہ خرچ کرنا چاہے؛ تو نہیں کر سکتا۔ مثلاً

ابھی اسی بیماری میں- جو آگے چل کر اس کے لئے موت کا ذریعہ بنی ہے- وہ کسی کو بخشش کے طور پر اپنا سارا مال دے دینا چاہے، اسی بیماری کے زمانہ میں اپنا سارا مال مسجد میں دے دے تو یہ معتبر نہیں ہے۔ صرف ایک تہائی پر اس کو تصرف کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے، اور اگر ابھی تصرف نہیں کرتا بلکہ آئندہ کے لئے وصیت کرنا چاہتا ہے؛ تب بھی ایک تہائی (1 / 3rd) میں ہی کرسکتا ہے۔ اگر ایک تہائی سے زیادہ کی کسی نے وصیت کی؛ تو شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا ہے۔

﴿وصیت کا اسلامی قانون﴾

وصیت کے سلسلہ میں شریعت کی طرف سے کچھ مقررہ قواعد اور لو (LAWS) ہیں ایک تو یہ ہے کہ وصیت ایک تہائی یا اس سے کم ہی تک کی درست ہے، ایک تہائی سے زیادہ کی اگر وصیت کی ہے؛ تو وہ پوری نہیں کی جائے گی۔ اس لئے اگر کسی نے وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میرا سب مال مسجد میں دے دینا، یا مدرسہ کے لئے دے دینا؛ تو وہ معتبر نہیں ہے۔ ایک تہائی دیں گے، باقی دو تہائی اس کے وارثوں کا ہوگا، اِلّا یہ کہ تمام وارث بشرطیکہ عاقل بالغ ہوں، اور رضامندی سے ایک تہائی سے زائد مال کو خرچ کرنے کی اجازت دیں؛ تو اس کی گنجائش دی گئی ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جس کے حق میں وصیت کی گئی ہے وہ خود وارث نہ ہو۔ اگر کسی وارث کے حق میں وصیت کی ہے- بیٹا، بیوی، باپ، ماں- تو یہ وصیت بھی معتبر نہیں۔ بعض مرتبہ باپ یوں کہتا ہے کہ میرے مال میں سے بڑے بیٹے کو اتنا دے دیجیو۔ حالانکہ وہ بیٹا تو بیٹا ہونے کی وجہ سے وارث ہی ہے۔ لہٰذا اس کے حق میں کی گئی یہ وصیت معتبر نہیں ہے۔

بعض مرتبہ آدمی وصیت کرتا ہے کہ میری بیوی کے پاس یہ گھر رہے گا، اس کو یہ گھر دے دینا؛ تو یہ وصیت بھی درست نہیں، اس لئے کہ بیوی اس کی وارث ہے۔ ہر وہ شخص جو اس کے مرنے کے بعد اس کے مال میں وارث بن رہا ہے، اگر اس کے حق میں کوئی وصیت کی ہے؛ تو وہ وصیت معتبر نہیں ہوگی اور اس پر عمل نہیں ہوگا۔

اور تیسرا یہ کہ کسی گناہ کے کام کی وصیت کی ہے تو اس کا بھی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ بہر حال! وصیت کے صحیح ہونے کے لئے ان تین چیزوں کو شرط قرار دیا ہے۔

﴿حلوائی کی دکان پر نانی ماں کا فاتحہ﴾

نبی کریم ﷺ بتلاتے ہیں کہ زندگی بھر تو صدقہ نہیں کیا اور ٹلاتا رہا کہ کریں گے، کریں گے، کریں گے۔ اب جان جانے کا وقت آیا اور روح گلے کے اندر آ کر اٹکی ہوئی ہے؛ تو اب جناب وصیت کر رہے ہیں کہ میرے مال میں سے دو لاکھ مسجد میں اور دو لاکھ مدرسہ میں اور ایک لاکھ واٹر ورکس (water works) میں، اور ایک لاکھ اسپتال میں دے دینا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: وہ تو فلاں کا ہو گیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کے جو وارثین مقرر کئے ہیں، وہ مال تو ان کے نام چڑھ گیا ہے، اب اگر وہ ان کو ہٹا کر ایک تہائی سے زیادہ کسی کو دینا بھی چاہے؛ تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

﴿خلاصۂ کلام﴾

خلاصہ یہ ہوا کہ ایک وقت وہ تھا کہ اپنی زندگی میں، تندرستی کے زمانہ میں، جس وقت آپ کو یہ توقع بندھی ہوئی ہے اور امید لگی ہوئی ہے کہ مَیں ابھی زندہ رہنے والا ہوں، کوئی بیماری بھی نہیں ہے، اس وقت اگر آپ اپنا سارا مال خرچ کر دیتے؛ تو درست تھا، آپ کر سکتے

تھے، لیکن آپ نے نہیں کیا، اوراب جب کہ موت سر پرآ گئی ہے اور روح نکلنے کا وقت قریب ہے اس وقت آپ سارا مال خرچ کرنا چاہیں؛ تو بھی نہیں کر سکتے۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ٹال مٹول مت کرو۔

ایک خرچ کرنا تو وہ تھا کہ جس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں قدر و قیمت زیادہ تھی اوراس پر ثواب بھی زیادہ تھا۔ اگر چہ ابھی بھی ایک تہائی تک جو خرچ کیا جائے گا، اس میں بھی ثواب تو ملے گا۔ لیکن اتنا نہیں ملے گا؛ جتنا اس وقت ملتا ہے۔

﴿ہماری ایک بری عادت﴾

ویسے بھی انسان کی عادت ہے کہ وہ جب کسی چیز سے اپنی ضرورت پوری کر لیتا ہے پھر اللہ کے راستہ میں دینے کی اس کو سوجھتی ہے۔ اور ایک دوسری بات بھی ہے کہ جو گھٹیا چیز ہوتی ہے، وہی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ عمدہ چیز تو اپنے استعمال کے لئے رکھتا ہے اور گھٹیا چیز اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا: ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ تم حقیقی معنٰی میں نیکی نہیں پا سکتے اور کامل ثواب اس وقت تک نہیں پا سکتے؛ جب تک کہ وہ چیز خرچ نہ کرو جس سے تمہیں محبت ہے۔

﴿صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج﴾

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے تو اس پر عمل کر کے بتلایا۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ جن کا ایک بہت عمدہ باغ بالکل مسجد نبوی کے سامنے تھا، آج کل تو وہ حصہ مسجد کے اندر ہی آ چکا ہے۔ اس باغ کا نام بیرحاء تھا، اس کے اندر بڑا میٹھا اور عمدہ پانی تھا۔ نبی کریم ﷺ بھی کبھی کبھار اس باغ میں تشریف لے جاتے تھے اور پانی نوش

فرماتے تھے اور وہاں تھوڑی دیر آرام بھی فرماتے تھے۔ جب یہ آیت اتری تو انہوں نے آ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے اور اس وقت میرے پاس جتنا بھی مال ہے، اس میں سب سے بہترین مال یہی باغ ہے، اور مَیں وہ اللہ کے واسطے پیش کرتا ہوں، آپ جہاں مناسب سمجھیں؛ وہاں خرچ کردیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج تو یہ تھا۔ (بخاری شریف، ۱۳۶۸)

مَیں اور آپ اس کو گوارا کریں گے؟

اور ہمارا معاملہ برعکس ہے۔ ہم جو گھٹیا چیز ہوتی ہے، اس کو خرچ کرتے ہیں۔ مثلاً ہم کھانا کھا چکے اور بچ گیا تو کہتے ہیں کہ کسی فقیر کو دے دو، اللہ کے راستہ میں خرچ کردو۔ اس لئے کہ معلوم ہے کہ یہ اب ہماری ضرورت کا نہیں رہا۔ اسی طرح کپڑا نیا آیا تو کہتے ہیں کہ جو پرانا ہے وہ دے دو۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس پر بھی ثواب دیتے ہیں، ورنہ مَیں اور آپ کیا اس کو گوارا کریں گے؟

ایک آدمی کو ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس نے کھانا کھالیا، اس کے بعد اس کے پاس دو روٹی بچ گئی، وہی ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ تو غیرت مند آدمی اس کو قبول نہیں کرتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم واحسان ہے کہ یہ بچی ہوئی دو روٹیاں بھی اگر آپ اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں؛ تو اللہ تعالیٰ ثواب دے رہے ہیں۔ ورنہ مَیں اور آپ ہوتے تو کیا کرتے؟

ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ اللہ کے راستہ کے لئے ہماری جو ترتیب بن رہی ہے، وہ کہاں تک درست ہے؟ نیا کپڑا لائے تو کہا کہ پرانا کپڑا اللہ کے راستہ میں خرچ کردو۔ ہر چیز میں ہمارا یہ مزاج بنا ہوا ہے۔ حالانکہ قرآن پاک میں باری تعالیٰ نے

انسان کے اس مزاج کی نشان دہی کی ہے:﴿وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ﴾ تم اللہ کے راستہ میں ایسی چیز دیتے ہو کہ اگر تم کو دی جائے تو تم اس کو لے نہیں سکتے، الّا یہ کہ تم چشم پوشی سے کام لو؛ وہ بات دوسری ہے۔

﴿......تب جا کر مسجد میں آئے﴾

ہر چیز میں ہمارا مزاج ایسا ہی بنا ہوا ہے، یہاں تک کہ عمر کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ زندگی کا وہی حصہ ہم اللہ تعالیٰ کے لئے فارغ کرتے ہیں جو بالکل گھٹیا اور کم درجہ کا ہے۔ بچپن اور جوانی کو تو خوب دنیا کمانے میں لگایا، اب بڑھاپے کا زمانہ آیا، پچاس ساٹھ سال کے ہوئے، کسی کام کے نہیں رہے، بچوں نے بھی کہہ دیا کہ ابّا اب دکان پر آنے کی ضرورت نہیں ہے، فیکٹری پر آنے کی ضرورت نہیں ہے، اب آپ اللہ اللہ کرو۔ جب ہر جگہ سے دھکے دئے گئے؛ تب جا کر مسجد میں آئے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ زندگی اور عمر کا بھی وہ حصہ جو زندگی کے اعتبار سے گھٹیا سمجھا جاتا ہے، وہ ہم اللہ کے لئے فارغ کر لیتے ہیں۔ تو اللہ کے راستہ میں دینے کا مزاج بھی اگر بنا؛ تو ایسا بنا۔

نبی کریم ﷺ اس حدیث کے ذریعہ سے یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ تم جو بھی دوگے، اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ وہ قبول کر لیں گے، اور اس پر ثواب ملے گا، لیکن اگر تم زیادہ ثواب لینا چاہتے ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے۔

﴿خرچ کرنے کی ترتیب﴾

دیکھئے! خرچ کرنے کے معاملہ میں بڑی ترغیبیں آئی ہیں اور علماء نے خرچ کے لئے

ایک ترتیب بھی بتلائی ہے، اگر ہم اس ترتیب کو اختیار کرلیں؛ تو بہت آسان ہے۔ ویسے آدمی جب خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان یاد دلاتا ہے کہ خرچ کروگے؛ تو فقیر ہوجاؤگے اور پیسہ پاس نہیں رہے گا۔ شیطان اس طرح دل میں وسوسے ڈال ڈال کر بخل اور گناہ کے کام کا حکم کرتا ہے: ﴿يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ﴾ اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے نہیں دیتا ہے۔ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔

اسی لئے علماء نے خرچ کرنے کے لئے ایک تدبیر بتلائی ہے کہ آدمی کے لئے بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ پہلے سے طے کرلے کہ اب میرے پاس جو بھی مال آئے گا اس کا اتنا حصہ مَیں اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ مثلاً آپ نے طے کرلیا کہ مال کا دسواں حصہ، بیسواں حصہ، چالیسواں حصہ، سوواں حصہ اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ اب آسان صورت یہ ہے کہ جہاں سو روپے آئے، فوراً اسی وقت ایک روپیہ الگ کرکے رکھ دو۔ ہزار روپے آئے، تو دس روپے الگ کرکے رکھ دو۔ دس ہزار روپے آئے تو اس کے اندر سے سو روپے الگ کرکے رکھ دو۔ لاکھ روپے آئے تو ایک ہزار روپے الگ کرکے رکھ دو۔ اور اس کا تھیلا بھی الگ ہی ہونا چاہیے۔ جب آپ اس طرح الگ کرتے رہیں گے؛ تو وہ تھیلا آپ کو یاد دلاتا رہے گا کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے واسطے الگ کئے گئے ہیں۔ پھر خرچ کرنے میں تاخیر نہیں ہوگی اور آسانی کے ساتھ خرچ کرسکوگے۔ ورنہ اگر الگ نہیں کئے ہیں تو اس صورت میں خرچ کرنا دشوار ہی رہے گا اور وقت پر شیطان نکالنے نہیں دے گا۔ اور اگر پہلے سے جوں جوں آتے گئے، توں توں ہم نکالتے گئے؛ تو اب خرچ کرنا آسان ہے۔

ایک پائی خرچ کرنے والا اور ایک لاکھ خرچ کرنے والا؛ دونوں برابر

ایک بات اور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں گنتی اور تعداد نہیں دیکھی جاتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو جذبہ دیکھا جاتا ہے کہ آدمی جو خرچ کررہا ہے وہ کس جذبے سے خرچ کررہا ہے؟ مثلاً ایک آدمی کے پاس سو روپے آئے اور اس نے ایک روپیہ خرچ کیا۔ اور دوسرے آدمی کے پاس ایک لاکھ آئے اور اس نے پورے ایک ہزار روپے خرچ کئے، تو یہ دونوں برابر ہوئے اس لئے کہ سو میں سے ایک خرچ کرنے والے نے بھی ایک فیصد (1%) خرچ کیا ہے۔ اور لاکھ میں سے ایک ہزار دینے والے نے بھی اتنا ہی خرچ کیا ہے۔ ترتیب دونوں کی یکساں ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس نے ایک ہزار دئے، اور اس نے ایک روپیہ دیا۔ جو جذبہ ہزار والے کا تھا؛ وہی جذبہ اس کا بھی ہے۔ اس کے پاس بھی اگر لاکھ روپے ہوتے، تو یہ بھی سوواں حصہ نکال کر ایک ہزار خرچ کرتا۔

اسی لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا جو جذبہ تھا وہ سب لوگوں سے بڑھا ہوا تھا۔ ان کا اخلاص بڑھا ہوا تھا۔ اس لئے ان کا ثواب بھی زیادہ ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم میں سے کوئی آدمی اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے، اور میرا اصحابی ایک مُد یا اس سے بھی آدھا خرچ کرے؛ تب بھی تم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے (البخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی، ۳۶۷۳) کیوں؟ اسی جذبے، نیت اور اخلاص کی وجہ سے وہ بڑھے ہوئے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اصل جذبہ اور اخلاص دیکھا جاتا ہے۔

کوئی آدمی یہ نہ سوچے کہ میرے پاس خرچ کرنے کے لئے کچھ مال تو ہے نہیں، مَیں کیا خرچ کروں۔ ایک صاحب ایک بزرگ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے کہا: میرے پاس خرچ کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ ان بزرگ نے کہا: تیرے پاس ایک

روپیہ بھی نہیں ہے؟ اس نے کہا: ایک روپیہ تو ہے۔ فرمایا: ایک روپیہ میں سے ایک پائی خرچ کرو۔ آپ کے پاس جو ہے اس میں سے خرچ کیجیے۔ اگر تم ایک روپیہ میں سے ایک پائی خرچ کرو گے، اور لاکھ والا ایک ہزار خرچ کرتا ہے؛ تو تم اس کے برابر ہو گئے۔

آدمی یہ سوچے کہ میرے پاس جو ہے اس میں سے مَیں اپنی حیثیت کے مطابق اتنا خرچ کرسکتا ہوں۔ پہلے سے طے کرلے اور پھر اس پر عمل کرے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

ہمارے بزرگوں میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں۔ ان کے صاحبزادے فرماتے ہیں: والد صاحب نے طے کرلیا تھا کہ میرے پاس جو مال بغیر محنت کے آئے گا - جیسے کسی نے ہدیہ میں دے دیا، کہیں سے وراثت میں مل گیا - اس کا دسواں حصہ یعنی (10%) اور جو مال مَیں محنت کر کے حاصل کروں گا اس کا بیسواں حصہ یعنی (5%) اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ لہٰذا ان کی عادت تھی کہ اگر ان کے پاس ایک روپیہ بھی آتا تو فوراً دکان پر بھیج کر اس کو تڑواتے اور ریز گاری کروا کر حساب کر کے ایک پاکٹ میں ڈلوا دیتے، چاہے اس کا چلّر منگوانے میں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔ اور اس کے لئے پاکٹ الگ ہی رکھا تھا۔ اگر دس روپے آتے تو اسی وقت چھوٹے کروا کر ایک روپیہ اس میں ڈلواتے۔ ایسا نہیں کہ بعد میں چھوٹے کروائیں گے، بلکہ اسی وقت کرواتے تھے، اس کے بغیر اپنے جیب میں رکھتے ہی نہیں تھے۔ پہلے یہ کام کرواتے تھے، چھوٹے کرواتے، ڈبّے میں ڈالتے اور پھر اپنے جیب میں رکھتے۔ اگر انسان ایسی کوئی ترتیب بنالے اور ایسا ایک نظام بنالے؛ تو اس کے لئے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا آسان ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

باقی ہم یوں سوچیں کہ جب کام سامنے آئے گا تو دیکھیں گے۔ تو اس میں شیطان آدمی کو بہکاتا رہتا ہے، اور اس کو اس خیال میں مبتلا کرتا رہتا ہے کہ جب وقت آئے گا اس وقت کریں گے، اور جب وقت آتا ہے تو پھر آدمی کو خرچ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اس طرح الگ کر لے گا؛ تو پھر وہ تھیلا ہی آپ کو یاد دلاتا رہے گا کہ یہ خرچ کرنے کے لئے ہی رکھے ہیں۔ اللہ کے راستہ میں جہاں خرچ کرنا ہے، اس میں سے نکالو۔ یہ ترتیب ہے جو بزرگوں نے بتلائی ہے۔

اللّٰہ تعالیٰ ھمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے

المبادرة الیٰ الخیرات

نیکی کی طرف لپکنا

مجلس ﴿۳﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً امابعد.

عن أنس رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم أَخَذَسَیْفاًیَوْمَ اُحُدٍ. فَقَالَ: مَنْ یَّأْخُذُمِنِّیْ ھٰذَا؟ فَبَسَطُوْا أَیْدِیَھُمْ، کُلُّ اِنْسَانٍ مِّنْھُمْ یَقُوْلُ: أَنَاأَنَا. قَالَ: فَمَنْ یَّأْخُذُہٗ بِحَقِّہٖ؟ فَأَحْجَمَ الْقَوْمُ، فَقَالَ أَبُوْدُجَانَۃَ رضی اللہ عنہ: أَنَاآخُذُہٗ بِحَقِّہٖ. فَأَخَذَہٗ، فَفَلَقَ بِہٖ ھَامَ الْمُشْرِکِیْنَ. (رواہ مسلم)

اس باب کا عنوان ہے نیکی کے کاموں کی طرف آدمی کا آگے بڑھنا، اس کے لئے کوشش کرنا، اور نیکی کے کام کے لئے آدمی کو بغیر کسی پس و پیش کے فوراً تیار ہو جانا۔ یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ غزوۂ احد کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک میں ایک تلوار لی اور پوچھا: یہ تلوار مجھ سے کون لے گا؟

غزوۂ احد اور حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کے کارنامے

غزوۂ احد ۳ھ میں پیش آیا ہے۔ مشرکینِ مکہ ایک لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کے لئے آئے تھے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ وہ لوگ مدینہ منورہ کے قریب آچکے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا اور تیاری کی۔ اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبی رجحان تو یہی تھا کہ مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے ان کا مقابلہ کیا جائے لیکن بعض صحابہ کی خواہش اور اصرار پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ فرمایا کہ مدینہ منورہ سے باہر جا کر ان کا مقابلہ کیا

جائے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ حضرات صحابہ کو ساتھ لے کر احد پہاڑ کی جانب روانہ ہوئے، جہاں اس پہاڑ کے قریب ہی مشرکین نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ جمعہ کے روز جمعہ سے پہلے آپ نے صحابہ کو ترغیب دی، جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد گھر میں تشریف لے گئے، اور تیاری کر کے عصر کے وقت باہر تشریف لائے، اور عصر کے بعد صحابہ کے لشکر کو لے کر روانہ ہوئے اور احد کے قریب مقامِ شوط میں آپ نے رات گذاری۔ اور سنیچر کے روز مقام احد میں دونوں لشکر مقابلہ کے لئے صف آرا ہوئے۔ اسی موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے ایک تلوار- جو آپ کے پاس تھی- اپنے دستِ مبارک میں لے کر حضراتِ صحابہ سے پوچھا: یہ تلوار مجھ سے کون حاصل کرے گا؟ اس کے جواب میں حضرات صحابہ میں سے ہر ایک نے ہاتھ آگے بڑھایا اور ان میں سے ہر ایک یہ کہہ رہا تھا کہ یہ تلوار مَیں لوں گا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے ایک قید لگائی کہ کون اس تلوار کو اس کا حق ادا کرنے کی شرط کے ساتھ لے گا؟ جب حق کی بات آئی تو لوگ رک گئے، اور اس لئے نہیں رکے کہ نعوذ باللہ ان کے جذبات میں کوئی کمی تھی اور ان کے حوصلے پست تھے، بلکہ اس ڈر کی وجہ سے ان کے ہاتھ رک گئے کہ پتہ نہیں اس کا کیا حق ہوگا؟ اور ہم حق ادا کر سکیں گے یا نہیں؟

حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ ایک انصاری صحابی ہیں، جن کا نام سماک بن خرشہ ہے، وہ آگے بڑھے اور انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مَیں اس تلوار کو لوں گا۔ بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اعلان فرمایا کہ یہ تلوار کون لے گا؟ لوگوں نے ہاتھ آگے بڑھائے، لیکن آپ ﷺ نے کسی کو نہیں دی۔ پھر جب حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے تو ان کو دی۔ گویا آپ ﷺ کو بذریعۂ وحی آگاہ کیا تھا کہ یہ اس کا حق ادا کریں گے۔ خیر! انہوں نے کہا: مَیں اس کا حق ادا کرنے کی شرط کے ساتھ لیتا ہوں۔

یہاں اس روایت کو اسی لئے لائے ہیں کہ دیکھئے! نبی کریم ﷺ ایک نیکی کے کام کے لئے دعوت دے رہے ہیں اور لوگ فوراً آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور جب حق کی ادائیگی کی بات آئی تو حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے اس کا حق ادا کرنے کی شرط کو منظور کرتے ہوئے سبقت کی۔

دوسری روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اللہ کے رسول! اس کا حق کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کا حق یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے کسی مسلمان کو کوئی گزند اور تکلیف نہ پہنچائی جائے، اور کسی کافر کو چھوڑا نہ جائے۔ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ اس کا حق یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے کافروں کی گردن اڑائی جائے۔ خیر! حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے اس کا حق ادا کرنے کی شرط کے ساتھ اس تلوار کو لیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے وہ تلوار لی اور اس کے ذریعہ سے مشرکین کی کھوپڑیوں کو پھاڑا۔ روایتوں میں ہے کہ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے جنگ کے موقعہ پر اپنے سر پر سرخ عمامہ باندھا اور بہت اتراہٹ کے ساتھ آگے بڑھے۔ جب ان کو اس طرح چلتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ چال ناپسند ہے مگر دشمن کے مقابلہ میں۔ اگر کوئی آدمی دشمن کے مقابلہ میں اس طرح چلے گا تو اس سے اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتے ہیں، اس لئے کہ دشمن کے مقابلہ میں اپنی جرأت اور بہادری کا اظہار پسندیدہ ہے۔

چنانچہ وہ یہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

أَنَا الَّذِیْ عَاهَدَنِیْ خَلِیْلِیْ ❁ وَنَحْنُ بِالسَّفْحِ لَدَی النَّخِیْلِ
أَنْ لاَ أَقُوْمَ الدَّهْرُ فِی الْکُیُوْلِ ❁ أَضْرِبُ بِسَیْفِ اللهِ وَالرَّسُوْلِ

(سیرۃ المصطفیٰ ج ۲/ص ۲۰۰۔ معرفۃ الصحابۃ لأبی نعیم، ۳۲۱۸)

مجھ سے میرے خلیل نے پہاڑ کے دامن میں نخلستان کے پاس یہ عہد لیا ہے اور اس عہد کو پورا کرنے کے واسطے مَیں آگے بڑھ رہا ہوں۔ اور جو بھی مقابلہ پر آیا اس کا سر قلم کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ایک موقعہ پر ہند بنت عتبہ سامنے آئی۔ یہ حضرت ابوسفیان کی بیوی اور حضرت معاویہ کی والدہ ہیں؛ جو اس وقت اسلام نہیں لائی تھیں۔ وہ بھی مشرکین کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ جنگِ احد کے موقعہ پر مشرکین کے حوصلے اور ہمتیں بلند کرنے کیلئے پندرہ عورتیں بھی ساتھ آئی تھیں۔ جب یہ سامنے آئیں تو حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے تلوار اُٹھائی پھر فوراً تلوار کھینچ لی اور فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار سے مَیں کسی عورت کو قتل نہیں کروں گا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ اس کے بعد ہندہ نے لوگوں کو مدد کے لئے دہائی دی اور آواز بھی دی۔ لیکن حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کی بہادری کی وجہ سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھا۔ بہرحال! اس موقعہ پر انہوں نے بڑی بہادری کے جوہر دکھلائے تھے۔

اسی موقعہ پر یہ بھی ہوا کہ ایک وقت جب مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت تیر چلانا شروع کئے تو یہ اپنی پیٹھ مشرکین کی طرف کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہوگئے اور سارے تیر اپنی پیٹھ پر لئے۔ یہاں تو یہ روایت لاکر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے نیکی کے کام کی طرف سبقت کی اور آگے بڑھے۔

﴿عمل کے لئے زمانۂ حال غنیمت ہے﴾

عن الزبیر بن عدی قال: أَتَيْنَا أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ، فَشَكَوْنَا إِلَيْهِ مَا نَلْقَىٰ مِنَ الْحَجَّاجِ. فَقَالَ: اِصْبِرُوْا، فَإِنَّهُ لَا يَأْتِيْ زَمَانٌ إِلَّا وَالَّذِيْ بَعْدَهُ شَرٌّ مِّنْهُ حَتّٰى تَلْقَوْا رَبَّكُمْ. سَمِعْتُهُ مِنْ نَّبِيِّكُمْ صلی اللہ علیہ وسلم. (رواہ البخاری)

زبیر بن عدی تابعی ہیں، صغار تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم

لوگ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حجاج کی طرف سے جو مظالم ہو رہے تھے اور لوگوں کو اس کی طرف سے جو تکلیفیں پیش آتی تھیں اس کی شکایتیں کی کہ حضرت! وہ بہت ظلم ڈھا رہا ہے۔ اس پر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان آنے والوں سے کہا: صبر سے کام لو، اس لئے کہ جو زمانہ اس کے بعد آ رہا ہے وہ اس سے بھی برا ہے۔ یعنی تم حجاج کے مظالم کی شکایت کرتے ہو، آگے جو حالات آنے والے ہیں وہ اس سے زیادہ خطرناک ہیں۔ یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو یعنی موت آ جائے۔ پھر فرمایا: یہ چیز میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔

چنانچہ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ گذشتہ کل آج سے بہتر تھی۔ اور آج کا دن آنے والی کل سے بہتر ہے۔ گویا ہر آنے والا دن گذرے ہوئے دن کے مقابلہ میں برا ہے اس میں فتنے زیادہ ہیں، حالات ناساز گار ہیں۔

بعض لوگوں نے اس موقع پر یہ اشکال کیا ہے کہ ایسی صورتیں بھی پیدا ہوئی ہیں کہ بعد کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے خوبی اور خیر کی شکلیں پیدا فرمائیں۔ جیسے اسی حجاج کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ آیا جس میں عدل وانصاف بہت عام ہوا اور ظلم بالکل ختم ہو گیا تھا۔

اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے وہ مجموعی اعتبار سے ہے، کہ مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ہر بعد میں آنے والا زمانہ پچھلے زمانہ کے مقابلہ میں برا اور کمتر ہے۔ ہاں! کسی جگہ پر کہیں شخصی حالات انفرادی طور پر پچھلے زمانہ سے بہتر ہوں؛ تو وہ اس ارشاد کے منافی نہیں ہے۔

خیر! حضرت انس رضی اللہ عنہ کی نصیحت کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو زمانہ تم کو دیا ہے اس کو غنیمت سمجھ لو اور اس سے فائدہ اٹھا لو۔

﴿ بھلانے والے فقر سے پہلے کچھ کرلو ﴾

عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ أن رسول اللهﷺ قَالَ: بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سَبْعاً، هَلْ تَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا فَقْراً مُنْسِياً، أَوْغِنىً مُطْغِياً، أَوْمَرَضاً مُفْسِداً، أَوْهَرَماً مُفْنِداً أَوْمَوْتاً مُجْهِزاً، أَوِالدَّجَّال فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَر، أَوِالسَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ أَدْهىٰ وَأَمَرُّ!. (رواه الترمذی. وقال: حدیث حسن)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اعمال کوانجام دینے میں سات چیزوں سے سبقت کر جاؤ۔ یعنی آگے جو سات باتیں بیان کی جارہی ہیں، وہ پیش آویں؛ اس سے پہلے اعمال صالحہ کرلو اور اس موقعہ کو غنیمت سمجھ لو۔

﴿هَلْ تَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا فَقْراً مُنْسِياً ﴾ کیا تم انتظار کرتے ہو ایسے فقر کا جو بھلا دینے والا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ابھی تم کو موقعہ دیا ہے، وسعت دی ہے، ضرورتیں آسانی سے پوری ہورہی ہیں، راحت سے زندگی گذر رہی ہے۔ اب کیا تم اس حالت کا انتظار کرتے ہو اور یہ سوچ رہے ہو کہ ابھی تو ذرا اور عیش وعشرت کرلیں، ابھی ہی تو موقعہ ہے، آئندہ نیک اعمال کرلیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ وسعت اور راحت کے دن ہاتھ سے نکل جائیں اور فقر وفاقہ پیش آجائے، ایسا فقر وفاقہ؛ جو تمہیں اپنے حال سے بھی بے خبر کردے۔ یعنی آدمی کبھی ایسی پریشانی میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ اس کو اپنے حال کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ تو بھلانے والے فقر کے آنے سے پہلے کچھ کرلو۔ ایسے حالات پیش آسکتے ہیں، کیا تم اس کا انتظار کرتے ہو؟ اس وقت تم اللہ کو یاد کروگے؟ کیا اس وقت نیکی کے کام کروگے؟ جب ابھی نہیں کررہے ہو؛ تو اُس وقت کیا کرسکوگے؟ اُس وقت تو بطریقۂ اولیٰ نہیں کرسکوگے۔ اس لئے اس موقعہ کو غنیمت سمجھو۔

﴿سرکش مالداری﴾

﴿أَوْ غِنىً مُطْغِياً﴾ یا کیاتم انتظار کرتے ہو ایسی مالداری کا جو آدمی کو سرکشی میں ڈال دے۔ یعنی ابھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے مالداری تو دی ہے لیکن کم درجہ کی ہے، اب آپ یوں سوچ رہے ہیں کہ ذرا اور وسعت ہو جائے گی اور مال آجائے گا تو اس وقت نیک اعمال کا اہتمام کریں گے، اور اطمینان سے بیٹھ کر اللہ اللہ کریں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مال کی کثرت اور غنٰی کی زیادتی تمہیں سرکشی میں مبتلا کر دے، ابھی تمہارے اندر وہ بات نہیں ہے اِس وقت تم جو اعمال انجام دے سکتے ہو؛ اُس وقت انجام نہیں دے سکو گے۔

﴿کہیں بیماری میں مبتلا نہ ہو جاؤ﴾

﴿أَوْ مَرَضاً مُفْسِداً﴾ یا پھر کیاتم انتظار کرتے ہو ایسی بیماری کا جو تمہارے جسم کو خراب کرنے والی ہو۔ یعنی ابھی اللہ تعالیٰ نے صحت دے رکھی ہے، تندرستی ہے اور اچھی طرح اطمینان وسکون کے ساتھ زندگی گذر رہی ہے۔ کیاتم یہ سوچ رہے ہو کہ عیش وعشرت میں تھوڑے دن اور گذار لیں، پھر بعد میں نیک اعمال کا اہتمام کر لیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جو صحت دی ہے وہ ہاتھ سے نکل جائے، بیماری میں مبتلا ہو جاؤ، اور بیماری بھی ایسی ہو جو تمہارے بدن کو بالکل بیکار کر دے اور تم کسی عمل کرنے کے قابل نہ رہو۔ جو لوگ بیمار ہیں ان سے پوچھو کہ وہ نماز بھی بڑی مشکل سے پڑھ پاتے ہیں، نیک اعمال کرنا ان کیلئے دشوار ہو گیا ہے۔ آدمی صحت اور تندرستی کی حالت میں جیسے اعمال انجام دے سکتا ہے؛ بیماری کی حالت میں ویسے اعمال نہیں کر سکتا۔ مثلاً گھٹنے درد کر رہے ہیں، ہاتھوں میں دم نہیں ہے، خود سے اٹھ نہیں سکتا، بیٹھ نہیں سکتا، اچھی طرح قیام، رکوع اور سجدہ نہیں کر سکتا، تلاوت کا

اہتمام نہیں کرسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسی بیماری میں مبتلا نہ ہوجاؤ کہ اس وقت تو وہ بھی نہ کرسکو؛ جو ابھی کرسکتے ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جو موقعہ دیا ہے؛ اس کو غنیمت سمجھو۔

﴿اور پھر اس کی نوبت نہیں آتی﴾

﴿أَوْ هَرَماً مُفْنِداً﴾ یا پھر سٹھیا دینے والے بوڑھاپے کا انتظار کرتے ہو؟ یعنی ابھی تو اللہ تعالیٰ نے جوانی دی ہے، قوت دی ہے، جوانی میں اللہ تعالیٰ کے احکام بجالا سکتے ہو، اور اس کی خوشنودی حاصل کرسکتے ہو، بلند مراتب حاصل کرسکتے ہو، نیکیوں کا اہتمام کرسکتے ہو، اللہ تعالیٰ نے قویٰ کی سلامتی دی ہے۔ کیا ابھی یہ سوچ رہے ہو کہ جوانی کا زمانہ ہے، ابھی تو ہم نے دنیا دیکھی ہی کیا ہے، کچھ عیش و عشرت کے دن گذار لیں، اس کے بعد مسجد کا کونہ پکڑ لیں گے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی ایسا سوچتا ہے اور پھر اس کی نوبت نہیں آتی، اس لئے کہ آدمی ایسے بوڑھاپے میں مبتلا ہوجاتا ہے جو آدمی کے قویٰ کو بالکل بیکار بنادیتا ہے، پھر وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتا۔ جب ابھی نہیں کرتے ؛ تو اُس وقت کیا کروگے؟ اُس وقت تو اور زیادہ نہیں کرسکوگے۔

﴿کیا اچانک آنے والی موت کا انتظار ہے؟﴾

﴿أَوْ مَوْتاً مُجْهِزاً﴾ یا اچانک آنے والی موت کا تم انتظار کرتے ہو؟ یعنی ابھی اللہ تعالیٰ نے زندگی دی ہے، زندگی سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کا اہتمام کرسکتے ہو، نیکیاں کرسکتے ہو، گناہوں سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہو۔ اس وقت جو کچھ ہوسکتا ہے؛ کرلو۔ موت کے متعلق کوئی گارنٹی نہیں، آج کل تو اچانک کی موتیں زیادہ ہی ہوگئی ہیں۔ آدمی باہر نکلے تو پتہ نہیں کہ صحیح سلامت واپس پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔ اس

لئے فرماتے ہیں کہ کیا اچانک آنے والی موت کا انتظار ہے کہ جو تم کو کسی بھی عمل کے قابل نہیں رکھے گی۔

﴿کہیں دجال نہ آجائے﴾

﴿أَوِ الدَّجَّال فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَر﴾ یا پھر دجال کے آنے انتظار ہے جو ان دیکھی چیزوں میں سب سے بدترین چیز ہے۔ یعنی جو چیزیں ابھی تک دنیا میں پیش نہیں آئیں اور آئندہ جو حالات پیش آنے والے ہیں؛ ان میں دجال ایک بدترین چیز ہے۔ اس زمانہ میں آدمی بڑے بڑے فتنوں میں مبتلا ہوگا۔ تو دجال کے زمانہ کے مقابلہ میں ابھی خیر کا زمانہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے موقعہ دیا ہے، اس وقت آپ کچھ کر سکتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ دجال اچانک آجائے، اور تم کو جو کچھ نیکی اور خیر کا موقعہ ملا تھا؛ وہ بھی نہ مل پائے۔ کیا اس کا انتظار ہے، اس لئے کچھ نہیں کر رہے ہو؟

﴿...... بڑی بھیانک چیز ہے﴾

﴿أَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ أَدْهىٰ وَأَمَرُّ﴾ یا پھر قیامت کا انتظار ہے؟ اور قیامت تو بڑی بھیانک چیز ہے اور بڑا کڑوا معاملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا قیامت آئے گی اس وقت کچھ کروگے۔ جیسے کہتے ہیں کہ ابھی کچھ نہیں کرتے ہو تو کیا مرنے کے بعد کروگے؟ ایسے ہی یہاں بھی کہا جا رہا ہے کہ کیا جب قیامت آجائے گی اس وقت اعمال کروگے۔ ابھی اللہ تعالیٰ نے موقعہ دیا ہے؛ اس سے فائدہ اٹھالو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے

المبادرة الیٰ الخیرات

نیکی کی طرف لپکنا

مجلس ﴿۴﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا.مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّآاِلٰهَ اِ لَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً.أمابعد.

غزوۂ خیبر اور حضرت حیدر رضی اللہ عنہ

وعنه رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ يوم خيبر:لَأُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ رَجُلاً يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ،يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلىٰ يَدَيْهِ.قَالَ عُمَر رضی اللہ عنہ:مَاأَحْبَبْتُ الْاِمَارَةَاِلَّايَوْمًا.فَتَسَاوَرْتُ لَهَارَجَآءَ أَنْ أُدْعىٰ لَهَا،فَدَعَارسول الله ﷺ عليَّ بنَ أبي طالب رضی اللہ عنہ،فَأَعْطَاهَااِيَّاهَا.وَقَالَ:اِمْشِ وَلَا تَلْتَفِتْ، حَتّٰى يَفْتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكَ.فَسَارَعَلِيٌّ شَيْئاً،ثُمَّ وَقَفَ،وَلَمْ يَلْتَفِتْ،فَصَرَخَ؛يارسول الله!عَلىٰ مَاذَا أُقَاتِلُ النَّاسَ؟قَالَ:قَاتِلْهُمْ حَتّٰى يَشْهَدُوْاأَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰه،وَأَنَّ مُحَمَّداًرسول الله،فَاِذَافَعَلُوْا ذَالِكَ،فَقَدْمَنَعُوْامِنْكَ دِمَائَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ اِلَّابِحَقِّهَا.

اس باب کا عنوان تھا نیکی کی طرف سبقت کرنا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج اس سلسلے میں کیسا تھا، اس روایت کو لا کر اسی کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

غزوۂ خیبر ایک غزوہ ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پیش آیا۔ غزوہ یعنی وہ جنگ جس میں نبی کریم ﷺ نے بذاتِ خود شرکت فرمائی ہو۔ ۶ھ میں صلح حدیبیہ ہوئی اور اس کے بعد ۷ھ میں محرم کے مہینہ میں غزوۂ خیبر پیش آیا۔ صلحِ حدیبیہ کے موقعہ پر اصل تو حضور اکرم ﷺ عمرہ کے ارادہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مکہ مکرمہ جارہے تھے۔ اس وقت

آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں مکہ والوں کی طرف سے رکاوٹ نہ ڈالی جائے، اس لئے آپ کی کوشش یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ آپ کے ساتھ چلیں، لہٰذا مدینہ والوں سے بھی کہا اور دیہاتوں میں بھی اعلان کرایا۔ لیکن منافقین میں سے بعضوں نے بہانے کئے اور بعضوں نے تو ساتھ آنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کو یہ ڈر تھا کہ کہیں مدبھیڑ نہ ہو جائے، اس لئے انہوں نے سوچا کہ اس میں پھنسنا نہیں ہے، لہٰذا بہانہ کر دو۔

خیر! حضور اکرم ﷺ گئے اور مکہ والوں کی طرف سے رکاوٹ ہوئی، پھر اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے آپ نے ان کے ساتھ صلح کی۔ جب صلح کر کے واپس لوٹ رہے تھے تو سورۂ فتح نازل ہوئی: ﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا﴾ اے نبی! ہم نے آپ کو کھلم کھلی فتح اور کامیابی عطا فرمائی۔ اسی سورت میں آگے ہے: ﴿وَعَدَکُمُ اللّٰہُ مَغَانِمَ کَثِیۡرَۃً تَاۡخُذُوۡنَہَا فَعَجَّلَ لَکُمۡ ہٰذِہٖ﴾ اللہ تعالیٰ نے اس صلح کے بعد بہت سارے مالِ غنیمت کا تمہارے لئے وعدہ کیا ہے جو تم دشمن سے حاصل کرو گے۔ اور اس میں بھی یہ خیبر وہ مالِ غنیمت ہے جو اللہ تعالیٰ تم کو فوری طور پر دینا چاہتے ہیں۔ مفسرین اور شراحِ حدیث نے لکھا ہے کہ اسی صلحِ حدیبیہ کے بدلہ میں انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتحِ خیبر دی گئی تھی۔

خیبر مدینہ منورہ سے شام کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں باغات والا ایک بڑا علاقہ ہے، جہاں یہودی آباد تھے۔ جن یہودیوں کو مدینہ منورہ سے جلاوطن کیا گیا تھا وہ بھی وہاں آباد تھے، اور وہاں جانے کے بعد مسلمانوں کے خلاف مستقل سازشیں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے، اور اس کے لئے کسی قسم کی کسر اور کوتاہی روا نہیں رکھتے تھے۔ لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنا ہی ان کا کام تھا۔ جب مکہ والوں سے

صلح کے بعدان کی طرف سے اطمینان ہوا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ اب ان کی خبر لو۔اور یہ کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیبر کے فتح ہونے کی بشارت سنائی گئی ہے، اس لئے منافقین بھی مالِ غنیمت میں حصہ لینے کے لئے ساتھ آنا چاہیں گے،لیکن ان کو ساتھ مت لینا،صرف انہیں لوگوں کو ساتھ لینا جو حدیبیہ میں ساتھ تھے۔چنانچہ چودہ سو(۱۴۰۰) پیدل اور دوسو(۲۰۰) سوار؛کل سولہ سو(۱۶۰۰) آدمیوں کا لشکر لے کر نبی کریم ﷺ خیبر روانہ ہوئے۔رات کے وقت وہاں پہنچے۔نبی کریم ﷺ کا دستور یہ تھا کہ حملہ کے ارادہ سے جب کسی بستی کے پاس پہنچتے تھے تو آپ صبح صادق کا انتظار فرماتے تھے۔صبح صادق ہونے پر اگر وہاں سے اذان کی آواز آرہی ہوتی تو آپ حملہ نہیں کرتے تھے۔اور اگر اذان کی آواز نہیں آرہی ہوتی تو حملہ کرتے تھے۔چنانچہ یہاں بھی صبح کا انتظار کیا اور جب اذان کی آواز نہیں آئی؛تو آپ نے حملہ کی تیاری شروع کردی۔وہ لوگ کھیتی باڑی والے تھے،عادت کے مطابق صبح اپنے جانور اور کلھاڑے، پھاوڑے وغیرہ سامان لے کر کھیت جانے کے لئے نکلے تو باہر دیکھا کہ نبی کریم ﷺ لشکر کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں تو یہ لوگ پکارتے ہوئے بھاگے: ﴿وَاللهِ! مُحَمَّدٌ وَالْخَمِيسُ﴾ اللہ کی قسم! محمد اپنے لشکر کے ساتھ آگئے ہیں۔قلعہ میں گھس گئے اور قلعہ کے دروازے بند کردئے۔

بہرحال! محاصرہ ہوا،کئی قلعے تھے،پہلا قلعہ تو آسانی سے فتح ہوا۔دوسرے قلعہ کو قلعۂ قموس کہتے تھے۔اس وقت نبی کریم ﷺ کو دردِ سر کی تکلیف تھی اس لئے خود آپ ﷺ لشکر کی کمان سنبھالنے کے لئے جا نہیں پاتے تھے،اس لئے آپ نے عَلَم صحابہ میں سے حضرت ابوبکر کو دیا کہ تم لشکر لے کر جاؤ،لیکن قلعہ فتح نہیں ہوا۔دوسرے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیا۔اس طرح مختلف حضرات کو دیا،لیکن قلعہ فتح نہیں ہوا۔

﴿زبانِ مبارک سے نکلنے والا سرٹیفیکٹ﴾

ایک رات نبی کریم ﷺ نے یہ اعلان فرمایا: ﴿لَأُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ رَجُلاً يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ، يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ﴾ کل مَیں یہ جھنڈا ایک ایسے آدمی کے حوالے کروں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر قلعہ کو فتح کر دیں گے، چونکہ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں دو باتیں تھیں۔ ایک تو قلعہ کا فتح ہونا؛ جو مسلمانوں کی کامیابی کی چیز ہے، اور اس سے بڑھ کر نیکی کا کام اور کیا ہوگا، لہٰذا جو اس میں آگے بڑھ کر حصہ لے گا؛ اس کے لئے ثواب کے ڈھیر ہوں گے۔ اور دوسری بات آپ ﷺ نے اس ارشاد میں یہ فرمائی کہ وہ آدمی اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔

یوں تو تمام صحابہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھنے والے تھے، کسی کے متعلق کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا لیکن جب اللہ کا رسول اس کے متعلق گواہی دے رہا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے تو گویا اللہ کے رسول ﷺ کی زبانِ مبارک سے نکلنے والا یہ سرٹیفیکٹ حاصل کرنے کیلئے صحابہ کے دلوں میں تڑپ پیدا ہوئی۔ یہ آگے بڑھنے کا جذبہ ہے۔ پھر تو پوری رات صحابہ نے ایسی گذاری کہ اسی بات کے چرچے ہوتے رہے کہ دیکھو! کل کس کے نام کی لاٹری نکلتی ہے۔ ہر ایک دل میں تمنا کرتا تھا اور دعا کرتا تھا، اور دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ تھا کہ کاش! یہ سعادت مجھے نصیب ہو جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ﴿مَاأَحْبَبْتُ الْإِمَارَةَ إِلَّا يَوْمًا﴾ سرداری اور امارت کو اس دن کے علاوہ کسی دن مَیں نے پسند نہیں کیا۔ سرداری بڑی ذمہ داری کا کام ہے، اور حضور ﷺ نے اس کے متعلق بڑی تاکید فرمائی ہے۔ اور اگر کوئی آدمی سرداری مانگے گا، اور اس کو سرداری

ملے گی؛ تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے حوالے کر دیں گے، اور کوئی مدد نہیں ہوگی۔ اگر بغیر مانگے مل جائے تو اللہ تعالیٰ کی مدد بھی ہوتی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: سوائے اس دن کے زندگی میں کبھی مَیں نے سرداری کی تمنا نہیں کی۔ اور وہ بھی سرداری کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ یہ فضیلت حاصل ہونے والی تھی ﴿فَتَساوَرْتُ لَهَا رَجَآءً﴾ مَیں نے بھی اس کیلئے اپنے آپ کو آگے بڑھایا۔ ﴿تَساوُر﴾ کا معنیٰ آگے بڑھنا اور سر اونچا کرنا۔

﴿ اللہ کرے! ایسی دوا ہمیں بھی مل جاوے ﴾

روایتوں میں آتا ہے کہ صبح کے وقت صحابہ چکر لگا رہے تھے، آنٹے پھیرے مار رہے تھے۔ کبھی کسی بڑے کی طرف سے کچھ ملنے والا ہو تو ہر ایک آدمی سر اونچا کر کے دیکھتا ہے کہ میری طرف اشارہ ہو جائے تو میرا کام بن جائے، اس لئے ہر ایک سر اونچا کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مَیں نظر نہ آؤں اور دوسرے کی طرف اشارہ ہو جائے۔ اس لئے مَیں بھی سامنے آجاؤں تو اچھا ہے، تاکہ کل کو کہیں یوں نہ ہو کہ تم کو ڈھونڈا تھا لیکن تم ملے نہیں تھے، اس لئے فلاں کو بلا لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے مَیں نے بھی اپنے آپ کو اس امید پر پیش کیا کہ مَیں بلا لیا جاؤں۔ لیکن جن کو بلانا مقصود تھا؛ وہ وہاں موجود ہی نہیں تھے۔ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ علی کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا: ان کی آنکھوں میں درد ہے، آشوبِ چشم کی شکایت ہے، آنکھیں آئی ہوئی ہیں، اس لئے وہ تو اپنے خیمہ میں آرام کر رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو بلاؤ۔ ان کو بلوایا گیا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعابِ دہن ان کی آنکھوں میں ڈالا۔ حضرت علی فرماتے ہیں: اس کے بعد زندگی بھر کبھی میری آنکھوں میں تکلیف نہیں ہوئی۔ اللہ کرے! ایسی دوا ہمیں بھی مل جاوے۔

بہر حال! حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلوایا گیا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جھنڈا عنایت فرمایا۔ یہ جھنڈا لینا کوئی آسان کام نہیں تھا، بلکہ اپنی جان کی قربانی دینے کے لئے پیش کرنا تھا، لیکن تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جان کی قربانی دینے کے لئے بھی اسی خیر کی امید پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ جھنڈا دے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی: ﴿اِمْشِ وَلَا تَلْتَفِتْ، حَتّٰی یَفْتَحَ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْکَ﴾ آگے بڑھو، اِدھر اُدھر مت دیکھو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ پر قلعہ کو فتح کر دے۔

﴿اطاعتِ صحابہ کی ایک مثال﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ جھنڈا لے کر کچھ آگے بڑھے، اور یاد آیا کہ کچھ پوچھنا ہے۔ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا تھا: ﴿وَلَا تَلْتَفِتْ﴾ دائیں بائیں مت دیکھو۔ اب یاد آیا ہے اور پوچھنا ہے تو ایسا نہیں کیا کہ پیچھے گھوم گئے، بلکہ جھنڈا پکڑ کر اسی ہیئت پر کھڑے ہو گئے، نہ دائیں دیکھ رہے ہیں، نہ بائیں دیکھ رہے ہیں، بلکہ وہیں سے زور سے آواز لگا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ رہے ہیں۔ یہ نہیں سوچا کہ پوچھنا ہے تو چلو وہاں جا کر پوچھ لیتے ہیں۔ ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی تھی ﴿وَلَا تَلْتَفِتْ﴾ اگر واپس جائیں گے تو اس حکم کے خلاف ہو جائے گا اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ہم اور آپ ہوتے تو سوچتے کہ میرا مقصود اللہ کے رسول کا حکم توڑنا تھوڑا ہی ہے، بلکہ ایک بات کی صفائی کرنا مقصود ہے، ورنہ آگے بڑھ کر جا رہے ہیں۔ لیکن صحابہ کرام کے یہاں ظاہری طور پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا تھا۔

﴿ایک اور مثال﴾

ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد کی

طرف آرہے تھے، جہاں جوتے نکالے جاتے ہیں ابھی وہاں تک ہی پہنچے تھے اوران کے کان میں آواز آئی: ﴿اِجْلِسُوْا﴾ بیٹھ جاؤ۔ دراصل جواندر تھے ان کے لئے یہ کہا گیا تھا لیکن یہ آواز وہاں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے کان میں پہنچی، تو وہ اندر نہیں آئے، بلکہ وہیں بیٹھ گئے۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اندر والوں کو کہا گیا ہے۔ مَیں اور آپ ہوتے تو یہی سوچتے۔ وہاں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد کان میں پڑا؛ تو پھر اینچ پینچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

﴿جنگ کی بنیاد﴾

یہاں پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ وہیں اسی طرح کھڑے ہوگئے، نہ دائیں بائیں دیکھ رہے ہیں، نہ پیچھے دیکھ رہے ہیں، اب حضور تو دور ہو چکے تھے، اور پوچھنا ہے تو کیسے پوچھیں؟ اس لئے زور سے چلّا کر پوچھا: ﴿یارسول اللہ!عَلٰی مَاذَااُقَاتِلُ النَّاسَ؟﴾ اے اللہ کے رسول! مَیں ان سے کس بات پر اور کس بنیاد پر لڑوں اور جنگ کروں؟ ﴿قَالَ: قَاتِلْهُمْ حَتّٰی یَشْهَدُوْا أَن لَّآاِلٰـهَ اِلَّااللہ، وَأَنَّ مُحَمَّدًارسول اللہ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے قائل ہوجائیں۔

﴿فَاِذَافَعَلُوْاذَالِکَ، فَقَدْمَنَعُوْامِنکَ دِمَائَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ اِلَّابِحَقِّهَا﴾ جب وہ توحید و رسالت کا اقرار کرلیں گے اور ایمان لے آئیں گے؛ تو ان کی جان اور مال محفوظ ہوجائیں گے مگر اسی کلمہ کے حق کی وجہ سے۔ یعنی جہاں خود اسلام ہی جان یا مال لینے کا حق دیتا ہو؛ وہاں البتہ تعرض کیا جائے گا۔ مثلاً زکوٰۃ فرض ہونے کے باوجود کوئی آدمی ادا نہیں کرتا تو اس سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ یا کسی نے کسی کو قتل کیا تو مقتول کے بدلہ میں اس کی جان لی جائے گی۔ جہاں اسلام حکم دیتا ہے وہاں جان و مال لیا جائے گا؛ ورنہ ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا۔

﴿وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ﴾ زبان سے اقرار کرنے کے بعد دل میں کسی چیز کے اندر خیانت کریں گے تو ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس روایت کو اسی لئے لائے ہیں کہ دیکھو! حضور اکرم ﷺ کی طرف سے اعلان کے نتیجہ میں حضراتِ صحابہ کے دل میں آگے بڑھنے کے کیسے جذبات تھے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے

دعا

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ

كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى بِعَدَدِ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! تو ہمیں نیکی کی طرف زیادہ سے زیادہ سبقت کرنے کی اور اس کی طرف آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرما اے اللہ! نیکی کے کاموں میں ٹال مٹول کا جو مزاج ہے، اس مزاج کی اصلاح فرما کر عافیت کے ساتھ نیکی کے کاموں کی طرف سبقت کرنے اور آگے بڑھنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات اور عمل کے ذریعہ سے جو طریقے ہمارے لئے پسند فرمائے ہیں، ان طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق نصیب فرما۔ اے اللہ! نفس اور شیطان کی شرارتوں سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ حضور اکرم ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور آپ ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی؛ ان سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہم میں جو بیمار ہیں ان کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ

عطا فرما۔ جن بیماروں نے تندرستی کے لئے دعاؤں کی درخواست کی ہے ان کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جو لوگ قید و بند میں محبوس ہیں خاص کر عنقریب جن کے فیصلے آنے والے ہیں، اے اللہ! عافیت کے ساتھ ان کی رہائی کا سامان پیدا فرما اور رہائی کا فیصلہ فرما۔ ہماری دعاؤں کو نبی کریم ﷺ کے صدقے اور طفیل میں قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ

مجاہدہ

مجلس ﴿۱﴾

اقتباس

اللہ تبارک وتعالیٰ کے دشمن - چاہے وہ مشرکین ہوں یا ملحدین ہوں - ان کے مقابلہ میں جو کوشش کی جاتی ہے - چاہے تلوار کے ذریعہ سے ہو، یا زبان کے ذریعہ سے ہو، یا قلم کے ذریعہ سے ہو - اس کو جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے

اپنے نفس کے مقابلہ میں جو کوشش اور محنت کی جاتی ہے، اپنے اخلاق واعمال کو درست کرنے کے لئے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچانے کے لئے جو محنت اور کوشش کی جاتی ہے اس کو مجاہدہ کہا جاتا ہے

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں: جو آدمی نفس وشیطان کے سامنے کمزور پڑتا ہے، تو یہ دونوں اسی کے سامنے شیر بنتے ہیں، اور اگر کوئی آدمی ان کے مقابلہ کے لئے ڈٹ جائے، اور طے کرلے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، دل پر چاہے کیسے ہی آرے کیوں نہ چلنے لگیں، مَیں نفس کی خواہش پر چلنے والا نہیں ہوں تو پھر نفس وشیطان دونوں اس کے مقابلہ میں بھیگی بلّی بن جاتے ہیں

پھر دھیرے دھیرے ان کی طرف سے مقابلہ میں ڈھیلا پن پیدا ہوتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے اوپر جم جاتا ہے

پھر جیسا ہم نے نفس کو گناہوں کا، لذات اور خواہشات کا عادی بنایا تھا اور اسی میں اس کو مزہ اور لطف آتا تھا، جب مقابلہ کر کے اور اس کے تقاضوں کو دبا کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں اس کو لگائیں گے؛ تو پھر اس کو اسی میں لطف آئے گا اور لذت محسوس ہوگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿المجاھدة ۱﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد

فاعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم.

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (العنکبوت، پ۲۱)

وقال تعالیٰ: وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْن (الحجر، پ۱۴)

وقال تعالیٰ: وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاً (المزمل، پ۲۹)

﴿جہاد اور مجاہدہ میں فرق﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک باب قائم کیا ہے: ﴿باب فی المجاھدة﴾ مجاہدہ کے سلسلہ میں تفصیل بیان فرمارہے ہیں۔

مجاہدہ عربی زبان کا لفظ ہے جو جُھْدٌ سے بنا ہے ﴿جَاھَدَ، یُجَاھِدُ، مُجَاھَدَۃً، وجِھَادًا﴾ باب مفاعلہ سے آتا ہے۔ جہد و مشقت، محنت و کوشش اور تکلیف کے لئے بولا جاتا ہے، مجاہدہ کا معنٰی ہے محنت اور کوشش کرنا۔ جہاد بھی اسی سے بنا ہے، مجاہدہ بھی اسی سے بنا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے دشمن – چاہے وہ مشرکین ہوں یا ملحدین ہوں – ان کے مقابلہ میں جو کوشش کی جاتی ہے – چاہے تلوار کے ذریعہ سے ہو، یا زبان کے ذریعہ سے ہو، یا قلم کے

ذریعہ سے ہو-اس کو جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اپنے نفس کے مقابلہ میں جو کوشش اور محنت کی جاتی ہے، اپنے اخلاق واعمال کو درست کرنے کے لئے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچانے کے لئے جو محنت اور کوشش کی جاتی ہے اس کو مجاہدہ کہا جاتا ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب اسی کی اہمیت کو بتلانے کے واسطے قائم کیا ہے کہ مجاہدہ کتنا اہم اور ضروری ہے۔

﴿خواہشات کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ﴾

نفس کو اللہ تعالیٰ نے اس انداز سے بنایا ہے کہ وہ ہمیشہ لذت اور راحت کا خواہاں رہتا ہے، اس کو تو لذت مطلوب ہے، آپ نفس کو جن چیزوں کا عادی بنائیں گے، انہی چیزوں میں وہ لذت وراحت محسوس کرے گا۔اس کے تقاضوں اور خواہشات کو آدمی کتنا ہی پورا کرے اور ان تقاضوں اور خواہشات پر کیسا ہی عمل کرتا رہے؛ پھر بھی اس کی کوئی انتہا نہیں ہے زندگی بھر وہ اپنے نفس کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے؛ تب بھی اس کے تقاضہ پورے ہونے والے نہیں ہیں۔ایک تقاضہ پورا ہوا نہیں کہ دوسرا اس کی طرف سے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی طرف سے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک قوت عطا فرمائی ہے جو اس کو عمل کی طرف ابھارتی ہے، اسی کو نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔اور نفس کا حال ایسا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی چیزوں کی طرف آگے بڑھتا ہے جس میں اس کو لذت اور راحت محسوس ہو۔جس میں اس کو مزہ اور لطف آئے؛ ایسی چیزوں کو وہ ہمیشہ پسند کرتا ہے۔اور جیسا کہ مَیں نے عرض کیا کہ آپ اس کی لذتوں اور راحتوں کو پورا کرتے رہیے، اور اس کے کہنے کے مطابق کیسا ہی چلتے رہیے؛ پھر بھی

اس کے مطالبے ختم ہونے والے نہیں ہیں، اس کے مطالبوں کا سلسلہ تو جاری رہتا ہے۔

﴿......پھر آخر زنا بالجبر کیوں؟﴾

آج کل مغربی ممالک و اقوام کے یہاں ایک چیز خاص طور پر کہی جاتی ہے، جو اُن کے یہاں اصولِ موضوعہ کے قبیل سے ہے۔ ''ہیومن رائٹس'' (Human Rights) یعنی انسانی حقوق۔ انہی انسانی حقوق میں سے ایک چیز وہ یہ کہتے ہیں کہ آدمی کے اوپر کسی قسم کی پابندی نہیں لگنی چاہیے۔ آدمی اپنی ذات کے معاملہ میں آزاد ہو۔ گویا وہ اس طرح کی آزادی کے قائل ہیں کہ اس کے اوپر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے، نہ مذہب کے نام سے اور نہ معاشرے کے نام سے اور نہ اخلاق کے نام سے اور نہ قانون کے نام سے۔ بلکہ اس کی مرضی پر اس کو چھوڑ دیا جائے، وہ جس طرح چاہے اپنی مرضی کو پوری کرسکتا ہے۔ یہ ایک چیز ان کے یہاں بہت زیادہ عام ہوتی جارہی ہے۔ اس کو وہ حضرات بہت اہمیت دیتے ہیں اور اسی کے نتیجہ میں وہاں زنا بہت عام ہے۔ کوئی مرد یا عورت اپنی خواہش پوری کرنا چاہے، اور اپنی مرضی کے مطابق کسی کے ساتھ بھی تعلق قائم کرنا چاہے؛ تو وہاں قانونی طور پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ گویا زنا کی ان کو کھلی چھوٹ دی گئی ہے۔ اور اسی کو وہ ایک طرح کی آزادی سمجھتے ہیں اور اسی کے متعلق ان کا خیال یہ ہے کہ اس طریقہ سے انسانی حقوق کا تحفظ ہے۔ حالانکہ یہ بھی نفسانی خواہش کے پورا کرنے کی ایک راہ ہے؛ جو اُن کے لئے ہموار کی گئی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کی خواہشیں کتنی بھی پوری کی جائیں، وہ ختم ہونے والی نہیں ہیں۔

دیکھئے! وہاں اتنی زیادہ آزادی ہے، اس کے باوجود اخباروں میں ہم پڑھتے ہیں کہ زنا بالجبر (બળાત્કાર) جس کثرت سے امریکہ و یورپ میں پایا جاتا ہے؛ اتنا ان ممالک میں

-جہاں پابندی اور قانون لگے ہوئے ہیں-نہیں ہے۔آخر وہاں جب قانونی طور پر مرد کو بھی اور عورت کو بھی اتنی آزادی دے دی گئی کہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہیں؛ چلیں، اپنی خواہش کو جس طرح چاہیں؛ پوری کریں پھر آخر یہ زنا بالجبر کے واقعات کیوں پیش آتے ہیں؟

﴿مغربی تہذیب یا تعذیب﴾

حقیقت یہ ہے کہ قانونی رکاوٹیں ساری ختم کردی جانے کے باوجود-جب مرد اور عورت کو اس بات کی اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ اپنی خواہشات جس طرح چاہیں پوری کریں-یہ جو واقعات پیش آتے ہیں؛ اس کی فلسفیانہ توجیہ کرتے ہوئے یہی حضرات یہ بات خاص طور پر لکھتے ہیں کہ قانون کی طرف سے دی گئی یہ آزادی اور معاشرے کی طرف سے دی گئی اس چھوٹ کے نتیجے میں اپنی خواہشات تو پوری کرتے رہتے ہیں، لیکن اس کے بعد اب ان کا نفس آگے یوں چاہتا ہے کہ زنا بالجبر کا بھی لطف حاصل کیا جائے۔گویا وہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ بھی لطف اٹھانے کا ایک انداز ہے۔آج تک آزادی کے ساتھ تو زنا کرتے رہے، اب کسی پر زبردستی کر کے یہ کام کیا جائے تو اس میں کیا لطف آتا ہے؟ اس میں کیسا مزہ ہے؟ وہ بھی حاصل کرنا چاہیے۔اب ان کا نفس ان سے یہ مطالبہ کرتا ہے تو وہ اس انداز سے چلتے ہیں۔گویا نفس کی خواہشوں اور تقاضوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے اور قیامت تک ختم نہیں ہوگا۔اور آپ نفس کے تقاضوں کو جتنا پورا کرتے رہیں گے؛ اتنی ہی بے چینی بڑھتی جائے گی۔نفس کی خواہشات کو پورا کرنے کے نتیجے میں بے چینی میں کمی ہونے والی نہیں ہے۔

﴿یہ بے چینی کیوں؟﴾

یہی مغربی مما لک جہاں دولت کی ریل پیل ہے، پیسوں کی کوئی کمی نہیں، اسباب وو سائل وہاں موجود ہیں؛اس کے باوجود ان حضرات سے اگر یوں پوچھا جائے کہ سکون و اطمینان ہے؟ توان کا جواب ہوگا کہ سکون واطمینان حاصل نہیں۔ بلکہ ان میں سے اکثروں کا یہ حال ہے کہ وہ نیند کے واسطے گولیاں استعمال کرتے ہیں،ٹیبلیٹ اور گولی نہ کھالیں؛ وہاں تک ان کو نیند نہیں آتی۔آخر سارے اسبابِ راحت موجود ہونے کے باوجود ایسا کیوں؟ اور ان کے لئے نفسانی خواہشات پوری کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اس کے باوجود یہ بے چینی کیوں؟

لہٰذا ماننا پڑے گا کہ حقیقت میں چین اور سکون اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہی ہے:﴿أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب (الرعد، پ۱۳)﴾ اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہی دلوں کو اطمینان وسکون نصیب ہوتا ہے۔نفسانی خواہشوں کے پیچھے آدمی کتنا ہی چلتا رہے، اوراس کے تقاضوں کو کیسے ہی پورا کرتا رہے؛اس میں وہ کبھی بھی سکھ اور چین نہیں پا سکتا۔

﴿نفس اور شیطان کی ایک خاصیت﴾

مجاہدہ کا باب قائم کر کے ہمیں یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں اور اپنے اخلاق واعمال کی درستگی میں؛اپنے نفس کے مقابلہ میں ہمیں جو محنت اور مشقت لاحق ہو؛اس کو برداشت کرنا چاہیے اور کوشش میں لگے رہنا چاہیے،اسی کوشش اور محنت کا نام ''مجاہدہ'' رکھا گیا ہے۔

حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: جو آدمی نفس وشیطان کے سامنے کمزور پڑتا ہے، یہ دونوں اسی کے سامنے شیر بنتے ہیں۔اوراگر کوئی آدمی ان کے مقابلہ کے لئے ڈٹ

جائے، اور طے کرلے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، دل پر چاہے کیسے ہی آرے کیوں نہ چلنے لگیں مَیں نفس کی خواہش پر چلنے والا نہیں ہوں، اس کے تقاضے کو پورا کرنے والا نہیں ہوں؛ تو پھر نفس وشیطان دونوں اس کے مقابلہ میں بھیگی بلّی بن جاتے ہیں، پھر دھیرے دھیرے ان کی طرف سے مقابلہ میں ڈھیلا پن پیدا ہوتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے اوپر جم جاتا ہے، پھر جیسا ہم نے نفس کو گناہوں کا، لذات اور خواہشات کا عادی بنایا تھا اور اسی میں اس کو مزہ اور لطف آتا تھا، جب مقابلہ کر کے اور اس کے تقاضوں کو دبا کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں اس کو لگائیں گے؛ تو پھر اس کو اسی میں لطف آئے گا اور لذت محسوس ہوگی۔

﴿نفس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال﴾

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ- جو بڑے بزرگ گذرے ہیں ان- کا ''قصیدہ بردہ'' کے نام سے ایک قصیدہ ہے، جس میں نبی کریم ﷺ کی تعریف اور اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ اس قصیدے کو ترتیب دینے کے بعد انہوں نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور آپ کی خدمت میں یہ قصیدہ پیش کیا؛ تو آپ ﷺ نے ان کو ایک چادر عنایت فرمائی، اسی وجہ سے اس کا نام ''قصیدہ بردہ'' ہے۔ عام طور پر ایک درود آتا ہے، فضائل درود شریف میں بھی ہے: ؎

یَـا رَبِّ صَـلِّ وَسَـلِّمْ دَائِـمـاً أَبَـداً ۞ عَـلـىٰ حَبِیْبِکَ خَیْـرِ الْـخَـلْـقِ کُلِّهِمِ

وہ بھی اسی قصیدے کا ایک شعر ہے۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے فضائلِ درود شریف میں واقعات کے بعد کثرت سے اس شعر کو ذکر کیا ہے۔

بہر حال اسی ''قصیدہ بردہ'' میں نفس کی کیفیت اور حالت کو بیان کرنے کے لئے یہ

شعر بڑا عمدہ بیان فرمایا ہے:

اَلنَّفْسُ کَالطِّفْلِ اِنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ ❁ عَلیٰ حُبِّ الرَّضَاعِ وَاِنْ تُفْطِمْهُ یَنْفَطِمِ

نفس کا حال بچے کی طرح ہے، اگر ہم اس کو چھوڑ دیں گے، تو وہ دودھ پینے کی محبت کے معاملہ میں اور زیادہ تیز ہوگا، آگے بڑھے گا اور زیادہ قوت اختیار کرے گا۔ اور اگر اس کو زبردستی کر کے چھڑا دیں گے؛ تو وہ دودھ چھوڑ دے گا۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی غذا دودھ ہی ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کی خلقت اس انداز کی بنائی کہ ایک زمانہ تک دودھ پینے کے بعد اس کو خوراک پر لایا جاتا ہے دودھ کے لئے بھی شریعت نے مدتِ رضاعت دو سال مقرر کی ہے۔ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مدتِ رضاعت کے بعد بچے کو دودھ پلانا جائز نہیں ہے۔ (درمختار، ص ۲۱۱، ج ۳۔ دار الفکر) اس لئے کہ دودھ انسان کا ایک جزو ہے، اور انسان کے جزو کو اسی قدر استعمال کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؛ جتنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے۔ اور رضاعت کی مدت دو یا ڈھائی سال (علیٰ اختلاف الائمہ) مقرر کی گئی ہے، اس سے زیادہ ماں دودھ نہیں پلا سکتی؛ ورنہ گنہ گار ہوگی

لیکن بچہ دودھ کا عادی ہوتا ہے اور جب دودھ چھڑانے کا وقت آتا ہے، تو وہ بہت زیادہ چلاتا ہے، روتا اور شور مچاتا ہے، بے چین رہتا ہے۔ نہ خود سوتا ہے، نہ ماں باپ کو سونے دیتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کون ماں باپ ہوں گے جن کو اپنے بچے کے ساتھ محبت نہ ہو۔ لیکن وہ اس محبت کے تقاضے کو سامنے رکھ کر اگر یہ سوچیں کہ دودھ چھڑانے جائیں گے تو اس کو بڑی تکلیف ہوگی، لہٰذا اس کی اس تکلیف کا اور شور مچانے اور چیخ وپکار کا لحاظ کر کے اگر دودھ چھڑانے کی کوشش نہیں کریں گے؛ تو ظاہر بات ہے کہ جوان ہونے تک اس کا یہی سلسلہ

جاری رہے گا، اور وہ کبھی دودھ نہیں چھوڑے گا۔ اور جب تک دودھ نہیں چھوڑے گا وہاں تک غذا کا عادی بننے والا نہیں ہے۔ اس کے سامنے کیسی ہی غذا پیش کی جائے لیکن وہ اس کو استعمال نہیں کرے گا؛ جب تک کہ دودھ چھڑایا نہ جائے۔ اس لئے ماں باپ اپنی اس محبت کے باوجود- جو بچے کے ساتھ ہے- کوشش یہی کرتے ہیں کہ وہ دودھ چھوڑ دے، چاہے وہ کتنی ہی چیخ و پکار کیوں نہ کرے۔ اگر وہ شور مچائے، خود بھی بیدار رہے، ماں باپ کو بھی بیدار رکھے، سب کچھ ہوتا رہے؛ پھر بھی وہ ایسا نہیں سوچتے کہ اس کا دودھ نہ چھڑایا جائے، اس کو تکلیف ہو جائے گی اور جب تک وہ دودھ نہیں چھوڑے گا وہاں تک غذا پر نہیں آئے گا۔ اور وہ دودھ اس وجہ سے نہیں چھوڑ رہا ہے کہ اس کو دودھ میں لذت اور مزہ آ رہا ہے۔ لیکن اس کو معلوم نہیں ہے کہ اس کا دودھ چھڑا کر اس کے لئے غذاؤں کا سلسلہ شروع کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ دودھ میں تو ایک ہی قسم کی لذت ہے، لیکن اس کے بعد جب غذائیں کھانا سیکھ لے گا اور غذاؤں پر اس کا گذارہ ہو جائے گا؛ تو عجیب و غریب قسم کی لذتیں اور قسم قسم کے ذائقے حاصل ہوں گے۔ لیکن چونکہ وہ ذائقے ابھی اس کے سامنے آئے نہیں ہیں، اس لئے یوں سمجھئے کہ وہ کنویں کا مینڈک ہے، اور ایک محدود دائرہ میں ہے، اسی لئے شور مچا رہا ہے کہ مجھ سے میری لذت چھینی جا رہی ہے۔ حالانکہ ایک لذت چھین کر اس کو سینکڑوں لذتیں دئے جانے کے اسباب مہیا کئے جا رہے ہیں۔ یہی حال نفس کا ہے کہ گناہوں کا عادی ہو جانے کی وجہ سے آپ اس سے گناہ چھڑانے کی بات کریں گے؛ تو اس کو بڑا شاق گذرے گا۔

اگر نفس کو بدزبانی کے اندر؛ یا غیبت کے اندر مزہ آتا ہے کہ کسی موقعہ پر کسی مجلس میں کسی کا تذکرہ آ گیا تو خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر بدنگاہی کی عادت

پڑ گئی تو اس میں بھی بہت لطف آتا ہے۔ اگر رشوت لینے کی عادت ہے تو اس میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔ اگر سود کھانے کی عادت ہے تو اس میں بھی بڑا اچھا لگتا ہے۔ جس جس گناہ کا وہ عادی بنا ہوا ہے، اس میں وہ بڑا لطف محسوس کرتا ہے۔ اور جب وہ گناہ چھڑانے کوشش کی جاتی ہے، تو اس کو بڑا بھاری معلوم ہوتا ہے، اس لئے ان بری عادتوں کو چھوڑنے سے انکار کرتا ہے لیکن آدمی کو چاہیے کہ اس کے مقابلہ پر خوب ڈٹ جائے اور سوچے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے ہمیں یہ کام نہیں کرنے ہیں تو پھر ان شاء اللہ اس کا یہ مطالبہ خود ہی ڈھیلا ہو جائے گا اور پھر دھیرے دھیرے اس مطالبے کو چھوڑ کر وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری پر راضی ہو جائے گا

اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے ❁ آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اپنے دل کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے قابل بنانا چاہتے ہیں، تو ہمیں جن گناہوں کی عادتیں پڑی ہوئی ہیں، ذرا تکلیف اٹھا کر؛ محنت اور کوشش کر کے گناہوں کی ان عادتوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ اور ایک مرتبہ گناہوں کی عادتیں اگر ہم نے چھوڑ دیں اور نفس کا مقابلہ کر لیا اور اس کے مقابلہ میں ڈٹ گئے؛ تو پھر ان شاء اللہ بہت ہی آسانی کے ساتھ اس کا مقابلہ کر سکیں گے۔

نفس عادت سے مجبور

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ نفس کو تو لذت اور مزہ چاہیے، وہ تو لذت اور مزہ کا خواہاں ہے، لیکن اس کے یہاں لذت اور مزہ کی کوئی شکل متعین نہیں ہے۔ ابھی چونکہ اس کو گناہوں کا عادی بنا رکھا ہے، اس لئے اس کو گناہوں میں لذت ومزہ آرہا ہے، جب ہم اس کا مقابلہ کر کے اور اس پر محنت اور کوشش کر کے گناہوں کی عادتیں

چھڑائیں گے، اور اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کا عادی بنائیں گے؛ تو اسی میں وہ لذت محسوس کرے گا اور اسی میں اس کو مزہ آئے گا۔ جیسا ہم اس کو عادی بنائیں گے؛ ویسا اس کو مزہ آئے گا۔ لذت اور مزہ تو اس کی عادت پر موقوف ہے، چونکہ ہم نے اس کی عادت بگاڑ رکھی ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ محنت اور کوشش کر کے بگڑی ہوئی عادتوں کو سدھارا جائے اور اس کی اصلاح کی جائے۔ اور اس کا آسان راستہ یہی ہے کہ ذرا تکلیف اٹھا کر، محنت اور کوشش کر کے اس کے مقابلہ میں ڈٹ جائے، چاہے دل پر کیسے ہی آرے چلیں اسی کو ''مجاہدہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

﴿بدنگاہی سے بچنے کی آسان تدبیر﴾

مثلاً کوئی عورت گذر رہی ہے اور دل تقاضہ کر رہا ہے کہ اس کی طرف نگاہ اٹھاؤ؛ اس وقت مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ، اور سوچو کہ کچھ بھی ہو جائے؛ مَیں نگاہ نہیں اٹھاؤں گا، اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا، جو ہونا ہے؛ وہ ہو۔ ایک مرتبہ اگر ایسا کر لیا تو دوسری مرتبہ تقاضہ ہوگا لیکن اتنی شدت کے ساتھ نہیں ہوگا، اس میں کمی آئے گی اور پھر دھیرے دھیرے کمی ہوتے ہوتے معاملہ ختم ہو جائے گا اور پھر نفس اطاعت وفرمانبرداری کا عادی ہو جائے گا

﴿تصوف کا حاصل﴾

حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: ایک بات تصوف کا خلاصہ اور حاصل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی کسی عبادت واطاعت میں سُستی کرنے لگے؛ تو اس کا مقابلہ کر کے وہ اطاعت بجا لائے۔ اور اگر کسی گناہ سے بچنے میں سُستی کرنے لگے؛ تو اس کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچ جائے۔ اگر اس کا مقابلہ کر کے اطاعت

بجالائیں گے، اور اس کا مقابلہ کر کے گناہ سے اپنے آپ کو بچالیں گے؛ اور چند دنوں تک اگر یہ سلسلہ برابر جاری رہا؛ تو اسی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی۔ اور جوں جوں یہ سلسلہ آگے بڑھتا جائے گا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت میں اضافہ ہوگا۔ اور جتنا محبت میں اضافہ ہوگا؛ اتنا ہی تکلیفوں کے اٹھانے میں مزہ آئے گا اور لذت محسوس ہوگی۔

﴿ محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے ﴾

جیسے ایک ماں ہے، سردیوں کا زمانہ ہے، اس کے پاس اس کا بچہ بھی لیٹا ہوا ہے، آدھی رات کو جبکہ خوب کڑاکے کی سردی ہو رہی تھی، اُس وقت بچے نے پیشاب کر دی، اس کے کپڑے بھیگ گئے، بستر بھیگ گیا، لحاف بھی بھیگ گیا۔ اب کیا ماں یوں سوچے گی کہ ایسی سردی میں کون اٹھے؟ نہیں! بلکہ ماں فوراً اٹھے گی، اس کے کپڑے بدل دے گی، اور جو کپڑا خراب ہوا ہے اس کو بھی دھو دے گی، بستر بھی تبدیل کر دے گی۔ حالانکہ سخت کڑاکے کی سردی میں آدھی رات کے وقت اس طرح اٹھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، لیکن چونکہ اسے اپنے بچے کے ساتھ محبت اور تعلق ہے، اس وجہ سے وہ ساری مشقتوں اور تکلیفوں کو خوب لطف لے کر برداشت کرتی ہے۔

چنانچہ جس عورت کا بچہ نہیں ہے اس کو دیکھئے کہ وہ لوگوں سے درخواست کرتی ہے کہ میرے لئے دعا کرو کہ مجھے بچہ نصیب ہو جائے۔ جہاں تعویذ گنڈے ملتے ہیں وہاں بھی پہنچ جاتی ہے۔ خوب منتیں اور نذر و نیاز بھی مانتی ہے۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں کے پاس بھی جاتی ہے کہ میرا کچھ علاج ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ بچہ ہو جائے۔ اب اگر کوئی اس سے یوں کہے کہ

اللہ کی بندی! کیا پاگل ہوگئی ہے کہ بچہ مانگ رہی ہے؟ جب بچہ پیدا ہوجائے گا تو سردی کے زمانہ میں راتوں کو تجھے اٹھنا پڑے گا، اس کو کپڑے بدلوانے پڑیں گے، بستر ٹھیک کرنا پڑے گا؛ محنت و مشقت اور سردی برداشت کرنی پڑے گی۔ تو وہ کہے گی کہ اس بچے کی محبت کے اندر مَیں سب برداشت کروں گی، اس کے واسطے تو ہزاروں راتیں قربان ہیں۔ جس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے بچے کے لئے دعا کر رہی ہے تو اس کو معلوم ہے کہ وہ کیا مطالبہ کر رہی ہے؟ گویا وہ ان تکلیفوں کو مانگ رہی ہے۔ لیکن چونکہ اس کے دل میں بچے کی محبت ہے، اس وجہ سے اس کو بچہ چاہیے، اور اس محبت کی وجہ سے وہ ان ساری چیزوں کو آسانی کے ساتھ برداشت کر لیتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی جب آدمی کی محبت قائم ہوجاتی ہے؛ تو یہ ساری محنتیں اور مشقتیں آدمی کے لئے آسان ہوجاتی ہیں۔

اے شمع! تیری عمر طبیعی ہے ایک رات

ایک بات اور یاد رکھیں کہ مجاہدہ تو کرنا ہی ہے، تکلیف تو اٹھانی ہی ہے اور محنت و مشقت میں تو اپنے آپ کو ڈالنا ہی ہے، یہ بات تو طے ہے۔ جب آدمی دنیا کے اندر آتا ہے تو یہاں کا حال یہ ہے کہ کوئی بھی چیز محنت اور مشقت سے خالی نہیں ہے۔ آدمی یہ چاہے کہ صرف آرام مل جائے تو معلوم ہونا چاہیے کہ صرف آرام کی جگہ تو جنت ہے؛ جہاں آرام کے اندر کسی قسم کی مشقت یا تکلیف کی ذرّہ برابر بھی ملاوٹ نہیں: ؎

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد ❁ کسے را با کسے کارے نباشد

لیکن دنیا کا کوئی آرام ایسا نہیں؛ جس میں کوئی تکلیف نہ ہو۔

مثلاً آپ کھانا کھائیے، کتنی ہی لذت حاصل کیجیے، لیکن اس کھانے کے نتیجہ میں بعد

میں قضائے حاجت کا تقاضہ ہوگا۔ پیشاب پاخانہ کوئی رغبت کی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی بھی لذت کا کام کر لیجیے، اس کے نتیجہ میں بعد میں کچھ نہ کچھ پریشانی اور مشقت تو آپ کو اٹھانی ہی پڑے گی۔ لہٰذا دنیا کی ہر لذت اپنے اندر کچھ نہ کچھ تکلیف لئے ہوئے ہے۔ آپ دنیا میں یوں چاہیں کہ خالص لذت حاصل ہو؛ یہ ممکن ہی نہیں۔ دنیا میں تکلیف تو اٹھانی ہی ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ اس تکلیف کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اٹھا کر اس کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کریں۔ یا پھر یہ ہے کہ مفت کی تکلیفیں بھی اٹھائیں اور اس کا کوئی فائدہ آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی نزدیکی وقرب کی شکل میں حاصل نہ ہو۔ چاہیں تو یہ راستہ اختیار کریں، چاہیں تو وہ راستہ اختیار کریں۔

پھر ایک وقت آئے گا کہ..........

جیسے کہ صبح نماز کا وقت ہوا، اذان کی آواز آئی، اب نیند کا مزہ چھوڑ کر تکلیف اٹھا کر مسجد جانا ہے۔ نفس نے سوچا کہ کون جائے، پڑے رہو۔ ٹھیک ہے نہیں گئے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور وہ ایسا آدمی ہے کہ جس کی خاطر آپ انکار بھی نہیں کر سکتے، اس لئے اٹھنا ہی پڑا۔ ویسے تو آپ چاہتے تھے کہ راحت چھوڑ کر کہاں مسجد میں جائیں، لیکن یہاں ایک ایسا آدمی آ گیا کہ اس کی خاطر نیند کو قربان کر کے دروازہ کھولنا ہی پڑا۔ تو جو مشقت مقدر میں تھی وہ تو اٹھانی ہی پڑی۔ اگر اس مشقت کو اللہ تعالیٰ کے نام پر اٹھاتے تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی اور آخرت میں بھی کارآمد ہوتی، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا، لیکن دوسرے طریقہ سے اٹھائی تو اس کا کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے نفس کے مقابلہ میں ہمیں جو محنت، مشقت اور تکلیف ہوتی ہے؛ اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کریں۔ ہمت سے

کام لیں اور جیسا کہ عرض کیا کہ اگر ہم ہمت سے مقابلہ کرتے رہیں گے اور ڈٹ جائیں گے؛ تو پھر ایک وقت آئے گا کہ نفس آپ ہی آپ مطیع اور فرمانبردار ہو جائے گا۔

﴿نفس کی قسمیں﴾

اسی لئے علماء نے نفس کی قسمیں بتلائی ہیں۔ایک نفس امّارہ کہلاتا ہے۔ایک نفس لوامہ ہے اور ایک نفس مطمئنّہ ہے۔امّارہ تو وہ ہے جو آدمی کو برائی کا حکم دیتا ہے،لیکن اسی امّارہ کا ہم ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہیں گے؛تو پھر ایک وقت آئے گا کہ وہ ہم کو گناہ کے کاموں پر ملامت کرنے لگے گا۔نفسِ امّارہ اب نفسِ لوّامہ بن جائے گا۔اور پھر ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ نفس نیکی اور اطاعت کے اوپر جم جائے گا؛جس کو مطمئنّہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿انگلی پکڑ کے راستہ دکھائیں گے﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پہلی آیت پیش کی ہے:﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ باری تعالیٰ کا وعدہ نقل کیا کہ جو لوگ ہمارے راستہ میں محنت ومشقت اٹھاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں؛تو ہم ان کو اپنے راستے بتلاتے ہیں۔

حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ کا ترجمہ کیا ہے:''ہم اس کو انگلی پکڑ کر اپنے راستوں پر لے چلیں گے''یعنی اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اگر ہم مشقت اٹھائیں گے تو گویا اللہ تعالیٰ ہی ہمیں وہ راستے آسانی سے طے کرا دیں گے۔ایک مرتبہ ہماری طرف سے کچھ ہمت ہو جانی چاہیے۔جب ہم ہمت کرلیں گے ؛تو آگے اللہ تعالیٰ معاملہ آسان فرما دیں گے۔﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾اور اللہ تعالیٰ نکوکاروں کے ساتھ ہیں۔

﴿عبادت کرو موت تک﴾

دوسرا ارشاد نقل کیا: ﴿وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَأۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ﴾ مجاہدہ کی طرف ترغیب دی جارہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت اور فرمانبرداری اور اطاعت کا سلسلہ موت تک جاری رہنا چاہیے، اس میں کمی نہیں آنی چاہیے۔ ''اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہو؛ یہاں تک کہ موت آجائے'' (اس طرف بھی اشارہ کردیا کہ حقیقی بندگی کی ابتدا مجاہدہ کے بعد ہوتی ہے) مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ والا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہے؛ بلکہ موت تک اس کو جاری رکھنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مشغول رہنا ہے۔

﴿وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلۡ اِلَیۡهِ تَبۡتِیۡلاً﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام لو، اس کو یاد کرو؛ اور سب کو چھوڑ کر اسی کی طرف متوجہ ہوجاؤ۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ﴿اَیۡ اِنۡقَطَعَ اِلَیۡهِ﴾ سب لوگوں سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجاؤ۔ سب سے کٹنے کے واسطے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے واسطے ہمیں کچھ محنت اور مجاہدے سے کام لینا پڑے گا۔

﴿محنت بے کار نہیں جائے گی﴾

﴿فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ (الزلزال پ۳۰)﴾ جو آدمی ذرہ برابر بھی نیکی کا کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بدلہ ملے گا۔

پیلے اور زرد رنگ کی ایک چیونٹی آتی ہے، اس کو عربی میں ''ذَرَّةٌ'' کہتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر آپ کسی کاغذ یا روٹی کا وزن کرلیجیے کہ کتنے گرام ہے، اور پھر ایسی کئی سو چیونٹیاں رکھ کر وزن کرلیجیے؛ تو وزن میں ذرہ برابر فرق آنے والا نہیں ہے۔ ایسا چھوٹا اور معمولی سا کام

بھی اگر نیکی کا کریں گے؛ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بدلہ ملے گا، اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر چیز موجود ہوگی۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے: ﴿فَمَن يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ. وَمَن يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ﴾ اگر نیکی کا چھوٹا سا کام کروگے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بدلہ ملنے والا ہے، اور برائی کا بھی چھوٹا سا کام کروگے؛ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بدلہ بھی ملنے والا ہے۔

﴿حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور فقیر﴾

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک سائل آیا، حضرت نے اس کو چند کھجوریں دیں، اس وقت آپ کے پاس اتنی ہی تھیں۔ جو تھیں؛ وہ دے دیں۔ بعض سائل ناراض ہوتے ہیں کہ اگر ان کو کوئی معمولی چیز دو؛ تو قبول نہیں کرتے۔ اس نے قبول کرنے میں انکار کیا۔ اس پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: قرآنِ پاک میں تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَمَن يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ﴾ معمولی اور چھوٹا سا ذرہ برابر بھی نیکی کا کام کریں گے، تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرتے ہیں، اور میں جو دے رہا ہوں اس میں تو کئی مثقال ہیں، وہ بھی قبول کرنے کے لئے تو تیار نہیں ہے۔ (قرطبی)

﴿اس کو کیا ہو گیا؟﴾

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو معمولی سا عمل بھی موجود ہوگا۔ ہمارے اعمال نامہ میں ساری چیزیں محفوظ ہیں: ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا أَحْصٰهَا﴾ (الکہف، پ۱۵) جو گنہ گار ہوں گے وہ قیامت میں دیکھیں گے کہ چھوٹا بڑا ہر کام اس میں لکھا ہوا ہے؛ تو ان کو تعجب ہوگا کہ اس میں تو ہر چیز کا ریکارڈ موجود ہے۔ وہاں ساری چیزیں محفوظ ہوتی ہیں اس لئے آدمی یوں نہ سمجھے کہ میں گناہ کا کام کروں گا تو وہ چھپ جائے گا۔ یا نیکی کا کام کروں

گا تو اس پر کوئی بدلہ نہیں ملے گا۔ دنیا میں تو ایسا ہوسکتا ہے کہ جس کو راضی کرنے کے لئے آپ کوئی کام کر رہے ہیں، ممکن ہے کہ اس کو یاد بھی نہ آئے، یا اس کی نگاہ میں وہ کام نہ آوے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں تو نیکی کے معمولی کام پر بھی بدلہ دیا جائے گا اس لئے نیکی کے کام میں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کام میں آگے بڑھتے رہیے: ﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا﴾ (المزمل، پ۲۹) تم جو کچھ بھی نیکی اپنے لئے آگے پیش کروگے، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو پاؤ گے، وہ بہتر بھی ہے اور اجر کے اعتبار سے بھی بہت اچھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی کا کوئی بھی کام ضائع ہونے والا نہیں ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں محفوظ بھی ہے؛ اور اس کا بدلہ بھی ملنے والا ہے۔

﴿ دو گناہوں پر لڑائی کا اعلان ﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: اِنَّ اللهَ تَعَالٰى قَالَ: مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ. وَمَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ أَحَبَّ اِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطُشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا. وَاِنْ سَأَلَنِيْ أَعْطَيْتُهُ، وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِيْ لَأُعِيْذَنَّهُ.

یہ حدیثِ قدسی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جو میرے کسی ولی کے ساتھ دشمناوٹ رکھے؛ اس کو میری طرف سے لڑائی کا اعلان ہے۔ بہت بڑی بات ہوگئی۔ دو چیزیں ایسی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ ایک کا تذکرہ قرآنِ پاک میں ہے اور دوسرا اس حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سود کی حرمت کا جب حکم نازل ہوا اور جن لوگوں کے سود کے

معاملے پہلے ہو چکے تھے ان کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید کی گئی کہ تمہارا جو سود لوگوں کے اوپر باقی نکلتا ہے، اس کو چھوڑ دو ﴿فَاِن لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (البقرۃ، پ۳) اگر اس کو نہیں چھوڑو گے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کا اعلان ہے۔ بقیہ سود چھوڑنے کا حکم دیا گیا اور نہ چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لڑائی کا اعلان قرآنِ پاک میں کیا گیا ہے۔ اور یہ دوسری چیز ہے جس کا تذکرہ حدیثِ پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جو میرے کسی ولی اور دوست کے ساتھ دشمناوٹ رکھے تو میری طرف سے اس کو لڑائی کا اعلان ہے۔

﴿ولی کسے کہتے ہیں؟﴾

شرح عقائد کے اندر علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے ولی کی یہ تعریف بیان کی ہے:-

﴿اَلْعَارِفُ بِاللّٰهِ وَصِفَاتِهٖ وَالْمُوَاظِبُ عَلٰی طَاعَاتِهٖ وَالْمُنْصَرِفُ عَنِ الْمَعَاصِیْ وَالْاِنْهِمَاکُ فِی الْمُبَاحَاتِ﴾ (شرح عقائد ص۱۴۵،۱۴۴) اللہ کا دوست اور ولی وہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی واقفیت رکھنے والا اور اس کو پہچاننے والا ہو، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری پر مواظبت اور ہمیشگی کرنے والا ہو، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے والا ہو، اور جو چیزیں مباح ہیں کہ جن میں مشغولی کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے غفلت پیدا ہوتی ہے؛ اس سے بھی اپنے آپ کو بچانے والا اور باز رکھنے والا ہو۔ معلوم ہوا کہ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچا کر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا اہتمام کرتا ہو؛ اسی کو ولی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو میرے کسی ولی اور دوست کے ساتھ دشمناوٹ رکھتا ہے؛ تو میری طرف سے اس کو اعلانِ جنگ ہے۔

﴿ایک عام مزاج﴾

آج کل اس زمانہ میں جہاں اور فتنے ہیں وہاں ایک بہت بڑا فتنہ یہ بھی ہے۔ حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی مجلس میں حاضری کی اللہ تعالیٰ نے سعادت عطا فرمائی۔ حضرت رمضان المبارک کے اندر بھی اکثر اس چیز کو خاص طور پر فرمایا کرتے تھے: کہ بھائی! یہ جو اہل اللہ ہیں ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی گستاخی سے اپنے آپ کو بچانے کا بڑا اہتمام ہونا چاہیے۔

آج کل ایک عام مزاج بن گیا ہے، جو دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کے معاملہ میں تو لوگ احتیاط کرتے ہیں؛ لیکن جو حیات ہیں یعنی ان کے زمانہ میں موجود ہیں، ان کے متعلق چونکہ مخالفین کی طرف سے غلط فہمیاں بھی پھیلائی جاتی ہیں، لوگوں کے دلوں میں بدگمانیاں ڈالنے کی کوششیں کی جاتی ہیں؛ ان کے متعلق بعض لوگ برائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو! اگر کسی کے متعلق آپ کے دل میں عقیدت نہیں ہے اور آپ ان سے بیعت نہ ہوتے ہوں؛ تو نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ سوال نہیں ہوگا کہ اس سے عقیدت کیوں نہیں رکھی، لیکن اس کے متعلق بدگمانی رکھنا یا اس کی برائیوں میں اپنے آپ کو مشغول کر دینا؛ بالکل صحیح نہیں ہے۔ اگر کسی بات میں اس کی طرف سے کوتاہی پائی بھی گئی، اور آپ نے اپنی آنکھوں سے اس کو کسی برائی میں دیکھ لیا، لیکن اس کے عام حالات نیکی کے ہیں؛ تو اس ایک برائی کی وجہ سے اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ رات کو تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے آنسو بہا کر اس برائی سے توبہ کر کے وہ تو اپنے آپ کو پاک کر لے؛ اور ہم اس کی برائی اور غیبت میں اپنے آپ کو مشغول کر کے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کریں اور اس کے بعد توبہ کی توفیق بھی نہ ہو۔

آج کل ایک عام مزاج اہل اللہ کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے مقبول بندے ہوتے ہیں اور بعض لوگ ان کی برائیوں میں لگے ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے رفعِ درجات کے لئے یہ انتظام بھی ہوتا ہے۔ایسے لوگ جو دوسروں کے دلوں میں بدگمانیاں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں،ان کی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے۔کوئی ایسی بات کرے تو اس کو سننا ہی نہیں چاہیے۔یہ ہمارے لئے آزمائش ہوتی ہے،اور ان حضرات کے متعلق اپنے قلب کو پاک صاف رکھنا چاہیے۔اگر ان کے متعلق ہمارے دل میں خدانخواستہ کوئی بدگمانی پیدا ہوگئی اور ہمارے دل میں عداوت کا جذبہ پیدا ہوگیا؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔

﴿انداز ہ لگایئے﴾

آپ اندازہ لگایئے کہ دنیا کا کوئی معمولی سا آدمی مثلاً سورت کا پی آئی (پولیس انسپکٹر) اگر کسی کو دھمکی دے دے کہ مَیں دیکھ لوں گا؛ تو اس کی رات کی نیند حرام ہوجائے گی جب اس کی طرف سے ملنے والی دھمکی کا یہ اثر ہے،حالانکہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ذرا سے ایک اشارہ سے اس کا عہدہ چھن سکتا ہے اور اس کا معاملہ ختم ہوسکتا ہے،اس کے آگے پھر صوبائی طور پر پولیس کا جو بڑا ہے،اور ملک کا بڑا ہے،اس کا مقام تو بہت اونچا ہے، لیکن ان سب کی اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔دنیا کے معمولی عہدے والے یہ لوگ جن کے پاس دنیا کا معمولی اقتدار اور حکومت ہے،ان کی طرف سے جب کسی کو دھمکی مل جاتی ہے؛ تو اس کی راتوں کی نیند حرام ہوجاتی ہے اور بے چین ہوجاتا ہے،اور وہ اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ کس طرح مَیں اس کو خوش کروں اور اس کے عتاب سے اپنے آپ کو بچالوں؛ تو

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کسی کو دھمکی دے دی جائے تو پھر وہ کیسے آرام اور راحت سے رہ سکتا ہے؟ اس لئے ہمیں کسی بھی اہل اللہ کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے﴾

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی زبانی بھی سنا اور حضرت نے آپ بیتی میں بھی لکھا ہے، حضرت کے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جب انتقال ہوا تو ایک بزرگ تعزیت کیلئے تشریف لائے، ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے بھی گئے، ان کو کشفِ قبور ہوتا تھا، وہاں سے جب واپس آئے؛ تو انہوں نے کہا: مَیں نے مراقبہ کیا تو تمہارے والد سے گفتگو ہوئی، انہوں نے تمہیں تین باتوں کی تاکید فرمائی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ والوں سے ڈرتے رہنا کیونکہ ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ مَیں نے دل میں کہا کہ اُلٹی تو اُلٹی ہی ہوتی ہے، کوئی بھی ہو، اللہ والا ہو یا دنیا والا ہو، اُلٹی کو تو اُلٹی ہی کہا جائے گا، سیدھا کیسے کہیں گے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس چیز کی بڑی تاکید کی تھی۔ پھر ایک طویل زمانہ کے بعد اس کا مطلب سمجھ میں آیا۔

ہوا یہ کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو جاتے وقت آپ نے مدرسہ مظاہر علوم کا سارا نظم ونسق حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے کیا جو حافظ صاحب سے مشہور ہیں یہاں ایک شخص تھا جو حافظ صاحب کا مخالف تھا، وہ حافظ صاحب کے متعلق یہاں سے حضرت سہارنپوری کے نام جھوٹی شکایتوں کے خطوط لکھتا رہتا تھا۔ بار بار وہاں خطوط پہنچ رہے ہیں، ہر آٹھ دس دن میں ایک خط پہنچ رہا ہے۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ

فرماتے ہیں کہ انہوں نے میرے اوپر کہلوایا کہ آپ حافظ صاحب سے کہیے کہ فلاں آدمی کے خطوط بار بار تمہاری شکایتوں سے بھرے ہوئے حضرت کے اوپر آتے رہتے ہیں۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ مَیں نے حضرت حافظ صاحب سے کہنے کے بجائے حضرت رائپوری کو خود ہی اس کا جواب لکھا کہ یہ تو جھوٹا آدمی ہے اور جھوٹی شکایتیں کرتا رہتا ہے؛ آپ کو تو معلوم ہے۔ اس پر حضرت رائپوری نے مجھے لکھا اور تاکید کی کہ حافظ صاحب سے کہیے کہ اس آدمی کو اس طرح جھوٹی شکایتیں لکھنے کا بھی موقع نہ دیں؛ اس لئے کہ جب حضرت کی خدمت میں بار بار یہ باتیں پہنچیں گی تو آپ تو جانتے ہیں کہ جھوٹی بات بھی جب بار بار کہی جاتی ہے؛ تو ایک زمانہ کے بعد آدمی کے دل پر وہ اثر کرتی ہے۔

گوبیل کا اصول ہے (ہٹلر کا وزیر اطلاعات تھا جس کا نام گوبیل تھا اس نے لکھا ہے) کہ جھوٹ کو جب بار بار بولتے اور دوہراتے رہیں گے تو لوگ اس کو سچ سمجھ جائیں گے۔ ایک جھوٹ کو جب دس بیس آدمی دوہرا رہے ہیں تو آدمی سوچے گا کہ یہ سب تو جھوٹے نہیں ہو سکتے آخر اس کے دل میں وہ اثر کرتا ہے۔ حضرت رائپوری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ جھوٹا ہے، لیکن حافظ صاحب سے کہیے کہ وہ اس طرح سے بار بار لکھتا ہے، جس کی وجہ سے حضرت کے قلب پر اگر اس کا اثر ہوا اور کدورت آ گئی، اور دل میں میل آ گیا؛ تو اس کی وجہ سے حافظ صاحب فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے۔

﴿ان کے لئے برے خاتمہ کا اندیشہ ہے﴾

معلوم ہوا کہ اللہ والوں کے دلوں کی زمین پر معمولی سی کدورت کا آ جانا؛ یہ بھی آدمی کے لئے خطرے کا باعث بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کے معاملہ میں بڑے حساس ہیں اور ان کی بہت زیادہ حفاظت کا اہتمام فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی معمولی

چیز بھی ان کی شان میں کسی کی طرف سے ایسی پائی گئی؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقت پر اس کا انتظام ہوتا ہے۔اسی لئے جو لوگ اہل اللہ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں؛ ان کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ ان کے لئے سوءِ خاتمہ اور برے انجام کا اندیشہ ہے۔

﴿نمبر اول پر یہ چیز ہے﴾

اس کے بعد باری تعالیٰ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: ﴿وَمَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ أَحَبَّ اِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ﴾ مَیں نے اپنے بندے پر جو چیز فرض کر رکھی ہے،اس سے زیادہ کوئی چیز میری نزدیکی اور قرب حاصل کرنے کے لئے مجھے محبوب نہیں ہے۔یعنی آدمی اللہ تعالیٰ کا جو قرب اس کی فرض کی ہوئی چیزوں سے حاصل کرتا ہے،اس سے زیادہ اللہ کو اور کوئی چیز پسند نہیں۔اور بات بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں لازم کی گئی ہیں ان کو تو انجام دینا ہی ہے۔آدمی اگر فرائض کو ادا نہ کرے،اس میں کوتاہی کرے؛ تو گنہ گار ہوگا مثلاً نماز اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کی گئی ہے،اگر آدمی اس کو ادا نہیں کرتا،تو وہ فاسق وفاجر اور گنہ گار ٹھہرتا ہے،عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔یہ خاص اور اہم چیز ہے۔

بعض لوگوں کا مزاج ہوتا ہے کہ وہ نوافل کا تو بہت اہتمام کرتے ہیں لیکن فرائض کو چھوڑ دیتے ہیں۔رمضان کا مہینہ آیا تو تراویح پڑھنے جائیں گے؛ لیکن پانچ وقت کی فرض نماز نہیں پڑھیں گے۔اور اگر تراویح کی برکت سے عشاء کی نماز پڑھ لی تو پڑھ لی؛ لیکن چار وقت کی نماز نہیں پڑھیں گے۔عید کی نماز کا اہتمام کرتے ہیں؛ لیکن روزانہ کی پانچ وقت کی فرض نماز کو ادا نہیں کرتے۔تو فرائض کا اہتمام بہت ضروری ہے،اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوسکتا۔نمبر اول پر یہ چیز ہے۔

﴿پھر وہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے﴾

اس کے بعد نمبر دو پر مزید قرب حاصل کرنے کے لئے فرماتے ہیں: ﴿وَمَا يَزَالُ عَبْدِیْ يَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی أُحِبَّهُ﴾ اور بندہ برابر نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ مَیں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب مَیں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو مَیں اس کا کان بن جاتا ہوں؛ جس سے وہ سنتا ہے۔ مَیں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں؛ جس سے وہ دیکھتا ہے۔ مَیں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں؛ جس سے وہ چھوتا اور پکڑتا ہے مَیں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں؛ جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے؛ تو مَیں عطا کرتا ہوں، اور اگر کسی چیز سے پناہ چاہتا ہے؛ تو مَیں اس کو پناہ دیتا ہوں۔

''مَیں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے'' یعنی اللہ تعالیٰ کی منشا اور مرضی کے مطابق جو چیزیں ہیں؛ انہیں کو وہ دیکھتا ہے، دوسری چیزوں کو وہ نہیں دیکھتا۔ گویا وہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں فنا ہو کر اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع بنالیتا ہے، اسی کو تسلیم و رضا کہتے ہیں۔ یہ سب سے اونچا مقام ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کا تابع بنالے، اور جب یہ بات حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے۔

اسی لئے فرماتے ہیں: ﴿وَاِنْ سَأَلَنِیْ أَعْطَيْتُهُ﴾ اس کے بعد اگر وہ مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے؛ تو مَیں اس کو عطا کرتا ہوں۔ یعنی مقامِ رضا و تسلیم پر پہنچنے کے بعد اس کی کوئی دعا اللہ تعالیٰ کے یہاں سے رد نہیں کی جاتی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اطاعت و فرمانبرداری کی توفیق عطا فرمائے

مجاہدہ
مجلس ﴿۲﴾

۲۱/ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۶/ جولائی ۱۹۹۷ء

﴿المجاهدة ۲﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً .أمابعد:

عن أنس رضی اللہ عنہ فيمايرويه عن ربّه عزوجل قال:اِذَا تَقَرَّبَ الْعَبْدُ اِلَيَّ شِبْراً تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعاً،وَاِذَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ ذِرَاعاً تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ بَاعاً،وَاِذَا أَتَانِىْ يَمْشِىْ أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً. (رواہ البخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جب بندہ میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے؛ تو مَیں اس کی طرف ایک ہاتھ آگے بڑھتا ہوں۔اور جب بندہ میری طرف ایک ہاتھ آگے بڑھتا ہے، اور قریب ہوتا ہے؛ تو مَیں ایک باع یعنی چار ہاتھ قریب ہوتا ہوں۔اور جب وہ میری طرف چل کر آتا ہے؛ تو مَیں اس کی طرف دوڑ کر آگے بڑھتا ہوں۔

﴿بندہ کے عمل کی اللہ تعالیٰ کے یہاں قدر دانی﴾

اللہ تعالیٰ کے یہاں بندہ کے عمل کو جو قبولیت حاصل ہے، اُس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک تشبیہ کے ذریعہ سے بتلایا ہے کہ جب بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کوئی عمل کرتا ہے؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اُس کے عمل کی پذیرائی اور قبولیت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بندہ جس جذبے اور جس سرعت وتیزی سے اللہ تبارک وتعالیٰ

کی طرف آگے بڑھتا ہے؛ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے اس آگے بڑھنے کو اُس سے دو گنے طریقہ سے قبول فرماتے ہیں۔ اسی کو اس حدیث میں اس طرح تعبیر کیا گیا ہے کہ اگر وہ ایک بالشت بڑھتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ ایک ہاتھ آگے بڑھتے ہیں۔ ایک ہاتھ دو بالشت کا ہوتا ہے گویا وہ جس تیزی سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف بڑھا؛ اللہ تعالیٰ نے اُس کے اس بڑھنے کو اس سے دو گنے طریقہ سے قبول فرمایا۔ اور ایک ہاتھ آگے بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مَیں چار ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ باع چار ہاتھ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کے آگے بڑھنے کو اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک طرح کی قبولیت حاصل ہے۔

جب وہاں یہ حال ہے تو بندہ کو بھی چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اپنی مقدور بھر جتنی بھی کوشش ہو سکتی ہو، اور جتنی بھی محنت کر سکتا ہو، اُس کو بروئے کار لاوے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں یہ باب باندھا تھا ﴿باب المجاهدة﴾ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے بندہ جو کوشش کرتا ہے، اور محنت ومشقت برداشت کرتا ہے، تو بندے کی یہ محنت، مجاہدہ اور کوشش؛ اللہ تعالیٰ کے یہاں رائیگاں اور بے کار نہیں جاتی بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کو قبولیت حاصل ہوتی ہے۔

﴿دو محرومِ انصاف نعمتیں﴾

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اُن کے معاملہ میں بہت سارے لوگ خسارے اور گھاٹے میں ہیں ﴿اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ﴾ تندرستی اور فرصت۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں عظیم نعمتیں ایسی ہیں کہ لوگ ان سے جس قدر فائدہ اُٹھانا چاہیے؛ کماحقہ فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی دی ہوئی ان نعمتوں سے اللہ تعالیٰ کا جتنا قرب اور نزدیکی حاصل کر سکتے ہیں اور اُس کی جتنی قیمت وصول کر سکتے ہیں، اُس کی قیمت کی وصول یابی میں کوتاہی کرتے ہیں؛ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

دیکھو! گھاٹا کہتے ہی ہیں اس بات کو کہ آدمی کے پاس ایک چیز کسی مخصوص مالیت کی ہے، وہ اس سے کم میں راضی ہو جائے۔ یعنی وہ جتنی مالیت کی ہے اگر اس کو دے کر اتنی ہی مالیت حاصل کرے؛ تو یوں کہا جائے گا کہ اس کا یہ معاملہ اور سودا برابر کا رہا۔ نہ نفع ہے، نہ نقصان ہے، نہ گھاٹا اور خسارہ ہے اور نہ اس میں کوئی فائدہ ہے۔ لیکن جتنی مالیت کی وہ ہے اگر اس چیز کو دے کر اس سے کم مالیت حاصل کرے، تو کہا جائے گا کہ گھاٹے کا سودا کیا۔

مثلاً آپ کے پاس ایک گھڑی ہے جس کی مالیت سو روپے ہے، اگر آپ وہ گھڑی سو روپے لے کر کسی کو دیں تو یوں سمجھا جائے گا کہ آپ کا یہ سودا برابر کا رہا۔ نہ آپ کو نقصان ہے اور نہ آپ کو فائدہ ہے۔ گھاٹا بھی نہیں اور فائدہ بھی نہیں۔ اور اگر اس کی مالیت سے کم لے کر اس چیز کا سودا اور معاملہ کریں؛ تو یوں سمجھئے کہ یہ گھاٹے کا معاملہ ہے۔ فرض کر لیجئے کہ یہی سو روپے کی گھڑی اگر آپ نے کسی کو پچاس روپے میں حوالے کر دی؛ تو یوں سمجھا جائے گا کہ آپ کو گھاٹا اور نقصان ہے۔ اور جو مالیت آپ نے اس کے حاصل کرنے کے لئے صَرف کی تھی، یا اس کی جو مالیت آپ کے یہاں ہے، اُس سے زیادہ لے کر اگر کسی کو حوالے کریں؛ تو یوں سمجھا جائے گا کہ آپ کا یہ سودا نفع اور فائدے کا ہے۔ مثلاً یہی سو روپے والی گھڑی آپ

کسی کو ڈیڑھ سو یا دو سو میں فروخت کریں؛ تو یوں سمجھا جائے گا کہ پچاس روپے یا سو روپے آپ کو فائدہ اور نفع ہوا۔

یہاں نبی کریم ﷺ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی جن دو نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے، ان میں ایک تندرستی ہے اور دوسری فرصت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو وقت ہمیں عطا فرمایا، اور پھر اس وقت سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہمیں جسمانی تندرستی عطا فرمائی؛ یہ دونوں نعمتیں ایسی ہیں کہ کسی کو یہ دونوں چیزیں مل جائیں تو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے، لیکن نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی ان دو نعمتوں سے جس قدر فائدہ انسانوں کو اُٹھانا چاہیے، اس قدر اُس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ یعنی ان دونوں نعمتوں کی جتنی قیمت وصول کر سکتے تھے، اتنی قیمت وصول نہیں کرتے؛ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

بہت گنے چنے لوگ اور اللہ کے بعض شاذ و نادر بندے ایسے ہوتے ہیں جو ان دونوں نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اُس کی جو قیمت وصول کرنی چاہیے، وہ پوری وصول کرتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگوں کا حال ایسا ہے کہ وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

پانچ منٹ کی قیمت

دیکھئے! اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ جو وقت اور فرصت کی نعمت عطا فرمائی ہے، اور فرصت کے ساتھ ساتھ تندرستی عطا فرمائی ہے، اس دونوں سے آدمی کیا فائدہ اُٹھا سکتا ہے؟ مثلاً ہمیں پانچ منٹ کی فراغت اور فرصت ملی ہوئی ہے، اس پانچ منٹ کی ہم کیا قیمت وصول کر سکتے ہیں؟ دنیوی اعتبار سے دیکھا جائے تو ملازمت کرنے والا ایک آدمی جب اپنی ملازمت کے لئے کسی کے ساتھ معاملہ کرے گا اور اپنی تنخواہ اور معاوضہ مقرر کرائے گا کہ مجھے

مہینہ کی اتنی تنخواہ ملنی چاہیے؛ تو زیادہ سے زیادہ کیا تنخواہ پا سکتا ہے؟ فرض کر لیجئے کہ اگر کسی کو مہینہ کے دو لاکھ، پانچ لاکھ، تیس لاکھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ عموماً تو ایسا کم ہوتا ہے کہ کسی کو مہینہ کی تنخواہ تیس لاکھ روپے ملے گویا روزانہ کی ایک لاکھ تنخواہ ہوئی۔ لیکن فرض کر لیجئے۔ اب جیسا کہ عام طور پر ہمارے یہاں دستور ہے کہ دن میں آٹھ گھنٹے اُس کو حاضری دینی پڑتی ہے اور آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے؛ تو روزانہ کی ایک لاکھ یعنی آٹھ گھنٹے کی قیمت ایک لاکھ ہوئی، تو ایک گھنٹے کی قیمت اُس کا آٹھواں حصہ یعنی ساڑھے بارہ ہزار ہوئے، اس صورت میں ایک منٹ کا حساب لگا لیا جائے کہ تو تقریباً دوسو روپے ہوئے، اور پانچ منٹ کے ایک ہزار ہوئے یہ تو مَیں نے آپ کو مثال کے طور پر سمجھانے کے لئے قیمت لگائی ہے جو بہت زیادہ ہے، شاید ہی مَیں نے اور آپ میں سے کسی نے دیکھا ہو کہ کسی کی ماہانہ تنخواہ تیس لاکھ روپے ہو۔ ایسا نمونہ تو شاید ہی ہمارے سامنے ہو لیکن فرض کر لیجئے کہ تیس لاکھ ہے، تو پانچ منٹ کی قیمت ایک ہزار روپے ہو جائے گی۔ یہ تو دنیوی اعتبار سے ہے۔ اب اگر یہ ہزار روپے کسی کے پاس آئے تو یہ دنیا کی ایک فانی چیز ہے، اگر اُس نے اس کو سنبھال کر رکھا بھی؛ تو جب وہ دنیا سے جائے گا تو ان ہزار کو یہاں چھوڑ کر جائے گا، اس کے مقابلہ میں اگر ان پانچ منٹ کو وہ اللہ کی یاد میں استعمال کرتا، سبحان اللہ پڑھتا؛ تو مَیں سمجھتا ہوں ایک منٹ کے اندر کم سے کم ساٹھ مرتبہ سبحان اللہ بڑی آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ اور اگر کوئی تیزی سے پڑھے تو اس سے بھی زیادہ ہو سکتے ہیں۔ ایسے ہی پانچ منٹ کے اندر تین سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھ سکتا ہے۔ اب اس سبحان اللہ کی قیمت اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کیا ہے؟ ہم غور کریں اور دیکھیں۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب آپ معراج میں

تشریف لے گئے تو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملاقات ہوئی۔ حضرت ابراہیم نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ آپ کی اُمت کو میرا اسلام کہنا اور بتلانا کہ جنت چٹیل میدان ہے، اور اس کے درخت سبحان اللہ، الحمدُ للہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر ہیں (مشکوٰۃ عن الترمذی، ص۲۰۲ ج۱) یعنی بندہ جتنی مرتبہ تسبیح پڑھے گا اتنے ہی درخت جنت کے اندر لگ جائیں گے۔ اگر ہم پانچ منٹ کے اندر تین سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھیں گے تو جنت کے اندر تین سو درخت لگ سکتے ہیں۔ دنیا کے اندر کسی کے پاس ایسا باغ موجود ہو جس میں تین سو درخت پھل دار ہوں؛ تو اس کی کتنی بڑی قیمت لگائی جاسکتی ہے؟ لاکھوں کے اندر لگائیں گے۔ اور ان کا حال یہ کہ سال میں ایک مرتبہ پھل لائیں گے، یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ لا سکتے ہیں، اس سے زیادہ تو لانے والے نہیں ہیں۔ اور پھر وہ ختم ہونے والی چیز ہے۔

اور جنت کا حال تو یہ ہے کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ سورج گرہن کی نماز پڑھا رہے تھے، اس نماز میں آپ کچھ آگے بڑھے، جیسے کوئی چیز لے رہے ہوں، پھر پیچھے ہٹ گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! ہم نے دیکھا کہ آپ نے ہاتھ اس طرح آگے بڑھایا جیسے کوئی چیز لے رہے ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اس نماز کے اندر میرے سامنے جنت پیش کی گئی تھی۔ مَیں نے چاہا کہ اس کا ایک خوشہ توڑلوں۔ اگر مَیں اس کا ایک خوشہ لے لیتا اور تم لوگ قیامت تک کھاتے رہتے؛ تب بھی کبھی ختم نہ ہوتا۔ (بخاری شریف ۷۰۳) اس لئے کہ جنت کے پھل اور خوشہ کا حال یہ ہے کہ اس میں سے اگر ایک دانہ توڑلیا جائے تو فوراً اسی وقت اس کی جگہ پر دوسرا دانہ آجائے گا۔ جب ایک خوشہ کا یہ حال ہے تو یہاں تو جنت کے ایسے تین سو درخت ملیں گے۔ لہٰذا اندازہ لگایئے کہ کتنے زیادہ قیمتی ہوں گے

تو مَیں یہ بتلانا چاہتا تھا کہ اگر کوئی آدمی اپنے یہ پانچ منٹ دنیا کے اندر لگاوے اور اس سے ہزار روپے حاصل کرے، یہ زیادہ فائدہ کی بات ہوئی؟ یا اس پانچ منٹ کو تسبیح کے اندر لگائے اور اس سے تین سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھ کر آخرت کا فائدہ حاصل کرے، جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے؛ یہ زیادہ نفع کی بات ہے؟ اور اگر ہم اپنے اس وقت سے زیادہ سے زیادہ دنیا کما بھی لیں، تب بھی یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہم گھاٹے ہی میں ہیں۔ نبی کریم ﷺ یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ اس وقت اور تندرستی کو آدمی اس طرح استعمال کرے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔

﴿وقت کے چند صحیح قدردان﴾

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ ان نعمتوں سے ایسا فائدہ نہیں اُٹھاتے جیسا اٹھانا چاہیے۔ لیکن اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں جو اپنے وقت کی قدر کرتے ہیں۔ فضائلِ ذکر میں حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے علی جرجانی کا واقعہ نقل کیا ہے، آپ نے پڑھا بھی ہوگا، ان کا حال یہ تھا کہ روٹی کھانے کے بجائے ستو پھانک لیا کرتے تھے۔ کسی نے کہا: آپ روٹی نہیں کھاتے، ستو پھانکتے ہیں؟ تو فرمایا: ہاں! روٹی کھانے اور ستو پھانکنے کے درمیان کا جو وقت بچتا ہے، اس کا فائدہ مَیں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے ستّر مرتبہ سبحان اللہ کہنے کا موقع مل جاتا ہے ان کا یہ معمول چالیس سال سے تھا یعنی چالیس سال سے روٹی کھانا چھوڑ رکھا تھا اور ستو پھانک کر کام چلاتے تھے۔ یہ تھے جنہوں نے اپنے وقت کی قدر کی، اس سے فائدہ اُٹھایا اور اس کو صحیح استعمال کیا۔

فضائلِ صدقات کے اندر حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے داؤد طائی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ

بجائے اس کے کہ روٹی چبا کر کھائیں، اس کو بھگو دیا کرتے تھے اور پھر اس کو گھول کر پی لیا کرتے تھے، سالہا سال سے ان کا یہ معمول تھا۔ کسی نے پوچھا: آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے بتلایا کہ دونوں کامیں نے اندازہ نکالا، تو اتنے وقت کے اندر میں قرآنِ پاک کی پچاس آیتوں کی تلاوت کرسکتا ہوں۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ میں روٹی چبا کر کھاؤں، گھول کر پی لیا کرتا ہوں، اور مجھے جو وقت ملتا ہے اس میں مزید پچاس آیتیں پڑھ لیتا ہوں یہ وہ حضرات تھے جنہوں نے اپنے وقت کی صحیح قدر کی۔

بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاس﴾ اللہ تعالیٰ کی ان دو نعمتوں سے جس قدر فائدہ اُٹھانا چاہیے اور اس کی جو قیمت وصول کرنی چاہیے، اس قیمت کے وصول کرنے کے معاملہ میں بہت سارے لوگ غافل ہیں۔ اکثریت کا یہ حال ہے۔

﴿نقصان در نقصان﴾

یہ تو اس وقت ہے کہ دنیوی اعتبار سے بھی کچھ فائدہ اُٹھائیں۔ اور اگر ہم ایسے ہی اپنے اوقات کو ضائع کردیں کہ نہ دنیوی فائدہ اُٹھا رہے ہیں، نہ اخروی فائدہ اُٹھا رہے ہیں، تو پھر کیا کہا جائے گا۔ اور اگر کوئی آدمی ایسا ہے کہ دنیا کے اعتبار سے اتنی بھی قیمت وصول نہیں کررہا ہے بلکہ اپنے اس وقت کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، گناہوں اور خواہشات کے پورا کرنے میں لگادے؛ تو بجائے اس کے کہ یہ وقت اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ بنتا؛ اس کے لئے مزید وبال کا ذریعہ بنے گا۔ یہ تو صرف نقصان ہی نہیں؛ نقصان در نقصان ہوا۔ گویا اپنے آپ کو وہ ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ﴿مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاس﴾

اللہ تعالیٰ کی ان دونعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کے معاملہ میں بہت سارے لوگ گھاٹے اور خسارے میں ہیں یعنی ان نعمتوں سے جس قدر فائدہ اُٹھانا چاہیے؛ اتنا فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان دونعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحت بھی دے رکھی ہے اور فرصت بھی دے رکھی ہے۔ اگر اپنے کام کاج میں لگے ہوئے ہیں، تو کاروبار کا وقت نکال دیں، اس کے بعد بھی بہت سارا وقت بچتا ہے، ہم اس وقت کے ذریعہ سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت، اللہ کی یاد اور اللہ کے ذکر میں مشغول رہ کر اپنے اس وقت کو بھی بہت قیمتی بنا سکتے ہیں، اور اس کی زیادہ سے زیادہ اور بڑی سے بڑی قیمت وصول کر سکتے ہیں؛ لیکن ہم اس معاملہ میں گھاٹے میں ہیں۔

﴿پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو﴾

نبی کریم ﷺ سے کسی نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے نصیحت فرما دیجئے، آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ﴿اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ﴾ پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو۔ (مشکوۃ عن الترمذی مرسلاً، ص ۴۴۱، ج ۲)

﴿شَبَابَکَ قَبْلَ هَرَمِکَ﴾ بڑھاپے سے پہلے جوانی کو غنیمت سمجھ لو۔ اس لئے کہ آدمی جوانی کے اندر اپنے قویٰ کے ذریعہ سے جتنا کام کر سکتا ہے، بڑھاپا آنے کے بعد قویٰ وہ کام نہیں کر سکتے، بڑھاپے میں وہ قوت باقی نہیں رہتی، اور وہ جوشِ عمل بھی باقی نہیں رہتا، اور بھی بہت ساری کمزوریاں آجاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جوانی کے زمانہ میں جتنا کر سکتا ہے، بڑھاپے میں وہ طاقت نہیں رہتی۔ اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جوانی کو بڑھاپے سے پہلے غنیمت سمجھ لو۔

دوسری بات ارشاد فرمائی: ﴿غِنَاءَ کَ قَبْلَ فَقْرِکَ﴾ اپنی مالداری کو فقیری سے پہلے غنیمت سمجھ لو۔ معلوم نہیں، آج مالداری ہے؛ کل فقیری آسکتی ہے۔ لہٰذا آج مالداری کی حالت میں اللہ کی دی ہوئی اس دولت کے ذریعہ جتنی نیکیاں کما سکتے ہو، نیکیوں کے کاموں میں جتنا خرچ کر سکتے ہو؛ کرلو۔ اُس وقت نہیں کرسکو گے۔

تیسری چیز ارشاد فرمائی: ﴿وَصِحَّتَکَ قَبْلَ سُقْمِکَ﴾ اپنی تندرستی کو بیماری سے پہلے غنیمت سمجھو۔ اس کا مطلب ہے کہ آدمی تندرستی کے اندر جو کچھ فائدہ حاصل کرسکتا ہے؛ بیماری میں وہ کام نہیں کرسکتا۔

پھر فرمایا: ﴿وَفَرَاغَکَ قَبْلَ شُغُلِکَ﴾ اپنی فرصت کو مشغولی سے پہلے غنیمت سمجھ لو۔

اخیر میں فرماتے ہیں: ﴿وَحَیَاتَکَ قَبْلَ مَوْتِکَ﴾ اپنی زندگی کو موت سے پہلے غنیمت سمجھ لو۔ زندگی تو کیسی ہی سہی، بڑھاپے والی ہو یا بیماری والی ہو؛ غنیمت ہے۔ ویسے تو بیماری کے مقابلہ میں تندرستی بہت اونچی چیز ہے، یا بڑھاپے کے مقابلہ میں جوانی بہت اونچی چیز ہے، لیکن اگر بڑھاپے والی بھی زندگی مل گئی، وہ موت کے مقابلہ میں بہرحال بہت غنیمت ہے۔ اس لئے کہ بڑھاپے کی حالت میں کمزوری کی وجہ سے آدمی اگرچہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت نہیں رکھتا، لیکن زبان تو ہلا سکتا ہے۔ اور ویسے بھی بڑھاپے میں زبان زیادہ ہی زوروں پر آجاتی ہے، اس وقت اگر تسبیح پڑھ لے، اللہ کا نام لے لے؛ تو بیماری کے اندر پڑے پڑے بھی بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے۔

﴿حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قابلِ اقتداء طرزِ عمل﴾

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ تشریف لے جارہے تھے، کسی جگہ ایک قبر کو

دیکھا، اپنے اونٹ سے اترے اور دو رکعت نماز ادا کی۔ لوگوں نے پوچھا: کیا بات ہے؟ لوگ یوں سمجھے کہ شاید جس کی قبر ہے اُس کے ساتھ کوئی تعلق ہوگا، اس مناسبت سے یہاں پر انھوں نے دو رکعت پڑھی ہو۔ تو انہوں نے فرمایا: ایسا نہیں ہے، بلکہ ایک مرتبہ آپ ﷺ کا گزر ایک قبر کے پاس ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: آدمی موت کے بعد تمنا کرے گا کہ کاش مجھے دو رکعت پڑھنے کا وقت ملتا۔ مَیں نے جب قبر کو دیکھا تو نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد یاد آ گیا تو مَیں نے یوں سوچا کہ آج تو مَیں زندہ اور سلامت ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ نے موقع دیا ہے اور میرے پاس فرصت بھی ہے، کیوں نہ فائدہ اُٹھالوں اور دو رکعت ادا کرلوں۔ لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ان دونوں نعمتوں (تندرستی، فرصت) سے جتنا بھی فائدہ اُٹھا سکتا ہو؛ فائدہ اُٹھالے۔

یہاں پر جتنے بھی حضرات موجود ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہم سب کو ان دونوں نعمتوں سے نواز رکھا ہے، اگرچہ کاروباری اعتبار سے مشغولی ہوتی ہے، لیکن وہ اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ آدمی کو اللہ کی یاد کرنے کا اور دوسرے نیکی کے کام کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اس لئے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بہت سارے لوگ اس سے فائدہ اُٹھانے کے معاملہ میں خسارے میں ہیں۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا أن النبی ﷺ کَانَ یَقُوْمُ مِنَ اللَّیْلِ حَتّٰی تَتَفَطَّرَ قَدَمَاہُ، فَقُلْتُ لَہٗ: لِمَ تَصْنَعُ ھٰذَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَقَدْ غَفَرَ اللّٰہُ لَکَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَأَخَّرَ؟ قَالَ: أَفَلَا أَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات میں قیام فرماتے تھے یعنی تہجد کی نماز میں آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے رہتے تھے؛ یہاں تک کہ آپ کے دیر تک تہجد میں مشغول رہنے کی وجہ سے قدمِ مبارک پھٹ جاتے تھے۔ اگر آدمی دیر تک کھڑا رہے تو اس کے پاؤں پر ورم آجاتا ہے اور کبھی اس کی وجہ سے شگاف پڑ جاتے ہیں اور خون بھی بہنے لگتا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرمادیئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں تو آپ کے لئے کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: کیا مَیں اللہ کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟ یعنی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکرادا کرتے ہوئے بھی چاہیے کہ خود اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہے، جب اللہ تعالیٰ نے اس کو نعمتوں سے نوازرکھا ہے تو اس کا شکرانہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زیادہ سے زیادہ عبادت کرے، اور اس میں مشغول رہے۔

یہاں بھی حضور اکرم ﷺ کے مجاہدہ کو بیان فرمارہے ہیں کہ آپ نبی آخرالزمان تھے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ کو جیسا بھی نوازا گیا؛ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ اس کے باوجود نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اور اس کی رضاجوئی میں، اللہ کا قرب اور نزدیکی حاصل کرنے میں اتنا زیادہ اہتمام اور مجاہدہ فرماتے تھے، اتنی زیادہ محنت اور کوشش کرتے تھے کہ رات کے قیام کی وجہ سے اور تہجد میں کھڑے رہنے کی وجہ سے آپ ﷺ کے پاؤں میں شگاف پڑ جاتے تھے۔ اب ہم لوگوں کو تو اور زیادہ ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿آخری عشرہ کو وصول فرمانے کا حضور ﷺ کا اہتمام﴾

عن عائشة رضی اللہ عنہا أَنَّهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ أَحْيَا اللَّيْلَ وَ أَيْقَظَ أَهْلَهُ وَجَدَّ وَشَدَّ الْمِئْزَرَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تھا تو نبی کریم ﷺ رات بھر بیدار رہتے تھے، پوری رات آپ عبادت کرتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگا دیا کرتے تھے، خوب محنت سے کام لیتے تھے اور لنگی باندھ لیتے تھے۔ ویسے تو نبی کریم ﷺ سال بھر قیام لیل کا اہتمام فرماتے تھے لیکن رمضان میں اور رمضان کے بھی آخری عشرہ میں۔ جس کے متعلق روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ عبادت کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے، یہاں تک کہ آخری عشرہ میں رات بھر آپ نہیں سوتے تھے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اور اتنا ہی نہیں کہ خود اس کا اہتمام فرماتے ہوں، بلکہ آپ اپنے گھر والوں کو بھی جگا دیا کرتے تھے۔ گویا آپ گھر والوں کو اور اپنے ماتحتوں کو اس کی طرف متوجہ فرماتے تھے کہ وہ بھی اس کا اہتمام کریں۔

آپ ﷺ نے اپنے عمل سے ہم لوگوں کو اس بات کی تعلیم دی کہ ہمیں خود بھی رمضان المبارک کے آخری عشرہ کے وصول کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے اور ساتھ ہی اپنے ماتحتوں کو بھی اس کی طرف متوجہ کرنا چاہیے اور سب کو مل کر اس عشرہ کو وصول کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

﴿وَشَدَّ الْمِئْزَرَ کے دو مطلب﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿وَشَدَّ الْمِئْزَرَ﴾ کے دو مطلب بیان کئے ہیں۔ لنگی باندھ لیتے تھے یعنی نبی کریم ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات کے پاس نہیں جاتے تھے یعنی خاص کر ان دس

دنوں میں ان سے صحبت نہیں کرتے تھے۔

دوسرا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ خوب محنت اور مجاہدہ سے کام لیتے تھے۔ جیسے کوئی آدمی کسی کام میں اپنی زیادہ محنت کو تعبیر کرتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ لنگی باندھ لی۔ مطلب یہ ہے کہ خوب محنت اور کوشش کی۔ اور اسی مطلب کو راجح قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ عام طور پر رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کا اہتمام فرماتے تھے، اور اعتکاف کی حالت میں ازواجِ مطہرات سے صحبت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اعتکاف کی حالت میں یہ چیز ممنوع قرار دی جاتی ہے۔ لہٰذا دوسرے والے مطلب کو علماء اور شرّاح نے زیادہ بہتر قرار دیا ہے کہ حضور ﷺ اپنی محنت اور کوشش کو بڑھا دیا کرتے تھے اور بہت زیادہ مجاہدہ سے کام لیتے تھے۔ گویا آپ نے اپنے عمل کے ذریعہ سے اُمت کو اس بات کی تعلیم دی کہ اس کو بھی رمضان المبارک کا اور خاص کر اس کے آخری عشرہ کا اہتمام کرنا چاہیے۔

جو مجاہدہ زیادہ کر سکتا ہو؛ وہ محبوب بھی زیادہ

عن أبی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَأَحَبُّ اِلیٰ اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ، وَفِیْ کُلٍّ خَیْر. اِحْرِصْ عَلیٰ مَایَنْفَعُکَ، وَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَلَاتَعْجَزْ، وَاِنْ أَصَابَکَ شَیْءٌ فَلاَ تَقُلْ: لَوْاَنِّیْ فَعَلْتُ کَذَا وَکَذَا، وَلٰکِنْ قُلْ: قَدَّرَاللهُ وَمَاشَآءَ فَعَلَ، فَاِنَّ لَوْتَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مضبوط ایمان والا اور مضبوط مسلمان کمزور مسلمان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ محبوب اور اچھا ہے اگرچہ دونوں ہی میں خیر ہے۔ یعنی جو مضبوط ہے اس کے اندر بھی خیر اور بھلائی ہے، ایمان کی دولت سے وہ بھی مالا مال ہے، اور جو کمزور ہے وہ بھی ایمان کی دولت سے مالا مال ہے۔ لیکن

جومضبوط اورقوی، تندرست اورتوانا ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اورفرمانبرداری میں اوراس کے احکام کی بجاآوری میں جتنی زیادہ کوشش کرسکتا ہے، جتنی محنت اورمشقت برداشت کرسکتا ہے؛ کمزورآدمی اتنی محنت اورمشقت برداشت نہیں کرسکتا۔لہٰذا جوآدمی اللہ کے واسطے جتنی زیادہ مشقت اُٹھائے گا، کوشش کرے گااورتکالیف برداشت کرے گا؛ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا مقام اورمرتبہ زیادہ ہوگا۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا: جوآدمی لوگوں کے ساتھ ان کے درمیان میں رہتا ہے اوران کی طرف سے پہنچائی جانے والی ایذاؤں اور تکالیف پرصبر کرتا ہے، وہ اس شخص کے مقابلہ میں بہتر ہے، جوالگ رہتا ہےاوران کی ایذاؤں پرصبر نہیں کرتا۔(مشکوۃ عن الترمذی وابن ماجہ۲/۴۳۲) چونکہ اس آدمی نے لوگوں کی ایذارسانی پرصبر سے کام لیااوران کے درمیان میں رہ کران کے حقوق کی ادائیگی کااہتمام کیا، تواس نے اللہ کے واسطے اوراس کی فرمانبرداری اوراطاعت کے لئے اوراس کے احکام کی بجاآوری کے لئے زیادہ تکلیف اُٹھائی؛ لہٰذاوہ اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ محبوب بنا۔

یہاں مؤمنِ قوی اسی نسبت سے اللہ کازیادہ محبوب اوربہترقراردیا گیاہے، ورنہ ایک مؤمن ہونے کی حیثیت سے یانفس ایمان کےاعتبارسے دونوں کامقام برابر ہے، البتہ ایک آدمی مجاہدہ کی طاقت اورمجاہدہ پرقدرت زیادہ رکھتا ہےاوراپنی قوت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اورفرمانبرداری میں زیادہ محنتیں برداشت کرتا ہے، اس لئے وہ اللہ کازیادہ محبوب بنتا ہے۔

پھرنبی کریم ﷺ ارشادفرماتے ہیں: جوچیز تمہارے فائدہ کی ہے اس کے کرنے

میں اوراس کے انجام دینے میں حریص اور لالچی رہو۔یعنی جو چیز تمہارے لئے آخرت کے اعتبار سے جتنی زیادہ مفید اور کار آمد ہوسکتی ہے اوراس کام سے آپ کا زیادہ سے زیادہ فائدہ ہوسکتا ہے، یا اگر دنیوی فائدہ متعلق ہے، اوراس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہیں ہے، تو ایسے کاموں کے حریص رہو۔

﴿وَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَلَاتَعْجَزْ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی سے مدد چاہو، اور اللہ کی اطاعت میں اور نیکی کے کاموں کے انجام دینے میں عاجز، درماندہ اور کمزور مت بنو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں آدمی کو ہمت اور قوت سے کام لینا چاہیے۔

تصوف کا خلاصہ

جیسا کہ مَیں عرض کرچکا ہوں کہ حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: تصوف کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہے کہ آدمی کا نفس اگر کسی نیکی کے کام میں سستی کررہا ہے تو اس کا مقابلہ کر کے نیکی کے اس کام کو انجام دے۔ اور کسی گناہ سے بچنے میں اگر سستی سے کام لے رہا ہے، تو نفس کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچ جائے۔ یہی تصوف کا خلاصہ ہے۔

اگر آدمی ہمت سے کام لے کر نیکی کے کاموں کو انجام دے اور گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے، یہی سارے مجاہدوں کا نچوڑ ہے۔ اور اسی کے لئے بزرگوں کی خدمت میں آدمی وقت دیتا ہے، تاکہ ان کی خدمت کی وجہ سے آدمی اتنی قوت حاصل کرلے، اوراس میں اتنی ہمت آجائے، جس کے ذریعہ سے وہ اپنے نفس کا مقابلہ کرسکے۔

مقدرات پیش آچکنے کے بعد حسرت مت کرو

﴿وَاِنْ اَصَابَکَ شَيْئٌ فَلاَ تَقُلْ: لَوْاَنِّیْ فَعَلْتُ کَذَاوَکَذَا، وَلٰکِنْ قُلْ: قَدَّرَاللهُ، وَمَاشَآءَ فَعَلَ﴾

اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو یہ مت کہو: اگر مَیں ایسا کرتا، تو یوں ہوتا۔ بلکہ یوں کہو: اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی مقدر تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو چاہا وہی کیا۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو اس کے پیش آچکنے کے بعد وہ یوں کہتے ہیں کہ مَیں ایسا کرتا، تو یوں ہوتا۔ فلاں ایسا کرتا، تو ایسا ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی کو کہیں سفر میں جانا تھا، آپ سے مشورہ طلب کیا، آپ نے منع کیا کہ مت جاؤ، لیکن اس کے باوجود وہ گیا اور کوئی حادثہ پیش آگیا۔ اب وہ یوں کہے کہ اگر مَیں نے اس کا مشورہ مان لیا ہوتا تو ایسا نہیں ہوتا۔ یا آپ یوں کہیں کہ مَیں نے تم کو جانے سے منع کیا تھا، اس کے باوجود تم گئے، میرا مشورہ مان لیا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ حالانکہ یہ چیز اس کے مقدر میں لکھی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ چیز اس کے حق میں طے شدہ تھی، لہٰذا اس کو تو پیش آنا ہی تھا۔ اس لئے یوں کہنا کہ میرے کہے ہوئے پر آپ عمل کرتے۔ یا اس کا یوں سوچنا کہ مَیں فلاں کے مشورہ کو عملی جامہ پہناتا اور اس کی بات مان لیتا؛ تو ایسا نہ ہوتا۔ یہ تقدیر کو رد کرنے والی بات ہے۔ شیطان اس طریقہ سے آدمی کو ایمان بالقدر سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے کبھی ایسا جملہ اپنی زبان سے نہ نکالے۔ یہ شیطان کو اپنے ایمان میں دخل اندازی کا موقعہ دینا ہے۔ اسی کو حضور ﷺ فرماتے ہیں: ﴿فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ﴾ اس لئے کہ جو ''اگر، اگر'' والی بات ہوتی ہے؛ وہ شیطان کے لئے دروازہ کھولنے والی ہوتی ہے۔ جو تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے، وہ تو اپنی جگہ پر اٹل ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے اخلاق میں لکھا ہے کہ اگر کوئی چیز ٹوٹ جاتی یا کوئی نقصان ہونے پر جس کے ہاتھوں نقصان پیش آیا ہے اس کو کوئی شخص ملامت کرتا تو نبی کریم ﷺ فرماتے: بھائی چھوڑو! اگر کوئی دوسری بات ہوتی؛ تو وہی ہو کر رہتی۔ (مشکوٰۃ ص ۵۱۹ ج ۲ عن البیہقی)

مطلب یہ ہے کہ جو چیز ٹوٹی ہے، اگر اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ منظور ہوتا کہ نہ ٹوٹے؛ تو ایسا ہی ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ کے یہاں ٹوٹنا منظور ہو چکا تھا، اب اس پر اس کو ملامت کرنا مناسب نہیں ہے۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ گھر والوں کو، بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے ہیں۔ ایسی ڈانٹ اچھی نہیں ہے۔ نصیحت کے طور پر آئندہ کے لئے احتیاط کی تاکید کر دینا الگ چیز ہے، لیکن آہ وواویلا کرنا اور اس کے اوپر شور مچانا، نقصان کے اوپر زجر وتوبیخ کرنا، یہ غلط طریقہ ہے، جو مناسب نہیں ہے۔ بہر حال! جو معاملہ پیش آیا، اس کے متعلق یوں سوچنا کہ اگر یوں کرتا تو یوں ہوتا؛ یہ بری بات ہے۔

﴿ ایمان بالقدر پر زد نہ پڑتی ہو؛ تو اس کی اجازت ہے ﴾

البتہ کسی نیک کام کی تمنا کے طور پر یہ لفظ ''اگر'' کو استعمال کرتا ہے کہ جس میں تقدیر کا رد کرنا بھی لازم نہیں آتا؛ تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو علم حاصل کرنے کا موقعہ نہیں ملا، اب وہ کہے: کاش! مَیں نے علم حاصل کیا ہوتا؛ تو اچھا تھا۔ ایسی تمنا کرنے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اسی طرح یہ کہے: اگر ہمیں بھی مال ملتا؛ تو ہم بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں یوں خرچ کرتے۔ اگر کوئی آدمی یہ بول رہا ہے؛ تو یہ ''اگر'' تقدیر کو رد کرنے والی بات نہیں ہے، اور اس میں اس کے لئے کوئی حرج کی چیز نہیں ہے۔ لیکن کسی مصیبت کے موقعہ پر یا کسی واقعہ کے پیش آنے پر ''اگر'' اس طرح استعمال کرتا ہے کہ اس میں بظاہر تقدیر کی تردید معلوم ہوتی ہے؛ تو اس سے منع کیا گیا ہے، اس کی اجازت نہیں ہے۔

جنت اور جہنم کی باڑھ (Boundary)

وعنہ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال: حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ، وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہنم کو نفس کی مَن پسند چیزوں یعنی خواہشات سے ڈھانپ دیا گیا ہے، اور جنت کو نفس کے خلاف امور سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔

یہی روایت سنن کے اندر ایک اور طریقے سے آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب جنت کو پیدا فرمایا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے کہا: جاؤ اور جنت اور اس کی نعمتوں کو دیکھ کر آؤ۔ چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام گئے اور جب انہوں نے جنت اور اس کی نعمتوں کو دیکھا تو آ کر عرض کیا باری تعالیٰ! یہ تو ایسی نعمتیں ہیں کہ جو آدمی اس کو دیکھے گا، ضرور حاصل کرے گا یعنی کوئی بھی اس کو حاصل کئے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو نفس کے خلاف امور سے ڈھانپ دیا یعنی جو آدمی نفس کے خلاف کام کرے گا اسی کو جنت ملے گی۔ اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام سے کہا: جاؤ دیکھ کر آؤ۔ جب وہ دیکھ کر آئے تو بتلانے لگے کہ اب تو یہ خطرہ ہے کہ شاید ہی کوئی اس کے اندر جا سکے۔ (جمع الفوائد ص ۶۰۷ ج ۴۔ عن أبی داود والترمذی والنسائی)

اس روایت کو لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ جب تک آپ نفس کے خلاف نہیں کریں گے، وہاں تک جنت اور اس کی نعمتوں کا حاصل ہونا مشکل ہے۔ جنت میں لے جانے والی جتنی بھی چیزیں ہیں؛ وہ وہی ہیں جن کے انجام دینے میں آدمی کو اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، اس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کچھ محنت اور کوشش سے کام لینا پڑتا ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے۔ نبی کریم ﷺ خواب کا قصہ بیان فرما رہے ہیں کہ آپ

سے سوال کیا گیا: ﴿فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَاءُ الْأَعْلىٰ﴾ ملاءِ اعلیٰ والے کس چیز میں گفتگو اور بحث کرر ہے ہیں؟ یعنی کون سی چیز ان کے لئے موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے۔اس کا جواب حضور ﷺ کو خواب ہی کے اندر یہ دیا گیا کہ درجات کے بلند کرنے والی چیزوں میں وہ لوگ گفتگو کرر ہے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا: کون سی چیزیں درجات کو بلند کرنے والی ہیں؟ اس کے جواب میں ایک بات یہ بھی بتلائی گئی: ﴿اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلىٰ الْمَكَارِهِ﴾ آدمی وضو کو اپنی طبیعت کے خلاف پورے طور پر انجام دے۔ (ترمذی کتاب التفسیر، سورۃ الصّٰفّٰت)

مثلاً سردی کا زمانہ ہے اور طبیعت ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا نہیں چاہتی اور اگر کرنا پڑ جائے تو طبیعت جلدی سے آمادہ نہیں ہوتی، صبح ایک تو نیند سے اُٹھا، جلدی سے نل کھولنے کو بھی جی نہیں چاہتا، جلدی سے ہاتھ میں پانی لینے کو بھی جی نہیں چاہتا، ٹھنڈک کی وجہ سے طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی اگر کوئی اپنی طبیعت کے خلاف اور طبیعت کی ناپسندیدگی کے باوجود وضو کرلے گا؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کے درجات بلند ہوتے ہیں اور گناہ معاف ہوتے ہیں۔ایسے تمام امور جنت تک لے جانے والے ہیں۔اسی کو حدیث میں فرمایا گیا کہ جنت کو طبیعت کے خلاف اُمور سے ڈھانپ دیا گیا۔

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہنم کو پیدا فرمانے کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا جاؤ! دیکھ کر آؤ۔ تو جہنم کو اور وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب اور جو سزائیں تھیں ان کو دیکھ کر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آ کر عرض کیا: باری تعالیٰ! جو کوئی بھی اس کو دیکھے گا یا اس کے عذابات کو سنے گا؛ تو کبھی اس میں نہیں جائے گا، سب ہی اس سے بچیں گے۔اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہنم کو نفس کے مَن پسند امور یعنی خواہشاتِ نفس سے ڈھانپ دیا۔ پھر کہا:

اب جا کر دیکھ کر آؤ۔ جب دیکھ کر آئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: باری تعالیٰ! اب تو شاید ہی کوئی اس سے بچے گا، سب ہی جہنم کے اندر جائیں گے۔ اس لئے کہ خواہشاتِ نفس سب کے ساتھ لگی ہوئی ہیں اور کوئی بھی آدمی ایسا نہیں ہے جو اپنے آپ کو خواہشات سے بچائے۔ عام طور پر آدمی اس کے اندر پڑ جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں جہنم میں جائے گا، اسی کو اس حدیثِ پاک میں بیان کیا گیا: ﴿حُجِبَتِ النّارُ بِالشَّهَوَاتِ﴾ جہنم کو خواہشاتِ نفسانی سے یعنی نفس کی من پسند چیزوں سے ڈھانپا گیا ہے۔

اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ جو چیز نفس کو پسند ہو، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے، اور اس سے بچانے کے لئے اگر نفس کا مقابلہ کرنا پڑے، کچھ محنت برداشت کرنی پڑے، کچھ کوشش کرنی پڑے؛ تو اس کے لئے آدمی کو مجاہدہ کر لینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات کی توفیق عطا فرمائے

مجاہدہ
مجلس ﴿۳﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المجاهدة ۳

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لاَشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلاَنَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:

عن أبى عبداللہ حذيفة بن اليمان رضى الله عنهما قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَافْتَتَحَ الْبَقَرَةَ، فَقُلْتُ: يَرْكَعُ عِنْدَالْمِائَةِ. ثُمَّ مَضَى. فَقُلْتُ: يُصَلِّيْ بِهَافِيْ رَكْعَةٍ. فَمَضَى، فَقُلْتُ: يَرْكَعُ بِهَا. ثُمَّ افْتَتَحَ النِّسَآءَ. فَقَرَأَهَا. ثُمَّ افْتَتَحَ آلَ عِمْرَانَ، فَقَرَأَهَا. يَقْرَأُمُتَرَسِّلاً، اِذَا مَرَّبِآيَةٍ فِيْهَاتَسْبِيْحٌ؛ سَبَّحَ. وَاِذَا مَرَّبِسُؤَالٍ؛ سَأَلَ. وَاِذَامَرَّبِتَعَوُّذٍ؛ تَعَوَّذَ. ثُمَّ رَكَعَ. فَجَعَلَ يَقُوْلُ: ((سُبْحَانَ رَبِّىَ الْعَظِيْم)) فَكَانَ رُكُوْعُهُ نَحْواًمِنْ قِيَامِهِ. ثُمَّ قَالَ: ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَه، رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ)) ثُمَّ قَامَ قِيَاماًطَوِيْلاً قَرِيْباًمِّمَّارَكَعَ. ثُمَّ سَجَدَ. فَقَالَ: ((سُبْحَانَ رَبِّىَ الْأَعْلٰى)) فَكَانَ سُجُوْدُهُ قَرِيْباًمِنْ قِيَامِهِ. (رواہ مسلم)

حضور ﷺ کے راز دار

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں جن کو صاحبِ سِر رسول اللہ یعنی نبی کریم ﷺ کے راز دار بھی کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بعض مخصوص باتیں -خاص کر منافقین کے ناموں کی فہرست -ان کو بتلائی تھی؛ جو اور کسی صحابی کو معلوم نہیں تھی، چنانچہ دوسرے بڑے بڑے صحابہ بھی اس سلسلہ میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔

عبداللہ بن ابی- جومنافقین کا سردار کہا جاتا ہے- جب اس کا انتقال ہوا، اس وقت تک منافقین کی نمازِ جنازہ کی ممانعت آئی نہیں تھی، اس کے فرزند جن کا نام بھی عبداللہ رضی اللہ عنہ تھا، وہ بڑے مخلص مؤمن تھے، انھوں نے آکر حضور اقدس ﷺ سے درخواست کی: اے اللہ کے رسول! میرے والد کا انتقال ہوگیا ہے، آپ ان کی نمازِ جنازہ پڑھائیے، چنانچہ آپ ﷺ تشریف لے گئے اور آپ نے عبداللہ بن ابی کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ جس وقت آپ نماز جنازہ پڑھانے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے؛ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کا دامن پکڑلیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھا رہے ہیں؟ فلاں موقعہ پر اس نے یہ تکلیف پہنچائی، فلاں موقعہ پر اس نے یہ تکلیف پہنچائی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی جو جو حرکتیں تھیں اور اس کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو اور مسلمانوں کو جو ایذائیں پہنچائی گئیں؛ وہ ساری باتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کیں اور عرض کیا: اس کے باوجود آپ اس کے جنازے کی نماز پڑھیں گے؟ حالانکہ باری تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا: ﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ اگر آپ ان کے لئے ستّر مرتبہ بھی دعائے مغفرت کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ستّر مرتبہ سے زیادہ دعائے مغفرت کرنے سے ان کی مغفرت ہوجائے گی؛ تو میں اس سے زیادہ بھی ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے کے لئے تیار ہوں، پھر آپ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ ابھی جنازہ کی نماز ادا فرما کر وہاں سے ہٹے بھی نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک میں یہ حکم نازل ہوا کہ آپ آئندہ کسی بھی کافر یا منافق کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں۔ (جمع الفوائد ص۲۱۶ ج۴، عن الشیخین والنسائی)

بہرحال! جب تک نبی کریم ﷺ صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے، وہاں تک تو اگر کسی منافق کا انتقال ہوتا اور صحابہ کو معلوم ہو جاتا کہ آپ ﷺ اس کے جنازہ کی نماز کے لئے تشریف نہیں لے گئے ہیں؛ تو یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی کہ وہ منافق ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی ایسا ذریعہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس نہیں تھا جس سے وہ معلوم کرتے صرف حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ تھے جن کو حضور ﷺ نے منافقین کے ناموں کی فہرست بتلائی تھی، وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے ایک ذریعہ تھے۔

اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ حضور ﷺ کے بعد اگر کسی کا انتقال ہو جاتا تو معلوم کراتے کہ دیکھو! اس کے جنازہ میں حضرت حذیفہ ہیں یا نہیں؟ اگر حضرت حذیفہ جنازہ میں آئے ہوتے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ وہ منافق نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شریک ہو جاتے۔ اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتلایا جاتا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس کے جنازہ میں شریک نہیں ہوئے ہیں؛ تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس کے جنازہ میں نہیں جاتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خوفِ خدا کی کیفیت

یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بات ضمناً یاد آ گئی، اس کو بھی عرض کر دوں کہ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت جن کا مقام یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد تمام انسانوں میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں، جن کے متعلق نبی کریم ﷺ نے یہاں تک فرمایا: ﴿لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ﴾ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے (جمع الفوائد ص ۵۰۹ ج ۲ عن الکبیر بضعف) ان کے اور بھی بڑے حالات ہیں۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: حضرت عمر جس گلی سے گذرتے ہیں تو شیطان

راستہ بدل دیتا ہے۔ (جمع الفوائد،ص ۵۰۶ ج ۴) یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شیطان اتنا ڈرتا ہے۔اس کے باوجود ان حضرات کو اپنے اوپر اطمینان نہیں تھا۔

اسی لئے ایک مرتبہ تنہائی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا: اے حذیفہ! ذرا یہ تو بتلاؤ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو جن منافقین کی فہرست دی ہے، اس میں عمر کا نام تو نہیں ہے؟ اللہ اکبر (کنز العمال ۱۳/۳۴۴۔حدیث نمبر: ۳۶۹۶۲۔البدایہ والنہایہ ۵/۱۹)

یعنی یہ حضرات اپنے متعلق تو اتنی فکر کرتے تھے۔اور اگر ہم میں سے کوئی آدمی کوئی خواب دیکھ لے، تو پھر معلوم نہیں وہ اپنے متعلق کیا کیا سوچنے اور سمجھنے لگ جاتا ہے۔حالانکہ خواب تو خواب ہے۔اور ان حضرات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دنیا ہی میں جنت کی بشارتیں دی گئیں، اس کے باوجود ان حضرات کو اپنی ذات پر اطمینان نہیں تھا۔

﴿اگر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمنا کی اجازت ملے﴾

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا مقام اتنا اونچا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا: اگر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمنا کرنے کی اجازت دی جائے اور کہا جائے کہ جو تمنا کروگے وہ پوری کی جائے گی، تو مَیں اللہ تعالیٰ سے حضرت ابوعبیدہ بن جراح، معاذ بن جبل اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم جیسے لوگ مانگوں گا کہ اے اللہ! مجھے ایسے لوگ عطا فرما تاکہ مَیں ان کو حدودِ سلطنت کے مختلف علاقوں میں امیر مقرر کروں ﴿فاستعملهم فی طاعة اللّٰه﴾

(اسد الغابہ: ۱/۴۶۹، ترجمہ حذیفہ بن یمان)

﴿نوافل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طویل قیام کی ایک جھلک﴾

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ایک سال بعد ان کا انتقال ہوا۔وہ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ رات میں جب نبی کریم ﷺ تہجد کی نماز ادا فرمارہے تھے، تو مَیں بھی آپ کے ساتھ شریک ہوگیا۔ اگر کوئی نماز پڑھتا ہو، اور آپ اس کی اقتدا کرلیں؛ تو اس کی اجازت ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے اپنی نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد قراءت میں سورۂ بقرہ شروع فرمائی۔ تو مَیں نے اپنے جی میں یوں سوچا کہ آپ شاید سو آیتوں کے بعد رکوع فرمادیں گے۔ یہ خود بھی لمبی لمبی نماز پڑھنے والے تھے، اس لئے انھوں نے سوچا بھی تو سو آیتوں کا سوچا، اس سے کم کا تو سوچا بھی نہیں۔ لیکن جب سو آیتیں پوری ہوئیں تو آپ ﷺ نے اور آگے سلسلہ جاری رکھا۔ جب آپ آگے بڑھ گئے تو مَیں نے اپنے جی میں یہ سوچا کہ شاید آپ اپنی اس رکعت میں سورۂ بقرہ پوری فرمائیں گے۔ لیکن جب سورۂ بقرہ پوری ہوئی تو آپ اور آگے بڑھے، اب آپ نے سورۂ نساء شروع فرمادی۔ مَیں نے یوں سوچا کہ شاید اس کو پوری کرنے کے بعد آپ رکوع فرمائیں گے۔ لیکن اس کو پوری کرنے کے بعد سورۂ آل عمران شروع فرمادی اور اس کو بھی پوری ختم فرمائی۔ یہ کل تقریباً سوا پانچ پارے ہوتے ہیں؛ جو آپ نے ایک رکعت میں تلاوت فرمائے ﴿یَقْرَأُ مُتَرَسِّلًا﴾ اور پھر آپ جو تلاوت فرمارہے تھے وہ جلدی جلدی نہیں، بلکہ بڑے اطمینان سے ٹھیر ٹھیر کر تلاوت فرمارہے تھے۔

ویسے بھی نبی کریم ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ نماز کے اندر جب آپ تلاوت فرماتے تھے تو ہر آیت پر وقف فرماتے تھے۔ (جمع الفوائد/۳/۲۸۹عن اصحاب السنن) اور ساتھ ہی ساتھ دورانِ نماز آپ کوئی ایسی آیت تلاوت فرماتے جس میں تسبیح کا تذکرہ ہوتا، جیسے ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ، یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ﴾ وغیرہ تو اس آیت کو پورا کرنے کے بعد آپ تسبیح یعنی سبحان اللہ بھی پڑھتے تھے۔ اور اگر کسی سوال کا تذکرہ ہوتا، جنت کا یا جنت کی نعمتوں کا تذکرہ ہوتا، یعنی

ایسی چیزیں کہ جن کا اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا چاہیے، تو وہاں پر آپ ﷺ اس آیت کو پورا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس کا سوال بھی کرتے تھے اور دعا مانگتے تھے۔ اور اگر کسی ایسی چیز پر سے آپ کا گذر ہوتا جس سے پناہ مانگنی چاہیے مثلاً جہنم کا یا جہنم کے عذاب کا، اس کی تکالیف کا تذکرہ ہوتا؛ تو وہاں آپ ﷺ ان سے پناہ چاہتے تھے۔ (جمع الفوائد ۳/ ۲۸۹ عن ابی داؤد)

مطلب یہ ہے کہ بڑے اطمینان سے اور ٹھیر ٹھیر کر اور قراءت کے آداب وحقوق کی پوری رعایت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ایک رکعت میں یہ تینوں سورتیں مکمل تلاوت فرمائیں پھر آپ رکوع میں تشریف لے گئے اور **سبحان ربی العظیم** پڑھتے رہے۔ آپ کا رکوع بھی تقریباً آپ کے قیام کے برابر تھا۔ بعضوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ جتنی دیر آپ نے قیام کیا اتنی ہی دیر آپ نے رکوع کیا۔ بعضوں نے فرمایا: جتنا لمبا قیام کیا، اسی مناسبت سے رکوع بھی لمبا کیا۔ اگر چہ رکوع قیام کے برابر تو نہیں تھا، لیکن ایسا بھی نہیں کہ قیام لمبا ہوا تو رکوع پانچ تسبیح پڑھ کر ختم کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے **سمع اللہ لمن حمدہ، ربنالک الحمد** کہا، پھر قومہ میں بھی آپ تقریباً اتنی دیر تک کھڑے رہے جتنی دیر رکوع میں تھے، اس کے بعد آپ سجدے میں تشریف لے گئے، اس میں بھی **سبحان ربی الاعلیٰ** کی تسبیح پڑھتے رہے، اور آپ کا سجدہ بھی اسی مناسبت سے طویل تھا۔

اس روایت کو لاکر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھئے! نبی کریم ﷺ باوجودیکہ تمام مخلوقات میں سب سے افضل تھے، اور تمام انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے سردار تھے، پھر بھی عبادت میں کتنا مجاہدہ کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ مجاہدہ اور محنت کا اتنا زیادہ اہتمام فرماتے تھے؛ تو اب ہمیں کتنا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مناقب﴾

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم لَيْلَةً، فَأَطَالَ الْقِيَامَ. حَتّٰى هَمَمْتُ بِأَمْرٍ سُوْءٍ. قِيْلَ: وَمَاهَمَمْتَ بِهِ؟ قَالَ: هَمَمْتُ أَنْ أَجْلِسَ وَأَدَعَهُ. (متفق علیہ)

یہ روایت بھی اسی طرح کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک رات تہجد کی نماز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مَیں بھی شریک ہوگیا اور آپ کی اقتداء کرلی لیکن آپ نے اتنا طویل قیام کیا کہ مَیں نے ایک بری چیز کا ارادہ کرلیا، میرے دل میں ایک براخیال آ گیا۔

حالانکہ روایتوں میں آتا ہے کہ خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تہجد میں بہت دیر تک قرآن پڑھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ روزانہ عشاء کی نماز کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے، اور اس میں کبھی دیر بھی لگ جاتی تھی۔ ایک روز اسی طرح دیر ہوئی اور آپ فارغ ہوکر باہر نکلے، مسجد کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نماز میں کھڑے ہوئے قرآنِ پاک کی تلاوت کررہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی دیر تک کھڑے ہوئے ان کا قرآن سنتے رہے اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَّقْرَأَ الْقُرْآنَ رَطْبًا كَمَا أُنْزِلَ فَلْيَقْرَأْ عَلٰى قِرَاءَةِ ابْنِ أُمِّ عَبْدٍ﴾ جو آدمی یہ خواہش رکھتا ہو کہ قرآنِ پاک کو اسی طرح تروتازہ پڑھے جس طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں سے اتارا گیا ہے؛ تو اس کو چاہیے کہ ابن ام عبد کی قرأت کے مطابق پڑھے۔ ''ابن ام عبد'' یہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی کنیت ہے۔ (مسند احمد، مسند العشرۃ المبشرین بالجنۃ، حدیث نمبر: ۱۷۰)

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کوفہ سے ایک آدمی آیا اور اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: مَیں ایک ایسے آدمی کے پاس سے آرہا ہوں جو لوگوں کو قرآنِ پاک زبانی لکھواتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا کہ وہ کون ہے؟ گویا اس چیز کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ناپسند فرمایا۔ آنے والے نے کہا: وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور فرمایا: اگر وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں تو ان کو حق ہے کہ ایسا کریں؛ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے: ﴿مَنْ أَحَبَّ أَن يَّقْرَأَ الْقُرْآنَ رَطْبًا كَمَا أُنْزِلَ فَلْيَقْرَأْ عَلَى قِرَاءَةِ بْنِ أُمِّ عَبْدٍ﴾ (مسند احمد، مسند العشرۃ المبشرین بالجنۃ، حدیث نمبر: ۱۷۰)

﴿حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تہجد پڑھی﴾

بہر حال! حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ خود بھی نماز میں بڑے طویل قیام کے عادی تھے، اس کے باوجود فرماتے ہیں: ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تہجد کی نماز میں مَیں بھی شریک ہو گیا اور آپ نے اتنا طویل قیام کیا کہ میرے دل میں برا خیال آنے لگا، مجلس میں جو شاگرد موجود تھے، ان میں سے کسی نے پوچھا: حضرت! کیا برا خیال آیا تھا؟

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص کوئی بات مبہم بیان کرے، اور اس کی تشریح اس سے پوچھ لی جائے؛ تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، بلکہ بجائے اس کے کہ خود کوئی قیاس آرائی کرے، صاحبِ معاملہ ہی سے دریافت کر لینا زیادہ مناسب ہے۔

یہاں برا خیال کیا آیا ﴿قال: هَمَمْتُ اَنْ أَجْلِسَ وَأَدَعَهُ﴾ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ مَیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤں۔ اس خیال کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تعبیر کرتے ہیں کہ برا خیال آیا۔ اس لئے کہ ظاہر ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تہجد میں انھوں نے شرکت اختیار کر لی اور آپ کی اقتداء کر لی، اب آپ کو چھوڑ کر بیٹھ جانا؛ یہ خلافِ ادب چیز تھی

حالانکہ اگر بیٹھ جاتے تب بھی مسئلہ یہ ہے کہ کوئی آدمی نفل نماز کسی کی اقتداء میں پڑھ رہا ہے اور تھک گیا کہ اب کھڑے رہنے کی طاقت نہیں ہے، تو بیٹھ بھی سکتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ تو کھڑے کھڑے نماز پڑھیں اور ابن مسعود بیٹھ جائیں؛ یہ ایک خلافِ ادب چیز تھی۔ اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں ایک برا خیال آیا۔

﴿بڑوں کا ایک ادب﴾

یہاں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استنباط کیا ہے کہ جب بڑے کسی جگہ پر موجود ہوں، تو اقوال اور افعال میں ان کے ساتھ موافقت کرنا؛ یہی آداب کا تقاضہ ہے۔ (فتح الباری ۳/ ۱۹، مسلم ونووی ۱/۲۶۴) مثلاً کسی مجلس میں بڑا موجود ہو، اور وہ کھڑا ہو گیا ہے؛ تو چھوٹوں کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ بیٹھے رہیں۔ ان کو بھی چاہیے کہ کھڑے ہو جائیں، چاہے ان کو کھڑے ہونے کی ضرورت نہ ہو، اس لئے کہ بڑوں کے ساتھ موافقت کرنی چاہیے۔

اسی طرح اقوال کے اندر بھی موافقت کرنی چاہیے۔ مثلاً تلاوت کی مجلس ہے اور کسی بڑے نے تلاوت شروع کر رکھی ہے اور وہ اس میں مشغول ہے، تو چاہے آپ فارغ ہو جائیں، پھر بھی جب تک کہ وہ فارغ نہ ہو؛ وہاں تک بیٹھے رہنا چاہیے۔ یہی مناسب طریقہ ہے۔ یہ آداب میں سے بتلایا ہے۔ یہ ادب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حدیث سے مستنبط کیا ہے۔

اس روایت کو لا کر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے اندر کتنا زیادہ مجاہدہ، محنت اور کوشش فرماتے تھے؛ آپ نے اتنا طویل قیام فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسا آدمی آپ کا ساتھ دینے سے عاجز ہو گیا۔

﴿اور اعمال اس کے ساتھ جاتے ہیں﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ عن رسول الله ﷺ قال: يَتْبَعُ الْمَيِّتَ ثَلاثَةٌ، أَهْلُهُ وَمَالُهُ وَعَمَلُهُ، فَيَرْجِعُ اِثْنَانِ وَيَبْقىٰ وَاحِدٌ، يَرْجِعُ أَهْلُهُ وَمَالُهُ، وَيَبْقىٰ عَمَلُهُ. (متفق علیہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں: کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں، ایک تو اس کے گھر والے، دوسرا اس کا مال اور تیسرا اس کا عمل۔ یعنی جب میت کا جنازہ اٹھا کر قبرستان لے جایا جاتا ہے تو تین چیزیں اس کے ساتھ جاتی ہیں، گھر والے، خاندان والے، اس کی اولاد، رشتہ دار اور متعلقین تو ہوتے ہی ہیں، اور مال بھی ہوتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں اور قدیم عربوں کے یہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی کا جنازہ اٹھایا جاتا تھا تو اس کا مال بھی اس کے ساتھ قبرستان لے جاتے تھے اور دفن کے بعد واپس لایا جاتا تھا۔ آج بھی بعض قوموں میں یہ رواج ہے کہ وہ مخصوص اموال ساتھ لے جاتے ہیں بلکہ اسلام سے پہلے مصر وغیرہ کے اندر یہ دستور تھا کہ مال کو بھی میت کے ساتھ قبر کے اندر رکھ دیا جاتا تھا۔ خیر! اگرچہ آج کل وہ دستور تو نہیں ہے لیکن اس کے مال میں سے کچھ نہ کچھ چیز تو ساتھ جائے گی۔ مثلاً جنازے کی چارپائی پر بچھانے کے لئے یا اس کو اوڑھانے کے لئے چادر ہوگی۔ تو مال کا کچھ حصہ تو ساتھ گیا۔

اسی کو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿فَيَرْجِعُ اِثْنَانِ وَيَبْقىٰ وَاحِدٌ﴾ دو چیزیں واپس آجاتی ہیں اور ایک باقی رہ جاتی ہے۔ کون واپس آتا ہے؟ ﴿يَرْجِعُ أَهْلُهُ وَمَالُهُ﴾ دفن کرنے کے بعد اس کے گھر والے اور مال تو واپس آجاتا ہے ﴿وَيَبْقىٰ عَمَلُهُ﴾ اور اعمال اس کے ساتھ رہ جاتے ہیں۔

اس ارشاد کے ذریعہ سے نبی کریم ﷺ نے ہم کو یہ تلقین فرمائی کہ جو چیز ساتھ رہنے والی ہے، قبر میں بھی ساتھ جائے گی اور حشر میں بھی ساتھ رہے گی؛ اس کے لئے ہم کو محنت کرنی چاہیے۔ آدمی مال ودولت جمع کرنے کے لئے محنت کرتا ہے، اپنی صلاحیت کو اس کے اندر استعمال کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اگر اس نے بہت مال ودولت اور سرمایہ جمع بھی کرلیا، اور بہت روپے پیسے اکٹھے بھی کر لئے؛ تو وہ اس کے ساتھ جانے والے نہیں ہیں۔ اس کو تو دنیا ہی میں چھوڑ کر جائے گا۔ ہاں! اگر اس نے اعمال پر محنت کوشش اور مجاہدہ کیا ہے، تو وہ اس کے ساتھ جانے والے ہیں۔

اسی مناسبت سے اس روایت کو یہاں لائے ہیں کہ آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں، اللہ کے احکام کی بجا آوری میں اور نیک کاموں میں خوب محنت و کوشش کرنی چاہیے، تا کہ وہ سارے نیک کام اس کے ساتھ جائیں۔

﴿معمولی مت سمجھو﴾

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال النبی ﷺ: اَلْجَنَّةُ أَقْرَبُ اِلیٰ أَحَدِکُمْ مِنْ شِرَاکِ نَعْلِهٖ، وَالنَّارُ مِثْلُ ذَالِکَ. (رواہ البخاری)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: انسان کے چپل کا تسمہ اس سے کتنا قریب ہوتا ہے، جنت اس سے بھی زیادہ قریب ہے یعنی چپل بالکل آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے؛ جنت اس سے بھی قریب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چھوٹے سے نیکی کے کام کے ذریعہ سے جنت حاصل کر لیتا ہے، اس معنی کر فرمایا کہ جنت اتنی قریب ہے۔

علماء نے لکھا ہے اور حدیث کا بھی مفہوم ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ آدمی کسی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑے نہیں، اور کسی بدی کو چھوٹا سمجھ کر کرے نہیں۔ اس لئے کہ نیکی کا کوئی چھوٹا سا کام جس کو آپ نے چھوٹا اور معمولی سمجھ رکھا ہے، اور آپ نے کرلیا اور اسی کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں مقبولیت حاصل ہوگئی اور وہی کام نجات کا ذریعہ بن گیا۔ اس لئے کہ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو پسند آتا ہے اور کون سے عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں نجات مل جاتی ہے۔

﴿صرف دو رکعتیں کام آئیں﴾

بڑے بڑے اکابر کے واقعات ہیں کہ جب انتقال ہوا اور ان کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو انہوں نے بتایا کہ فلاں معمولی نیکی نے نجات دلوادی۔ حضرت جنید بغدادی کے متعلق لکھا ہے کہ کسی نے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ کون سا عمل کام آیا؟ فرمایا بڑے بڑے علمی نکات اور دوسری ساری چیزیں سب دھری کی دھری رہ گئیں؛ بس صرف وہ دو رکعتیں جو رات کے آخری حصہ میں ادا کرتا تھا، اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے مغفرت فرمادی
(احیاء العلوم/طبقات الحنابلہ)

اللہ تعالیٰ کے یہاں مغفرت کے لئے تو بہانہ چاہیے۔ اسی لئے کوئی بھی نیکی کے عمل کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑنا نہیں چاہیے، بلکہ کرلیجیے، ہوسکتا ہے کہ جس اخلاص سے کیا ہے؛ وہ پسند آجائے، اور اسی پر مغفرت ہوجائے۔

﴿نجات ہوگئی﴾

ایک بدکار عورت ایک پیاسے کتے کو پانی پلاتی ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے زندگی بھر کی نافرمانیاں اور بدکاریاں معاف فرما کر اس کے لئے جنت کا فیصلہ ہوجاتا ہے

کتے کو پانی پلانا یہ کوئی بڑا عمل نہیں ہے، معمولی سی چیز ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ ایسا پسند ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ معاف کردیا۔ (مشکوٰۃ، ۱/ ۱۶۸ متفق علیہ)

ایک آدمی جارہا تھا اس نے دیکھا کہ ایک درخت کی ٹہنی راستے میں آڑ بن رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کی وجہ سے لوگوں کو آنے جانے میں تکلیف ہوگی، اس نے کاٹ کر راستہ صاف کردیا، اللہ تعالیٰ نے اس پر اس کی مغفرت فرمادی۔ (مشکوٰۃ، ۱/ ۱۶۸ متفق علیہ)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: کسی نیک عمل کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑو مت؛ ہوسکتا ہے کہ یہی تمہارے لئے مغفرت کا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا اور جنت میں جانے کا ذریعہ بن جائے۔ اور کسی گناہ اور برائی کے کام کو چھوٹا سمجھ کر کرو مت؛ ہوسکتا ہے کہ وہ گناہ جس کو چھوٹا سمجھ کر کیا، اسی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوجائے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معمولی سی بات پر پکڑ ہوجاتی ہے اور وہی جہنم میں جانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی کو حدیثِ پاک میں فرمایا گیا: ﴿وَالنَّارُ مِثْلَ ذَالِکَ﴾ جہنم بھی اسی طرح ہے۔ یعنی جس طرح جنت آپ کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے، اسی طرح جہنم کا حال بھی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معمولی سے عمل اور چھوٹے سے گناہ کی وجہ سے آدمی جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے آدمی کو ہر نیکی کے کرنے کا – چاہے وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو – اور ہر بدی سے بچنے کا – چاہے وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو – اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿مسجد کا ٹاٹ﴾

عن أبی فراس ربیعۃ بن کعب الاسلمی خَادِمِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وَمِنْ أَھْلِ الصُّفَّۃِ رضی اللہ عنہ قَالَ: کُنْتُ أَبِیْتُ مَعَ رسولِ اللّٰہِ ﷺ فَآتِیْہِ بِوَضُوْئِہٖ وَحَاجَتِہٖ فَقَالَ: سَلْنِیْ، فَقُلْتُ: أَسْأَلُکَ مُرَافَقَتَکَ فِی الْجَنَّۃِ، فَقَالَ: أَوَغَیْرَ ذَالِکَ؟ قُلْتُ: ھُوَ ذَاکَ. قَالَ: فَأَعِنِّیْ عَلٰی نَفْسِکَ بِکَثْرَۃِ السُّجُوْدِ. (رواہ مسلم)

حضرت ابوفراس ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ جو نبی کریم ﷺ کے خادم تھے اور اہل صفہ میں سے تھے، سفر و حضر میں نبی کریم ﷺ کی خدمت کیا کرتے تھے اور ان کا بستر بھی حجرۂ شریفہ کے باہر لگا کرتا تھا، تاکہ ذرا سی آہٹ محسوس ہو، اور حکم بجالاویں۔ وہ ہمیشہ منتظر ہی رہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی جانب سے خدمت کا کوئی حکم ہو، اور مَیں بجالاؤں۔ نبی کریم ﷺ جب تہجد کے لئے اٹھتے تھے، تو فوراً پانی کا انتظام کرتے تھے، آپ کی دوسری ضرورت مصلٰی کپڑا وغیرہ لاتے تھے، اور ہمیشہ مسجد کے اندر ہی رہتے تھے (المسند الجامع) اسی وجہ سے ان کا لقب ﴿حِلْسُ الْمَسْجِدِ﴾ ''مسجد کا ٹاٹ'' ہو گیا تھا۔ یعنی ٹاٹ جس طرح ایک ہی جگہ پڑا رہتا ہے، کہیں ادھر ادھر نہیں جاتا، اسی طرح وہ بھی مسجد ہی میں پڑے رہتے تھے، اس لئے ان کو مسجد کا ٹاٹ کہا جاتا تھا۔

﴿تم بھی میرا ہاتھ بٹاؤ﴾

اس روایت کے راوی یہی حضرت ابوفراس ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نبی کریم ﷺ کے پاس ہی رات گذارتا تھا، اور آپ کے لئے وضو کا پانی لا دیا کرتا تھا اور آپ کی دوسری جو بھی ضرورت ہوتی تھی؛ وہ پوری کرتا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ایک روز فرمایا: ﴿سَلْنِیْ﴾ مانگو! کیا مانگتے ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب خدمت کی جاتی ہے تو مخدوم خوش ہو کر خادم سے کہتا ہے کہ کیا ضرورت ہے؛ بتاؤ۔ ہوسکتا ہے نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار دیا گیا ہو کہ آپ ان کے لئے جو مانگیں گے اللہ تعالیٰ ان کو دے دے گا، اس لئے آپ نے ان سے اس موقعہ پر کہا ہو: ﴿سَلْنِیْ﴾ مانگو۔ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جنت میں آپ کا ساتھ مانگتا ہوں۔ دیکھئے! انہوں نے یہ نہیں مانگا کہ دنیا کی کوئی سلطنت مل جائے۔ کوئی بڑی جائیداد، کوئی بڑا سرمایہ یا کوئی بڑی

دولت نہیں مانگی، بلکہ آخرت کے متعلق سوال کیا کہ جنت کے اندر آپ کی مرافقت اور آپ کا ساتھ نصیب ہوجائے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مخصوص مقام عطا کیا گیا ہے جو کسی اور کو نہیں ملنے والا ہے۔ پھر یہ رفاقت کا کیا مطلب؟

تو اس رفاقت کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ مقام تو حاصل نہ ہو، لیکن دنیا میں جس طرح نبی کریم ﷺ کے قریب رہتے تھے، اسی طرح باوجود اس مقام پر نہ پہنچنے کے ایسا کر دیا جائے کہ وہاں جب چاہیں نبی کریم ﷺ کی زیارت ہوجایا کرے۔

انہوں نے جب جنت میں آپ کی رفاقت کا مطالبہ کیا تو اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کچھ اور؟ مطلب یہ ہے کہ یہی چاہیے یا کچھ اور بھی مطالبہ ہے؟ مَیں نے کہا: یہی چاہیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اپنے نفس کے مقابلہ میں سجدوں کی کثرت کے ذریعہ سے تم میری مدد کیا کرو۔ یعنی تم نماز کثرت سے پڑھا کرو، خوب عبادت کیا کرو تو یہ چیز ان شاء اللہ حاصل ہوجائے گی، مَیں بھی تمہارے لئے دعا کروں گا۔ گویا میری دعا کے تمہارے حق میں قبول ہونے میں اور تمہارے لئے جو چیز مانگی جارہی ہے اس کے حاصل ہونے میں؛ تم بھی میرا ہاتھ بٹاؤ۔ اور اس کی شکل یہ ہے کہ تم بھی نمازوں کے ذریعہ سجدوں کی کثرت کا خوب اہتمام کرو۔

﴿سجدوں کی کثرت کا اہتمام کرو﴾

عن أبی عبداللہ ویقال أبو عبدالرحمٰن ثوبان رضی اللہ عنہ مولیٰ رسول اللہ ﷺ قال: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: عَلَیْکَ بِکَثْرَۃِ السُّجُوْدِ، فَاِنَّکَ لَنْ تَسْجُدَ لِلّٰہِ سَجْدَۃً اِلَّا رَفَعَکَ اللّٰہُ بِھَا دَرَجَۃً وَحَطَّ عَنْکَ بِھَا خَطِیْئَۃً. (رواہ مسلم)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ جو نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ ہیں۔ان کے متعلق لکھا ہے کہ کسی قافلہ والوں نے ان کو گرفتار کرلیا تھا، نبی کریم ﷺ کا گذر ہوا، آپ ﷺ نے ان کو خرید کر آزاد کردیا۔وہ فرماتے ہیں: مَیں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:﴿عَلَیْکَ بِکَثْرَۃِ السُّجُوْدِ﴾ تم سجدوں کی کثرت کا اہتمام کرو، سجدے کی کثرت کو لازم پکڑو۔

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے سوال کیا: کون سا عمل مجھے جنت تک پہنچانے والا ہے؟ تو حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مَیں نے یہی سوال نبی کریم ﷺ سے کیا تھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:﴿عَلَیْکَ بِکَثْرَۃِ السُّجُوْدِ﴾ کثرت سے سجدے کیا کرو۔ مطلب یہ ہے کہ خوب نماز پڑھا کرو۔کیوں؟﴿فَاِنَّکَ لَنْ تَسْجُدَ لِلّٰہِ سَجْدَۃً اِلَّا رَفَعَکَ اللہُ بِھَا دَرَجَۃً وَحَطَّ عَنْکَ بِھَا خَطِیْئَۃً﴾ اس لئے کہ تم جب بھی کوئی سجدہ کروگے تو اس پر اللہ تعالیٰ تمہارا ایک درجہ بلند کریں گے اور تمہارے ایک گناہ کو معاف فرمائیں گے۔گویا ہر سجدہ تم کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرے گا، اللہ تعالیٰ کے قرب میں ترقی ہوگی اور جب قرب میں ترقی ہوگی تو جو تم چاہتے ہو- یعنی جنت کا حصول- وہ آسانی سے حاصل ہوجائے گا۔حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے (مسلم شریف ۱/۱۹۱) گویا نمازوں کی کثرت اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے۔

علماء کے درمیان یہ بات موضوعِ بحث ہے کہ آدمی اگر نفل نماز پڑھے تو اس میں طولِ قیام زیادہ افضل ہے یا کثرت سجود؟ یعنی زیادہ رکعتیں پڑھے یا لمبی رکعتیں پڑھے؟ ایک شکل تو یہ ہے کہ ایک گھنٹہ میں آپ لمبی قراءت کر کے دو ہی رکعتیں پڑھیں۔اور دوسری شکل یہ ہے کہ ایک گھنٹہ میں بیس پچیس رکعتیں پڑھ لیں۔تو علماء کی دونوں طرح کی رائیں ہیں۔ جنہوں نے کثرتِ سجود کو افضل کہا ہے، انھوں نے اسی روایت سے استدلال کیا ہے۔

﴿یہ بات بھی مجاہدہ پر موقوف ہے﴾

عن أبی صفوان عبداللہ بن بسر الأسلمی رضی اللہ عنہ قال: قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: خَیرُ النَّاسِ مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَحَسَنَ عَمَلُهُ.

حضرت عبداللہ بن بسر اسلمی رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ بچے تھے، ان کے والدان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: یہ بچہ سو سال زندہ رہے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعض حضرات نے دمشق میں سب سے اخیر میں وفات پانے والے صحابہ میں ان کو شمار کیا ہے۔ (اسد الغابہ ۳/۱۸۶)

وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جس کی عمر بھی طویل ہو، اور اعمال بھی نیک ہوں۔ یعنی اللہ تعالیٰ لمبی عمر بھی دیں اور نیک کام کی توفیق بھی دیں۔ ظاہر ہے کہ لمبی عمر کے ساتھ ساتھ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک اعمال کی توفیق بھی میسر آجائے؛ تو یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے لئے زیادہ سے زیادہ اجر لکھا جائے گا۔ یہ بات بھی مجاہدہ کر کے عملِ کثیر کرنے پر موقوف ہے۔ اس وجہ سے یہاں ذکر کیا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق نصیب فرمائے

مجاہدہ
مجلس ﴿۴﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المجاهدة ۴

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلاَنَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:

عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: غَابَ عَمِّیْ أَنَسُ بْنُ نَضَر رضی اللہ عنہ عَنْ قِتَالِ بَدْرٍ. فَقَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! غِبْتُ عَنْ أَوَّلِ قِتَالٍ قَاتَلْتَ الْمُشْرِکِیْنَ. لَئِنِ اللّٰہُ أَشْھَدَنِیْ قِتَالَ الْمُشْرِکِیْنَ، لَیُرِیَنَّ اللّٰہُ مَاأَصْنَعُ. فَلَمَّاکَانَ یَوْمُ أُحُدٍ، اِنْکَشَفَ الْمُسْلِمُوْنَ. فَقَالَ: اَللّٰھُمَّ أَعْتَذِرُاِلَیْکَ مِمَّا صَنَعَ ھٰؤُلَآءِ - یَعْنِیْ أَصْحَابَہ - وَأَبْرَأُاِلَیْکَ مِمَّاصَنَعَ ھٰؤُلَآءِ - یَعْنِی الْمُشْرِکِیْنَ - ثُمَّ تَقَدَّمَ فَاسْتَقْبَلَہُ سَعْدُبْنُ مُعَاذٍ. فَقَالَ: یَاسَعْدُبْنُ مُعَاذ! اَلْجَنَّۃُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ. اِنِّیْ أَجِدُ رِیْحَھَادُوْنَ أُحُدٍ. قَالَ سَعْدٌ: فَمَااسْتَطَعْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَاصَنَعَ. قَالَ أَنَس رضی اللہ عنہ: فَوَجَدْنَابِہٖ بِضْعاً وَّثَمَانِیْنَ ضَرْبَۃً بِالسَّیْفِ أَوْطَعْنَۃً بِرُمْحٍ، أَوْرَمْیَۃً بِسَھْمٍ. وَوَجَدْنَاہُ قَدْقُتِلَ وَمَثَّلَ بِہِ الْمُشْرِکُوْنَ. فَمَاعَرَفَہُ أَحَدٌ اِلَّاأُخْتُہُ بِبَنَانِہٖ. قَالَ أَنَس رضی اللہ عنہ: کُنَّانَریٰ أَوْنَظُنُّ أَنَّ ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ نَزَلَتْ فِیْہِ وَفِیْ أَشْبَاھِہٖ (مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْامَاعَاھَدُوْااللّٰہَ عَلَیْہِ). (متفق علیہ)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب مجاہدہ کے سلسلہ میں قائم کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لئے کوشش کرنا، محنت اور مشقت اٹھانا، اسی سلسلے میں یہ روایت بھی لائے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے چچا حضرت انس بن نضر غزوۂ بدر کے موقعہ پر حاضر نہیں ہوسکے تھے۔

﴿دشمن کے لئے اقتصادی رکاوٹیں کھڑی کرنا﴾

غزوۂ بدر ۲ سنہ ھ میں پیش آیا ہے۔ دراصل نبی کریم ﷺ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام کی طرف گیا تھا، وہ اپنی مہم پوری کر کے مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اسی مجلس میں نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا: ہم اس قافلہ کا تعاقب کریں۔ چونکہ مکہ والوں کا ارادہ ہی یہ تھا کہ اس تجارتی قافلہ سے جو منافع حاصل ہوں گے، اس کا بیشتر حصہ مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔

اس موقعہ پر ایک بات عرض کردوں کہ بعض مستشرقین کے اعتراض کی وجہ سے علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے سیرت النبی میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ قافلہ کے تعاقب کے لئے تشریف نہیں لے گئے تھے۔ اگرچہ ان کے اس موقف کی دیگر بعض حضرات نے تصدیق کی ہے، حالانکہ حقیقت یہی ہے کہ آپ ﷺ تجارتی قافلہ کے تعاقب میں تشریف لے گئے تھے۔ آج اس زمانہ میں بھی دشمن کے اوپر اقتصادی پابندی لگانا؛ یہ معمولی چیز ہے، اور اس فعل کو اس دورِ ترقی میں بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ تو اگر اُس زمانہ میں بھی دشمن کی اقتصادی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا گیا؛ تو یہ کوئی اعتراض کی چیز نہیں ہے، اور اس کی وجہ سے کسی مسلمان کو مرعوب ومتأثر ہو کر دفاعی پوزیشن میں آ کر جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیدھی سادی بات ہے۔

جب آج یہ لوگ معمولی معمولی چیزوں پر یہ کام کر سکتے ہیں کہ سوڈان جیسا چھوٹا سا ملک ہے، جب اس نے ایک ارادہ کیا کہ اسلامی طرز اور اسلامی قانون کو اپنے ملک میں نافذ کرے، تو امریکہ اور دوسری عیسائی طاقتوں نے مل کر اس ملک میں رہنے والے عیسائیوں کو

بلاوجہ حکومت کے خلاف کھڑا کردیا اور پھر ساری دنیا میں شور مچادیا کہ وہاں عیسائیوں پر مظالم ہورہے ہیں، اور پوپ پال جو عیسائیوں کے یہاں مذہبی شخصیت سمجھی جاتی ہے، اس کی طرف سے اعلان کیا جارہا ہے اور تمام عیسائی مملکتوں کو اُبھارا جارہا ہے کہ اس ملک کے ساتھ اقتصادی بائیکاٹ کیا جائے۔ یہ آج بھی ہورہا ہے، حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، محض پروپیگنڈہ ہے۔ تو اس دورِ ترقی میں جو لوگ انسانی حقوق کے علَم بردار سمجھے جاتے ہیں اور اس کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں؛ وہی لوگ یہ سب کررہے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں، وہاں عیسائیوں پر کوئی مظالم نہیں ہورہے ہیں۔

﴿غزوۂ بدر کا پس منظر﴾

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اقتصادی طور پر دشمن کو کمزور کرنا؛ یہ ایک پرانی تدبیر ہے، جو دشمن کے مقابلہ میں اختیار کی جاتی ہے۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ نے قریش کے اس تجارتی قافلہ کے تعاقب کے لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ترغیب دی کہ معلوم ہوا ہے کہ قافلہ لوٹ رہا ہے اور میرا جی یہ چاہتا ہے کہ ان کا تعاقب کیا جائے۔ چنانچہ اس مجلس میں جتنے لوگ موجود تھے انھوں نے آمادگی ظاہر کی۔ بعض لوگ وہ بھی تھے جن کے پاس اس وقت سامان نہیں تھا انھوں نے نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم کچھ تیاری کرلیں۔ آپ ﷺ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ جو موجود ہیں اور تیار ہیں؛ وہ چلیں، خاص طور پر جنگ کی کوئی تیاری بھی نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے کہ وہ قافلہ جس کا تعاقب کیا جانا تھا؛ وہ بڑی تعداد میں نہیں تھا، ساٹھ ستّر آدمیوں پر مشتمل تھا، اس لئے کوئی زیادہ ساز و سامان یا ہتھیار جمع کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کے ساتھ ان کے تعاقب کے لئے روانہ ہوئی۔

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے پاس صرف چندگنی چنی تلواریں تھیں اور گھوڑے تو صرف دو ہی تھے اور تیر چلانے کے لئے کمان کے اندر تیر بھی پورے نہیں تھے۔

چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے کہ جب جنگ کی صورت پیش آ گئی تو نبی کریم ﷺ نے تدبیر کے طور پر یہ فرمایا تھا کہ دشمن جب دور ہوں، اس وقت ہی تیر چلائے جائیں، جب قریب آ ئیں تو تیر چلانے کی ضرورت نہیں؛ نیزے سے کام لیا جائے کہ وہ خطا کرنے والا نہیں۔ (بخاری شریف ۲/ ۵۶۷)

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس وقت جو حضرات موجود تھے وہی نبی کریم ﷺ کی پکار اور دعوت پر لبیک کہتے ہوئے روانہ ہوئے۔ تین سو تیرہ کی تعداد تھی۔ اور چونکہ پہلے سے کوئی تیاری نہیں کی گئی تھی، اس لئے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی موجود نہیں تھے اس لئے ان کی بھی شرکت کی نوبت نہیں آئی۔ اور بھی بہت سارے مسلمان- جو اس وقت موجود نہیں تھے وہ -غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو پائے۔

اب یہ حضرات تو قافلہ کے تعاقب میں گئے تھے لیکن قافلہ ہاتھ سے نکل گیا اور مکہ والوں کو قافلے والوں کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے، اس لئے ان کے دفاع اور حفاظت کے لئے مکہ والے ایک لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ خدا تعالیٰ کو دشمن کی طاقت کو توڑنا منظور تھا اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ قافلہ تو صحیح سلامت نکل گیا اور کفار کے لشکر کے ساتھ مدبھیڑ ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے ان مکہ والوں کو ان کی سرگرمیوں کی خوب سزا چکھائی۔ ان کے بہت سارے آدمی مارے گئے اور بہت سارے قید پکڑے گئے۔

بہرحال! اس موقعہ پر یہ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ- جو نبی کریم ﷺ کے خادم

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا ہوتے ہیں- موجود نہیں تھے، اس لئے ان کی شرکت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جب غزوۂ بدر کا واقعہ ہو چکا اور بدر میں شرکت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے فضائل سے نوازا گیا جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ افسوس رہ گیا کہ ہم کو شرکت کا موقعہ نہیں ملا۔ اسی لئے جیسا کہ مَیں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ غزوۂ احد کے موقعہ پر جب مشرکین کا لشکر مدینہ کے اوپر چڑھ کر آیا اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش تو یہ تھی کہ مدینہ ہی میں رہ کر ان کا مقابلہ کیا جائے، باہر نکل کر مقابلہ نہ کیا جائے، لیکن جن لوگوں کو پہلے موقعہ نہیں ملا تھا، ان کا ہی اصرار تھا کہ باہر جا کر میدان ہی میں لڑیں گے۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کو دکھا دیں گے

حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقعہ نہیں ملا تھا، اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کا مشرکین کے ساتھ جو سب سے پہلا مقابلہ ہوا تھا اور میدان میں نکل کر دو بدو جنگ کی نوبت آئی تھی، اس میں مجھے شرکت کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ قصداً غائب رہے تھے بلکہ جیسا کہ ابھی عرض کیا کہ اتفاقی بات تھی کہ وہ حاضر نہیں تھے، اس لئے شریک نہیں ہو پائے، لیکن اس پر ان کو بڑا افسوس تھا کہ مَیں اس سے محروم رہا۔ اب آگے کے لئے وہ اپنا ایک عزم اور ارادہ ظاہر کرتے ہیں: اگر آئندہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشرکین سے مقابلہ کے لئے حاضری کی نوبت دی تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو دکھا دیں گے کہ مَیں کیا کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آئندہ کبھی مجھے موقعہ دیا اور مشرکین کے ساتھ جنگ کی نوبت آئی تو ان شاء اللہ لوگ دیکھ لیں گے کہ مَیں کیا کرتا ہوں۔ اپنے عزائم کا انھوں نے کھلے الفاظ میں

اظہار نہیں کیا۔ اس موقعہ پر شراح لکھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے انھوں نے کوئی تدبیر سوچ رکھی ہو، لیکن احتیاط کے طور پر اپنے عزائم کو مبہم الفاظ میں بیان کیا ہو۔

غزوۂ احد اور حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ

چنانچہ جب احد کا دن آیا اور بھگدڑ شروع ہوئی تو مسلمانوں میں سے بہت سے لوگ میدان چھوڑ کر ہٹنے لگے۔ جیسا کہ مَیں پہلے بتلا چکا ہوں کہ غزوۂ احد کے موقعہ پر ایسا ہوا کہ شروع میں تو مسلمانوں کو غلبہ ہوا، اور لڑائی شروع ہونے سے پہلے نبی کریم ﷺ نے تقریباً پچاس آدمیوں کی ایک جماعت کو حفظ ماتقدم کے طور پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بٹھا رکھا تھا، تاکہ دشمن اگر پیچھے کی طرف سے گھوم کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کے واسطے آئے تو حفاظت ہو سکے۔ اور ان کو تاکید کر دی تھی کہ ہم دشمنوں کے مقابلہ میں چاہے کامیاب ہوں یا ناکام ہوں، ہم جیتیں یا ہاریں؛ تم اپنی جگہ مت چھوڑیو۔

اب یہاں یہ ہوا کہ لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہا اور مسلمان غالب آنے لگے اور مشرکین میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ یہ منظر جب ان لوگوں نے دیکھا جن کو وہاں بٹھایا گیا تھا تو انھوں نے کہا کہ اب تو ہم بھی اپنی جگہ چھوڑ کر میدان میں جائیں۔ ان کے امیر نے ان کو بہت سمجھایا کہ نبی کریم ﷺ نے تاکید فرما رکھی ہے کہ ہم کامیاب ہوں یا ناکام؛ آپ اپنی جگہ مت چھوڑنا۔ انھوں نے کہا: اس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک کہ جنگ جاری رہے، ہمیں اپنی جگہ نہیں چھوڑنی ہے۔ اب تو جنگ کا فیصلہ ہو گیا اور مسلمانوں کو کامیابی ہوگئی؛ اب کیا حرج ہے؟ یہ ان کی ایک اجتہادی غلطی تھی اور وہ اپنی جگہ چھوڑ بیٹھے۔ اگرچہ ان کے امیر نے بہت سمجھایا کہ جگہ نہیں چھوڑنی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔

اس موقعہ پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ مشرکین کا ایک دستہ لے کر پیچھے سے گھوم کر آئے اور انھوں نے مسلمانوں پر پیچھے کی طرف سے حملہ کر دیا اور اسی کے نتیجے میں مسلمانوں میں افراتفری پھیلی۔ مسلمان ایک دم گھبرا گئے، بہت سے لوگ میدان چھوڑ کر پہاڑ کے اوپر بھاگنے لگے۔ اسی کو کہہ رہے ہیں کہ احد کے دن جب مسلمان میدان چھوڑنے لگے؛ تو یہ منظر دیکھ کر حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ - جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا - مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے: ﴿اَللّٰهُمَّ أَعْتَذِرُ اِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ هٰؤُلَآءِ﴾ اے اللہ! مَیں آپ کے سامنے معذرت پیش کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں اس حالت سے جو انھوں نے اختیار کی۔ گویا مسلمانوں کے اس بھاگنے سے ان کو اتفاق نہیں تھا، اس کو وہ پسند نہیں کر رہے تھے؛ لیکن اس عدمِ پسندیدگی کے اظہار کے لئے انھوں نے یہ تعبیر اختیار کی: اے اللہ! مَیں معذرت پیش کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں ان کی اس حرکت سے؛ جو انھوں نے کی، تاکہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معافی کی درخواست بھی ہو جائے۔ گویا ان کی اس حرکت سے بیزاری کا اظہار بھی کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست بھی پیش کر دی۔

﴿وَأَبْرَأُ اِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ هٰؤُلَآءِ﴾ اور اپنی برأت کا اظہار کرتا ہوں اس حرکت سے بھی جو مشرکین نے اختیار کی، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائی۔ مشرکین کی حرکت سے بھی بیزاری ظاہر فرمائی، لیکن اس کے لئے جو تعبیر اختیار کی اس کے الفاظ کھلم کھلا استعمال کئے۔ گویا دونوں کی حرکتوں سے اپنے اتفاق کا اظہار نہیں کرتے ہیں؛ لیکن اس کے لئے تعبیر الگ الگ اختیار فرمائی۔ جیسی جس کے مناسبِ حال تھی۔ یہ بھی ان کی بڑی دانشمندی اور اتباعِ ادب کی بات ہے۔

خیر! یہ کہہ کر میدان میں آگے بڑھے۔جس وقت آگے بڑھ رہے تھے توان کو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ملے جو انصار میں قبیلہ ٔاوس کے سردار ہیں۔ان کا مقام،ان کی جرأت و بے باکی کا حال انصار میں ویسا ہی ہے جیسا مہاجرین میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ (حادی الارواح) یعنی مشرکین کے معاملہ میں جو شدت مہاجرین میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اندر موجود تھی؛ وہی شدت انصار میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے اندر تھی۔ان کو حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اے سعد بن معاذ! رب کعبہ کی قسم! مجھے تو احد پہاڑ کے پاس جنت کی خوشبو محسوس ہورہی ہے۔

جنت کی خوشبو محسوس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب شہید ہوجائیں گے تو جنت نصیب ہوگی۔گویا مجازی طور پر استعارہ کے الفاظ میں تعبیر کررہے ہیں۔حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: ہوسکتا ہے کہ واقعتاً ان کو جنت کی خوشبو آرہی ہو،اس لئے کہ وہ اسی موقعہ پر شہید بھی ہوئے ہیں۔جس آدمی کی موت کا وقت قریب آتا ہے؛ تو آخرت کے احوال بھی اس کے سامنے منکشف ہوتے ہیں۔بہرحال! حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنت کی خوشبو آرہی ہے،اُدھر جارہا ہوں۔

﴿مجھ سے وہ نہیں ہوسکا﴾

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جب یہ واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کررہے ہیں تو خود فرمارہے ہیں: اے اللہ کے رسول! مجھ سے وہ نہیں ہوسکا؛ جو انھوں نے کیا۔یعنی اس وقت ان کی جرأت اس درجہ ٔ کمال پر پہنچی ہوئی تھی کہ اگرچہ انھوں نے مجھے کہا کہ جنت کی خوشبو آرہی ہے،لیکن مَیں وہ جرأت نہیں کرسکا جو انھوں نے بتائی۔خدا تعالیٰ کی طرف سے جس کے لئے جو مقدر ہوتا ہے؛ اس کو اس کی توفیق بھی آسان ہوجاتی ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو اُن کے بھتیجے ہیں فرماتے ہیں: حضرت انس بن نضر شہید ہوگئے۔ شہادت کے بعد جب ان کے جسم پر دیکھا گیا تو تلوار، نیزے اور تیر کے اَسّی (۸۰) سے زیادہ زخم تھے، اور ساتھ ہی ساتھ مشرکین نے مُثلہ بھی کر دیا تھا۔

غزوۂ احد کے موقعہ پر مشرکین نے ایک شرارت یہ بھی کی تھی کہ مسلمانوں کے جتنے حضرات شہید ہوئے تھے، ان کے اعضاء؛ ناک کان وغیرہ کاٹ دئے تھے۔ مثلہ کرنے کا مطلب یہی ہے کہ مقتول کے مختلف اعضاء کاٹ دینا، ناک، کان کاٹ دئے، آنکھیں پھوڑ دیں، شرم گاہ کاٹ دی۔ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا تھا۔ ایک تو زخمی تھے اور ساتھ ہی یہ اعضاء بھی کاٹ لئے تھے؛ اس وجہ سے پہچانے نہیں جاتے تھے، ان کی بہن حضرت رُبَیِّع بنت نضر رضی اللہ عنہا نے ان کی انگلیوں کے پورو ے (اس پر کوئی نشانی تل یا اور کوئی ایسی چیز تھی جس) کے ذریعہ سے پہچانا کہ یہ میرے بھائی کی لاش ہے۔

﴿اور اپنے آپ کو شہید کرا دیا﴾

یہاں اس روایت کے لانے کا مقصد یہی ہے کہ دیکھئے! انھوں نے اللہ کے راستہ میں، اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے واسطے کیسی مشقت اٹھائی اور کیسی محنت و کوشش کی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ یعنی صحابہ کرام یہ سمجھتے تھے کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا یہ ارشاد ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ایمان والوں میں سے بہت سے مرد وہ ہیں جنہوں نے سچ کر دکھلایا وہ عہد و پیان؛ جو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا

چنانچہ انھوں نے یہ عہد کیا تھا کہ اگر آئندہ مشرکین سے مقابلہ کی نوبت آئی تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو دکھلائیں گے کہ مَیں کیا کرتا ہوں۔ لہٰذا انھوں نے ایسا کر کے بتلایا۔ ایسا مقابلہ کیا کہ جان کی بازی لگادی اور اپنے آپ کو شہید کرادیا۔

﴿تحصیلِ فضائل کے لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مجاہدہ﴾

عن أبی مسعود عقبۃ بن عمرو الانصاری البدری رضی اللہ عنہ قال: لَمَّا نَزَلَتْ آيَةُ الصَّدَقَةِ كُنَّا نُحَامِلُ عَلٰى ظُهُوْرِنَا. فَجَآءَ رَجُلٌ فَتَصَدَّقَ بِشَيْئٍ، فَقَالُوْا: مُرَآءٌ. وَجَآءَ رَجُلٌ آخَرَ فَتَصَدَّقَ بِصَاعٍ، فَقَالُوْا: اِنَّ اللهَ لَغَنِيٌّ عَنْ صَاعِ هٰذَا. فَنَزَلَتْ ﴿اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِيْنَ لاَ يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ﴾

حضرت عقبہ بن عمرو ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں: جب صدقہ کی آیت نازل ہوئی جس میں ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی تو اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کر کے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے واسطے ہمارے پاس کچھ نہیں تھا، لہٰذا ہم مزدوری کرتے تھے اور بوجھ اٹھاتے تھے اور اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوتا تھا، وہ اللہ کے راستہ میں صدقہ کرتے تھے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی صدقہ کی ترغیب پر ہم عمل کرسکیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کے حکموں کی بجا آوری کے لئے اپنے مقدور بھر پوری کوشش کرتے تھے، اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو جیسی طاقت عطا فرمائی تھی اور جس کی جیسی حیثیت تھی؛ ہر شخص اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنا اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ چنانچہ بعض صحابہ جن کو اللہ تعالیٰ

نے دولت وثروت سے نوازرکھا تھا، وہ تو بہت کچھ لیکرآئے۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بہت سارامال لیکر یہ کہتے ہوئے آئے کہ آج تو بڑی تجارت لیکرآیا ہوں اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بہت کچھ پیش کردیا۔

﴿منافقین کی شرارت﴾

منافقین بھی موجود تھے،جن کا دھندھااورکام ہی یہ تھا کہ اہلِ ایمان کے کاموں پر تنقید کریں،ان کی ہمتوں کوکسی نہ کسی طریقہ سےتوڑیں اوران کے حوصلوں کو پست کریں، یہ صحابی اتنی بڑی رقم لاکرپیش کررہے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ خوش ہونے کی چیزتھی اوراس پران کی تعریف کرنی چاہیےتھی،اس کے بجائے یہ منافقین یوں کہتے ہیں:﴿مُـرَآءٌ﴾ یہ تو دکھلانے کے واسطے ہے۔اتنی بڑی رقم اس لئے پیش کی ہے کہ لوگ تعریف کریں۔یہ توریا کاری کے لئے ایسا کرتے ہیں۔بڑی مقدار لانے والے کو یوں ٹوکااورتنقید کی اوراس کے حوصلے یوں پست کئے۔

ایک اورصحابی نے جوغریب تھے،انہوں نے محنت مزدوری کرکے کچھ کھجوریں حاصل کیں اوروہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں صدقہ کےطورپرپیش کردیں؛تواس پرمنافقین کہنے لگے: کیااللہ تعالیٰ کواس کےایک صاع (تقریباً ساڑھے تین کیلو) کھجور کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ توان کےاس ایک صاع کھجور سے بے نیاز ہیں۔گویاجوزیادہ دے رہے تھے ان پربھی تنقید کی اورجنہوں نے کم دیاان پربھی تنقید کی۔مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کوکسی کل چین لینےنہیں دیتے تھے: ؎

ناوک نے تیرے کوئی صیدنہ چھوڑازمانہ میں ❁ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

ان کوتو حوصلے ہی پست کرنے تھے؛اس لئے زیادہ دینے والے کایوں کہہ کردل توڑا کہ ریا کاری کررہا ہے۔اورجس نے محنت مزدوری کرکے اپنے مقدور بھردیا؛اس کویوں کہا کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔منافقین کی اس تنقیداورحرکت پراللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ براءت کے اندر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿اللہ تعالیٰ نے منافقین کامذاق اڑایا﴾

سورۂ براءت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی بہت ساری ایسی حرکتوں کوواضح کیا ہے؛ جس کے ذریعہ سے وہ مسلمانوں کوتکلیفیں پہنچاتے تھے۔اسی لئے اس سورۃ کا ایک نام ''فَاضِحَة'' ہے۔''فَاضِحَة'' کا معنٰی ہے''رُسوا کرنے والی''۔گویااس سورۃ نے آکر منافقین کی ساری حرکتیں کھول دیں اوران کوسب کے سامنے کھلا اوررسوا کردیا۔یہ آیت اسی سلسلہ میں نازل ہوئی﴿اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقَاتِ﴾ جولوگ تنقید کرتے ہیں اورعیب لگاتے ہیں﴿لَمَزَ،یَلْمِزُ﴾کا معنٰی ہے''عیب لگانا،خوردہ گیری کرنا'' جوعیب لگاتے ہیں ان لوگوں پر﴿الْمُطَّوِّعِیْنَ﴾جو برضا ورغبت اللہ کے راستہ میں بہت کچھ دیتے ہیں۔﴿وَالَّذِیْنَ لاَیَجِدُوْنَ اِلَّاجُھْدَھُمْ﴾ اوران لوگوں پربھی عیب لگاتے ہیں جواپنی مزدوری کی کمائی پاتے ہیں،یہ منافقین ان کامذاق اڑاتے ہیں،اللہ تعالیٰ نے ایسے منافقین کا مذاق اڑایااوران کے لئے دردناک عذاب ہے۔

﴿ایک اہم مشورہ﴾

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ ایسے لوگ جودین سے کوئی واسطہ نہ رکھتے ہوں،ان کی تنقیدوں کی وجہ سے آدمی کواپنے عمل کے اندرکوئی کمی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ اخلاص کا معاملہ کرتے ہوئے، جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوجائے، بڑا کام ہوجائے، چھوٹا کام ہوجائے؛اس کی انجام دہی میں کوئی کمی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، بولنے والے بولتے رہیں۔ کتے بھونکتے رہتے ہیں اور مسافر اپنا سفر کرتے رہتے ہیں۔

یہاں تو اس روایت کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا، اس کو پورا کرنے کے واسطے انہوں نے محنت اور مزدوری کی اور اس کے نتیجہ میں جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے دیا؛ وہ اللہ کے راستہ میں لاکر پیش کردیا۔ کیسی مشقت اٹھائی۔ حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں تھا، ان کے پاس نہیں تھا اور محنت نہ بھی کرتے؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پکڑ نہ ہوتی کہ کیوں محنت مزدوری کرکے نہیں لائے۔ لیکن ان کو تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے لئے تکلیفیں اٹھانا تھیں، کوشش ومجاہدہ کرنا تھا؛ اس لئے انھوں ایسا کیا۔

﴿ قابلِ غور وفکر حدیث ﴾

عن سعیدبن عبدالعزیزعن ربیعة بن یزیدعن أبی أدریس الخولانی عن أبی ذر جندب بن جنادة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیمایروی عن اللہ تبارک وتعالیٰ انہٗ قَالَ: یَاعِبَادِیْ! اِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلیٰ نَفْسِیْ وَجَعَلْتُہٗ بَیْنَکُمْ مُحَرَّماً، فَلَا تَظَالَمُوْا. یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ ھَدَیْتُہٗ، فَاسْتَھْدُوْنِیْ أَھْدِکُمْ. یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ جَائِعٌ اِلَّامَنْ أَطْعَمْتُہٗ، فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ أُطْعِمْکُمْ. یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ عَارٍ اِلَّامَنْ کَسَوْتُہٗ، فَاسْتَکْسُوْنِیْ أَکْسُکُمْ. یَاعِبَادِیْ! اِنَّکُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّھَارِ، وَأَنَاأَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعاً، فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ أَغْفِرْلَکُمْ. یَاعِبَادِیْ! اِنَّکُمْ لَنْ تَبْلُغُوْاضُرِّیْ فَتَضُرُّوْنِیْ، وَلَنْ تَبْلُغُوْانَفْعِیْ فَتَنْفَعُوْنِیْ. یَاعِبَادِیْ! لَوْأَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَ

اِنۡسَکُمۡ وَجِنَّکُمۡ کَانُوۡاعَلیٰ اَتۡقیٰ قَلۡبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنۡکُمۡ،مَازَادَذٰلِکَ فِیۡ مُلۡکِیۡ شَیۡئًا. یَاعِبَادِیۡ!لَوۡأَنَّ أَوَّلَکُمۡ وَآخِرَکُمۡ وَاِنۡسَکُمۡ وَجِنَّکُمۡ قَامُوۡافِیۡ صَعِیۡدٍ وَاحِدٍ،فَسَأَلُوۡنِیۡ، فَأَعۡطَیۡتُ کُلَّ اِنۡسَانٍ مَسۡأَلَتَهٗ،مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِمَّاعِنۡدِیۡ اِلَّاکَمَایَنۡقُصُ الۡمِخۡیَطُ اِذَاأُدۡخِلَ الۡبَحۡرَ. یَاعِبَادِیۡ!اِنَّمَاهِیَ أَعۡمَالُکُمۡ أُحۡصِیۡهَالَکُمۡ،ثُمَّ أُوَفِّیۡکُمۡ اِیَّاهَا،فَمَنۡ وَجَدَخَیۡرًا، فَلۡیَحۡمَدِاللّٰهَ. وَمَنۡ وَجَدَ غَیۡرَ ذٰلِکَ،فَلَایَلُوۡمَنَّ اِلَّانَفۡسَهٗ .

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیثِ قدسی نقل کرتے ہیں۔ مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ حدیثِ قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل فرمائیں۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد جو قرآن میں ہے، وہ تو قرآن ہی کہلاتا ہے۔ لیکن حدیث میں جہاں یہ آئے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں؛ اسکو حدیثِ قدسی کہتے ہیں۔ یہ بھی حدیثِ قدسی ہے۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے میرے بندو! مَیں نے ظلم کو اپنے آپ پر ممنوع کر دیا اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام ٹھہرایا؛ لہٰذا تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم مت کرو۔ یعنی ایک دوسرے کے حقوق مت مارو، کسی کی حق تلفی نہ کرو، کسی پر زیادتی مت کرو۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتے اور بندوں کو بھی حکم دیا کہ آپس میں کسی پر ظلم مت کرو؛ یہ حرام ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے: ﴿الظُّلۡمُ ظُلُمَاتٌ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ﴾ (مشکوۃ ۲/۴۳۴ متفق علیہ) قیامت کے روز ظلم اندھیریوں کی شکل اختیار کرے گا، گویا ظلم کرنے والا اس روز اندھیریوں میں بھٹکتا پھرتا رہے گا، اس کو راہ نہیں ملے گی اور اس کے لئے روشنی نہیں ہوگی۔

﴿سب لوگ گمراہ ہیں سوائے ......﴾

﴿یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ ضَالٌّ اِلَّامَنْ ھَدَیْتُہٗ،فَاسْتَھْدُوْنِیْ أَھْدِکُمْ﴾ اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہومگروہ جس کومَیں راہِ راست بتلاؤں۔جس کو اللہ تعالیٰ راستہ بتلائیں؛وہی راہ یاب ہے۔اگراللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو راستہ نہ بتلایا جائے؛تووہ گمراہ ہوگا۔اسی کو فرماتے ہیں کہ تم سب گمراہ ہومگروہ جس کومَیں راستہ بتلاؤں،اس لئےتم لوگ مجھ سے ہدایت طلب کرتے رہو،سیدھاراستہ چلنے کی دعا کرتے رہو﴿اِھْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ پڑھتے رہو؛مَیں تم کوسیدھا راستہ بتلاؤں گا۔ویسے راستہ اللہ تعالیٰ ہی بتلاتے ہیں،لیکن بندے کی سعادت مندی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نےحکم دیاہے کہ مجھ سے راہِ راست پانے کی دعا بھی کرتے رہو،تووہ دعا کرتا رہے۔اور یہ بات بھی طے ہے کہ جومقدر میں ہے وہ توہوکررہے گا اگرمقدر میں راہِ راست پر چلناہے توویسے بھی چلائیں گے۔لیکن یہاں ہمیں اپنے فرائضِ منصبی اداکرنے کی تلقین کی جارہی ہے۔ایک بندے کی شانِ عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے وہ اپنی بندگی کااظہارکرے،اوراس کاطریقہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلاکرہدایت کی دعامانگے۔گویاوہ یوں ظاہرکرے کہ مَیں تیری رحمت اور ہدایت سے مستغنی اور بے پرواہ نہیں ہوں؛ بلکہ مَیں ہر وقت تیری ہدایت کامحتاج ہوں۔یہ مانگتارہے اور ہاتھ پھیلاتارہے؛وہاں سےنوازاجاتارہےگا۔

﴿دربندِآں مباش......﴾

اوراگردعا کااثرمحسوس نہ ہو،تب بھی دعا کرنانہ چھوڑے۔یوں نہ سوچے کہ دعا تو قبول نہیں ہوتی۔حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ؎

حافظ! وظیفۂ تو دعا کردن است و بس ❁ در بندِ آں مباش کہ شنید یا نہ شنید

اے حافظ! تمہارا کام تو دعا کرنا ہے، اس فکر میں نہ رہو کہ سنی یا نہ سنی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مانگو؛ تو ہم نے مانگ لیا۔ اب ملا یا نہ ملا؛ اس کی طرف دھیان دینے کی ضرورت نہیں ہے، ہم نے اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کردیا۔

﴿سب لوگ بھوکے ہیں سوائے......﴾

﴿یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ جَائِعٌ اِلَّامَنْ أَطْعَمْتُہٗ،فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ أُطْعِمْکُمْ﴾ اے میرے بندو! تم سب کے سب بھوکے ہو مگر وہی جس کو مَیں کھلاؤں۔ اللہ تعالیٰ جس کو کھانا دیں؛ اس کو ملتا ہے۔ اس لئے تم مجھ سے کھانا مانگو؛ مَیں تم کو کھلاؤں گا۔ جس کے مقدر میں جو روزی ہے؛ اللہ تعالیٰ وہ اس کو دے کر رہیں گے، لیکن جیسا کہ مَیں نے ابھی عرض کیا کہ ہم سے فرائضِ منصبی ادا کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اپنی شانِ ربوبیت سے ہمیں دے ہی رہے ہیں، چاہے بندہ مانگے، یا نہ مانگے؛ لیکن ہماری سعادت مندی اسی میں ہے کہ مل رہا ہو تب بھی ہم ہاتھ پھیلا کر مانگتے ہی رہیں؛ اور اس کے سامنے اپنی بندگی کا اور عجز و نیازی کا اظہار کرتے ہی رہیں۔

﴿اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہی رہنا چاہیے﴾

﴿یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ عَارٍ اِلَّامَنْ کَسَوْتُہٗ،فَاسْتَکْسُوْنِیْ أَکْسُکُمْ﴾ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو مگر وہ جس کو مَیں کپڑا پہناؤں، اس لئے تم مجھ سے کپڑے مانگو؛ مَیں تم کو کپڑے پہناؤں گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندے کو اپنی تمام حاجتیں- چاہے وہ چھوٹی ہوں یا بڑی ہوں، یا بظاہر پوری ہوتی نظر آتی ہوں تب بھی- اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہی رہنا چاہئیں۔ ایسا نہیں! آج کھانا مل رہا ہے اس لئے نہیں مانگا، کسی روز نہیں ملا؛ تو مانگا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے

چاہے ملے یا نہ ملے؛ آدمی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہی رہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی اپنی راحت اور نعمت کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ سے جب دعا کرتا رہتا ہے، پھر جب مصیبت کے موقعہ پر دعا کرتا ہے تو فرشتے اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں: اے اللہ! یہ جانی پہچانی آواز ہے (درمنثور،۱/ ۲۸۷، البقرۃ آیت فاذکرونی أذکرکم۔ فضائل دعا مولانا عاشق الٰہی ص۸۴، حضرت سلمان کا ارشاد بہ حوالہ صفۃ الصفوۃ) یعنی یہ پہلے سے مانگتا تھا، ہم اس کو پہچانتے ہیں۔ بھائی! جو روزانہ ملتا ہو؛ اس سے جان پہچان ہو ہی جاتی ہے۔ یہ جب روزانہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور فرشتے اس کی آواز سنتے رہتے ہیں تو فرشتے باری تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ جانی پہچانی آواز ہے، اس کی مصیبت کو دور کر دیجیے۔

اور اگر راحت و نعمت کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا اور پھر جب مصیبت آتی ہے اس وقت دعا کرتا ہے؛ تو فرشتے کہتے ہیں: باری تعالیٰ! یہ تو کوئی اجنبی آواز ہے۔

اس حدیث کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہماری یہ تمام ضرورتیں- جس کو ہم ضرورتیں سمجھ رہے ہیں، کھانا، پینا، کپڑا وغیرہ- چاہے پوری ہو رہی ہیں، تب بھی ہم ان کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے دستِ سوال پھیلاتے رہیں، دعا کرتے رہیں اور مانگتے رہیں، اسی میں ہماری بندگی و عبدیت کا اظہار ہے، اور اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہیں۔

﴿گناہ ہو جائے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں﴾

﴿یَاعِبَادِیْ!اِنَّکُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِوَأَنَاأَغْفِرُالذُّنُوْبَ جَمِیْعاً فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ أَغْفِرْلَکُمْ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے میرے بندو! تم رات اور دن گناہ کرتے ہو اور مَیں تمام گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو؛ مَیں تمہارے گناہ

معاف کروں گا۔ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلی چھوٹ دی جارہی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ گناہ کرو بلکہ تم سے گناہ ہوتے ہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی سرشت اس قسم کی بنا رکھی ہے اور اس کا مزاج ہی ایسا ہے کہ بہت سی مرتبہ آدمی بچنا چاہتا ہے؛ تب بھی گناہ ہوجاتا ہے۔ لیکن اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بتلایا جارہا ہے کہ گناہ ہوجاوے، تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلا اعلان ہے کہ تم سے رات دن گناہ ہوتے ہی رہتے ہیں، اور مَیں تمہارے گناہ معاف کرتا ہی رہتا ہوں، اس لئے تم مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہی رہو؛ مَیں معاف کردوں گا۔ لیکن جب آدمی معافی مانگے ہی نہیں؛ تو معاف کیسے ہوں گے؟ بغیر معافی مانگے معاف نہیں ہوں گے۔ ویسے اللہ تعالیٰ بغیر معافی مانگے بھی معاف کرسکتے ہیں، اسے اختیار ہے۔ لیکن معافی مانگنے پر تو اللہ تعالیٰ معاف کرہی دیتے ہیں، اگر معافی نہیں مانگیں گے، تو اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے، چاہے تو معاف کریں، چاہے تو نہ کریں۔

﴿يَاعِبَادِيْ! اِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضُرِّيْ فَتَضُرُّوْنِيْ، وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِيْ فَتَنْفَعُوْنِيْ﴾ اے میرے بندو! تم اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے نقصان پہنچاؤ اور تم اس حیثیت تک نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے نفع پہنچاؤ۔ یعنی بندہ نہ تو اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے، نہ تو کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔ بندے میں وہ طاقت ہی نہیں ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ کو نفع پہنچانے کی طاقت ہے، نہ نقصان پہنچانے کی طاقت ہے۔

﴿میری شان میں اضافہ نہ ہوگا﴾

﴿يَاعِبَادِيْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى اَتْقٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْكُمْ، مَازَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا﴾ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے،

جنات اورانسان، سب؛ تم میں کے سب سے بڑے متقی اور پرہیز گار آدمی جیسے بن جائیں۔ یعنی ساری دنیا کے سب لوگ؛ اس وقت دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ متقی اور ڈرنے والے شخص جیسے بن جائیں؛ تو اس کی وجہ سے میرے ملک میں اور میری شانِ عظمت میں ذرّہ برابر بھی زیادتی اور اضافہ ہونے والا نہیں ہے۔ ساری دنیا نیک بن جائے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی شان بڑھنے والی نہیں ہے، اس کی شان میں کوئی زیادتی ہونے والی نہیں ہے، اس کی عظمت اور اس کی بڑائی اور اس کی شانِ کبریائی ابھی جس حال میں ہے؛ اُسی حال میں رہنے والی ہے۔

﴿میری شان میں کمی آنے والی نہیں﴾

﴿یَاعِبَادِیْ!لَوْأَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْاعَلیٰ أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ،مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِن مُّلْکِیْ شَیْئًا﴾ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جنات اور انسان، سب کے سب؛ دنیا کے سب سے بڑے بدکار اور گنہگار آدمی جیسے دل والے ہو جائیں۔ یعنی دنیا میں جو سب سے بڑا اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے، ساری دنیا کے سب لوگ ایسے بن جائیں، تو اس کی وجہ سے میرے ملک میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی میں، اس کی شانِ کبریائی میں کوئی کمی آنے والی نہیں۔

سب اچھے ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی شان میں نہ کوئی اضافہ ہونے والا ہے۔ اور سب برے بن جائیں تو اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان میں نہ کوئی کمی آنے والی ہے یہ تو ہماری سعادت کی بات ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کریں۔

﴿تسبیح پڑھنے کی برکت﴾

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

من نہ گردم پاک از تسبیح شاں پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

لوگ جس وقت میری تسبیح پڑھتے ہیں اور ﴿سبحان اللہ، سبحان اللہ﴾ کرتے ہیں، تو ان کے سبحان اللہ بولنے کی وجہ سے مَیں پاک نہیں ہوتا۔ ''سبحان اللہ'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تیری ذات پاک ہے۔ تو ہمارے یہ کہنے سے (اللہ تیری ذات پاک ہے) اللہ تعالیٰ کی پاکی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ تو پاک ہی ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں:-

پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

سبحان اللہ پڑھنے سے یہ خود پاک بنتے ہیں، ان کے کمال میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہماری یہ گندی زبان اگر اللہ کا ذکر کرلے، تو ہمارے ذکر کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی شان بڑھنے والی نہیں ہے۔ بلکہ ہماری پاکی میں اضافہ ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمیں کچھ مرتبہ حاصل ہوجائے گا۔ تو گویا سبحان اللہ کہنے کی وجہ سے بھی جو کچھ ملا؛ ہمیں ہی ملا۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی ہے۔

دیکھو! اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا کیسا ظہور ہورہا ہے۔

﴿میرے خزانے میں اتنی بھی کمی آنے والی نہیں﴾

﴿یَاعِبَادِیْ! لَوْأَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ قَامُوْافِیْ صَعِیْدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلُوْنِیْ، فَأَعْطَیْتُ کُلَّ اِنْسَانٍ مَسْأَلَتَہٗ، مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِمَّاعِنْدِیْ اِلَّا کَمَایَنْقُصُ الْمِخْیَطُ اِذَاأُدْخِلَ الْبَحْرَ﴾ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جنات اور انسان، یعنی حضرت آدم سے لے کر قیامت تک جتنے انسان پیدا ہونے والے ہیں، سب اور تمام جنات؛ ایک کھلے میدان میں آجائیں اور جتنے ہیں وہ سب مجھ سے مانگیں اور اپنی حاجتیں پیش کریں اور جس کو جو مانگنا ہو؛ وہ مانگیں۔ جتنا مانگ سکتے ہوں؛ اتنا مانگیں، اپنے سب سوال اللہ تعالیٰ

کے سامنے پیش کریں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس نے جو مانگا، مَیں ان کو اتنا دے دوں، تو اس دینے کے بعد بھی میرے پاس نعمتوں کے جو خزانے ہیں ان میں اتنی بھی کمی آنے والی نہیں ہے جتنی سمندر میں سوئی کو داخل کریں اور نکالیں تو اس سمندر میں کمی آئے؟

علماء لکھتے ہیں کہ سمندر چاہے کتنا ہی بڑا سہی، لیکن ہے تو فانی اور ختم ہونے والی چیز۔ اور سوئی جتنی بھی چھوٹی سہی لیکن اس کے اوپر ایک چھوٹا سا قطرہ جو آیا ہے، اس کو سمندر کے پانی سے کروڑویں، اَرَبویں یا اس سے زیادہ ہی سہی؛ کچھ نہ کچھ تو نسبت ہے؟ مطلب یہ ہے کہ سوئی کے اوپر جو قطرہ آیا اتنی تو سمندر میں کمی آئی۔ لیکن ان سب کو سب دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کے خزانے میں اتنی بھی کمی آنے والی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ جو کچھ دیا گیا ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کے خزانے میں جو ہے وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ متناہی اور غیر متناہی میں کوئی نسبت ہو ہی نہیں ہوسکتی۔ دونوں میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔

﴿جو کچھ ہیں؛ تمہارے ہی اعمال ہیں﴾

﴿يَاعِبَادِى اِنَّمَاهِىَ أَعْمَالُكُمْ، أُحْصِيْهَالَكُمْ ثُمَّ أُوَفِّيْكُمْ اِيَّاهَا﴾ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں، مَیں تمہارے واسطے ان کو ریکارڈ کرتا ہوں، کل کو میرے سامنے آ کر ان کا جواب دینا پڑے گا اور سارے اعمال کا پورا بدلہ تم کو ملنے والا ہے۔ اچھے اعمال ہیں تو اچھا بدلہ ملنے والا ہے، اور برے اعمال ہیں تو برا ملنے والا ہے ﴿فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللهَ﴾ اس لئے اگر کسی بندے سے کوئی نیکی کا کام ہو جاوے تو اللہ کی تعریف کرے کہ: اے اللہ! تیرا شکر واحسان ہے کہ تو نے مجھے توفیق عطا فرمائی اور مجھ گنہگار سے نیکی کا کام ہو گیا۔ ورنہ جیسے ہم ناقص ہیں؛ ہم سے افعال بھی ناقص ہی وجود میں آئیں گے۔ بھائی! جو اَدُھورا ہے، اس سے

اچھا کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ہوسکتا ہے۔ اس لئے اگر کسی سے کوئی نیک کام ہوجائے تو اس کو چاہیے کہ اللہ کی تعریف کرے کہ یہ اللہ کے توفیق دینے سے ہوا۔ اللہ کا شکر ادا کرے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ اگر شکر ادا کروگے تو اللہ تعالیٰ نعمت میں اضافہ کریں گے، نیکی کا کام کرنے کی اور زیادہ توفیق ہوگی۔

﴿وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ﴾ اور اگر کسی سے کچھ اور ہوجاوے یعنی گناہ کا کام ہوجاوے؛ تو پھر اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔ اس لئے کہ کوتاہی والی جو بات ہوئی ہے، وہ ہم سے ہی ہوئی ہے۔

بہر حال! اس حدیث کے متعلق اس حدیث کے راوی حضرت سعید بن عبدالعزیز ؒ فرماتے ہیں: حضرت ابوادریس خولانی رحمۃ اللہ علیہ جو اکابر تابعین میں سے ہیں وہ جب یہ حدیث بیان کرتے تھے، تو بڑے اہتمام سے دوزانو بیٹھ جاتے تھے۔

اس حدیث میں جو مضامین ہیں، وہ واقعتاً اللہ تعالیٰ کی عظمت، کبریائی، بڑائی اور جلالتِ شان میں بہت انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر آدمی ان چیزوں کو غور سے سنے اور اپنے دل میں اتار لے، تو ان شاء اللہ زندگی کے بہت سارے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنی رضا کی اور نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے

﴿دعا﴾

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ
لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِىْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدًا
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ
كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى بِعَدَدِ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اے اللہ! تیری شان بے نیاز ہے، اے اللہ! ہم ہر لمحہ تیرے محتاج ہیں، ہمیں زیادہ سے زیادہ تیری اطاعت و فرمانبرداری کی توفیق عطا فرما۔ نبی کریم ﷺ کی سنتوں اور طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ نفس وشیطان کی شرارتوں سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! تو ہم سے راضی ہو جا، اپنی مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلا کر نامرضیات سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! اس مجلس میں جتنے بھی بیمار ہیں اور جن کے متعلقین بیمار ہیں ان کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جو حاجت مند ہیں ان کی حاجتوں کو پوری فرما۔ اے اللہ! جنہوں نے اپنے جن جن مقاصد کے لئے اور جن مصیبتوں کے دور ہونے کے لئے اور جن بیماریوں سے شفا کے لئے ہم سے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں یا جو ہم سے دعاؤں کی توقع اور امید رکھتے ہیں یا جن کے ہم پر حقوق ہیں؛ اے اللہ! ان تمام کی جائز مرادوں کو پورا فرما، پریشانیوں کو دور فرما، حاجتوں کو پورا فرما۔ اے اللہ! ان کی بیماریوں کو صحت وشفا سے بدل دے۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور حضور اکرم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی، ان سے ہماری حفاظت فرما۔

رَبَّنَاتَقَبَّلْ مِنَّااِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَااِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَاوَمَوْلٰنَامُحَمَّدٍوَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

بِرَحْمَتِکَ یَااَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ